ہر خاص و عام بالخصوص سکول و کالج،
دینی مدارس کے طلبہ و طالبات کو قرآن کریم کے
معانی و مطالب سے واقفیت حاصل کرانے اور سیکھنے کیلئے، لفظ بہ لفظ،
اردو ترجمہ، ہر سبق 15 تا 20 منٹ کے دورانیہ پر مشتمل، آسان عام فہم اور دلنشین تعلیمی تفسیر

ذخیرۃ البرہان فی فہم القرآن

جلد 1

الٓمّٓ ۱

سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: اے ابوذر! (رضی اللہ عنہ) اگر تو صبح کو ایک آیت
کلام پاک کی سیکھ لے تو نوافل کی سو رکعت سے افضل ہے اور اگر عمل کا ایک باب سیکھ لے
تو ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

ترتیب و تألیف: قاری محمد اکرام غفرلہٗ
مدرس: مدرسۃ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

ہر خاص وعام بالخصوص سکول وکالج،
دینی مدارس کے طلبہ وطالبات کو قرآن کریم کے
معانی ومطالب سے واقفیت حاصل کرانے اور سیکھنے کیلئے، بامحاورہ، لفظ بہ لفظ،
اُردو ترجمہ، ہر سبق 15 تا 20 منٹ کے دورانیہ پر مشتمل، آسان عام فہم اور دلنشین تعلیمی تفسیر

ذخیرۃُ البُرھَان
فِی
فَھمِ القُرآن

الٓمّٓ ①

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابوذر! (رضی اللہ عنہ) اگر تو صبح کو ایک آیت کلام پاک کی سیکھ لے تو نوافل کی سو رکعت سے افضل ہے اور اگر عمل کا ایک باب سیکھ لے تو ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

مرتب ومؤلف: قاری محمد اکرام غفرلہٗ
مدرس! مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

تمام حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: ذخِیرَۃُ البُرْھَان فِی فَھمِ القُرْآن

الٓمّٓ ① (جلد اوّل)

صفحات: 354

ترتیب وتالیف: قاری محمد اکرام غفرلہٗ

مدرس! مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

0300-5902896

ٹائٹل وکمپوزنگ: ظفر محمود ملک

النور مینجمنٹ چکوال 0334-8706701

ناشر: مدرسہ فیض القرآن اوڈھروال (ضلع چکوال)

تاریخ اشاعت: 11 ذوالحجہ 1447ھ بمطابق 28 مئی 2026

ویب سائیٹ: www.umarlibrary.org

فہرست مضامین

عرضِ مرتب 11

قرآن مجید سے غفلت اور بے اعتنائی باعث تباہی ہے . 14

تلاوت سے پہلے تعوذ کا حکم/حمد اور شکر میں لغوی فرق .. 17

مکی اور مدنی سورتوں میں فرق 18

قرآن کریم حق تعالیٰ کی طرف زندگی گزارنے کا بہترین دستور ہے 18

تعوذ کا حکم 19

اللہ تعالیٰ کے تین عظیم صفاتی نام 20

سورہ فاتحہ تورات، انجیل اور قرآن کی ہر سورت سے بڑی سورت ہے 21

اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق ایک الگ جہان ہے 22

"الرحمن" میں عام رحمت اور "الرحیم" میں خاص رحمت 23

عبادت اور استعانت کا مفہوم/ جبریہ اور قدریہ 25

دونوں فرقوں کا رد 25

مٰلِكِ اور "مَلِكِ دونوں قراءتیں متواتر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں 25

يَوۡمِ الدِّيۡنِ" کے معنی 26

شرک کی جملہ اقسام کے استیصال کے لیے یہ اکیلی آیت ہی کافی ہے 27

اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ فاتحہ کا خلاصہ 28

ایک سوال اور اس کا جواب 29

جبریہ اور قدریہ دونوں فرقوں کا رد 30

صراطِ مستقیم/ انعام والے اور گمراہ لوگ کون ہیں؟/سورت فاتحہ سے آغاز قرآن کی وجہ؟ 32

ہدایت کے کئی مفہوم 32

قَصۡدُ السَّبِيۡلِ سے مراد 34

اللہ عَزَّ وَجَلّ کے نزدیک پسندیدہ دین 34

انعام یافتہ گروہ/گمراہ لوگ کون ہیں؟ 35

مَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ کا مصداق، اور "الضَّآلِّيۡنَ سے مراد 36

سورۃ فاتحہ کا خلاصہ 37

سورۃ الفاتحہ سے قرآن اور نماز کا آغاز 38

سورۃ اور آیت کا مفہوم ومطلب/ ریب کا لغوی مفہوم/ متقین کے لیے ہدایت 41

تعارف سُورَۃ البَقَرَہ 41

ترتیب نزولی 41

ترتیب توقیفی یا ترتیب مصحفی 42

قرآن مجید کی سب سے طویل آیت 42

لفظ سورہ اور آیت کا تعارف وتشریح 43

فضائل سورہ البقرۃ 44

حُروفِ مُقَطَّعات اور اس کی اقسام 44

کفار مکہ کے قرآن کے نزول پر دو طرح کے اعتراض 45

انسانی اضطراب اور خلجان کا علاج 46

تمام لوگوں کی ہدایت سے مُراد 47

شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کا معنی 47

متقین کے اوصاف/ آخرت کا مفہوم 50

اور عقیدہ آخرت کی اہمیت 50
الغیب سے مراد 50
اقامت صلوٰۃ کا مطلب 51
خرچ کی مختلف مدات 52
تقویٰ والوں کی تین صفتیں 53
نازل شدہ وحی پر بالتفصیل ایمان لانا ضروری ہے 54
دنیا کی زندگی کے بعد والی زندگی 55
آخرت کا لفظ ایک جامع اصطلاح 55
آیت میں فلاح سے مراد 56
کفر کی تعریف اور ازلی کافروں کو تبلیغ کرنے کا حکم دینے
کی وجہ/مہر کیوں اور کب لگتی ہے؟ انسانوں کے تین گروہ 58
ہدایت اور گمراہی کے اعتبار سے تین گروہ 58
ہمزہ تسویہ کسے کہتے ہیں؟ 59
دو باتیں ذہن نشین رکھنے والی 60
دلوں پر مُہر کیسے لگتی ہے؟ 61
دل پر سیاہ نقطے 63
منافقین کا گروہ اور اس کی قسمیں/ نفاق دینی بیماری ہے 65
منافقوں کا حال اور منافقین کی قسمیں 65
ایمان میں منافقت اور عملی منافقت 67
جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی
.... 68
نفاق کی بیماری سے بیشمار مزید نفسیاتی بیماریاں 68
منافقین کے دو بڑے عیوب 70
عقیدہ و عمل کے تمام بگاڑ کی جڑ 71
اصل فسادی 71
صحابہ معیارِ حق/صحابہ کرام اور علماء دین کا مذاق اڑانے کا
حکم/ بے دینوں کی فریب کاریوں سے ہوشیار رہا جائے 73
النَّاسُ سے مراد 73
جدید، قدیم منافقین کی تردید 74
ایمان پر ثابت قدم رہو 75
امت کے لیے نمونہ 75
معیارِ حق سے مُراد 76
اسلام لانے کے ظاہری فوائد 76
شیاطین سے مراد 77
منافقانہ عمل کی سزا 78
جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا کی تشریح 79
ہدایت کے بدلے گمراہی/ اعتقادی اور عملی منافق 81
سراسر گھاٹے والی تجارت 81
ابدی خسارے میں مبتلا لوگ 82
تاریکی اور روشنی کی مثال 83
بہرے، گونگے اور اندھے 84
بارش سے مراد/ اندھیروں اور گرج سے مراد 85
عملی منافق کی نشانیاں 86
دوسری قسم کے منافقوں کی مثال 86
دلائل توحید و ربوبیت تین بڑی اقسام میں/ قرآن کا چیلنج
اور اس کی معجزانہ حیثیت 88
چار اہم اور عمدہ مضامین کا تذکرہ 88
توحید اور وجودِ الٰہی پر دلائل 90
زمین و آسمان کی تخلیق کے مقاصد 91
ربوبیت کے دلائل تین بڑی اقسام میں ظاہر ہوتے ہیں 92
قرآنِ کریم کا چیلنج اور اس کی معجزانہ حیثیت 92
جہنم کا ایندھن کون سی اشیاء ہوں گی؟ تقویٰ کا لغوی مفہوم
مثال کے درست ہونے کی شرط 95
جہنم کی آگ کی حرارت/ انسان اور پتھر اس کا ایندھن .95

تقویٰ کا معنی: ڈرنا، بچنا اور پرہیز کرنا 96
جہنم صرف کافروں کے لیے 97
ایمان اور عمل صالح/عمل صالح کے بغیر ایمان ثمر آور نہیں 97
دنیا کی نعمتیں دو میں سے ایک نقص سے خالی نہیں 99
کفار کا دوسرے طریقے سے معارضہ 99
فسق کے تین درجے 101
صلہ رحمی کی تاکید اور اقرباء سے حسن سلوک/زندگی اور موت کے چار مراحل 102
فاسقوں کی تین صفات کا تذکرہ 102
تعلقات کو جوڑنے، قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا 103
فساد فی الارض کیا ہے؟ 104
انسان پروارد ہونے والی چار کیفیات 104
زمین کی تمام چیزیں انسانیت کے فائدے کیلئے 106
زمین سے آسمان تک کی مسافت 107
تخلیق آدم پر فرشتوں کا اعتراض/تسبیح وتقدیس کا فرق .109
حضرت آدم (علیہ السلام) کی تخلیق اور خلافت ارضی 109
قرآن پاک میں خلیفہ کے دو معانی............110
خلیفہ اور اہل السنت والجماعت کا نظریہ 111
اطاعت شعار مخلوق کے ہوتے ہوئے انسانی تخلیق کیوں؟ 112
استخارہ واستشارہ کا حکم............113
تسبیح وتقدیس کے معانی 115
اے فرشتو! تم اس راز کو نہیں جانتے 116
خلافت کے لئے ضروری شرط/علم کے فضائل سجدہ تعظیمی 117
علم خلوتوں اور تنہائیوں کی عبادت سے افضل ہے......117
عبادت و بندگی مخلوق کی صفت ہے اور علم خود خالق تعالیٰ کی 119
حضرت آدم علیہ السلام کی برتری کا ایک نمایاں مظہر....120
سجدہ سے مراد اور اس کے احکام 121
حسد اولین گناہ 122
شجر ممنوعہ/حضرت آدم (علیہ السلام) کی توبہ/توبہ کا مفہوم اور اس کے ارکان 124
خطائے اجتہادی گناہ نہیں ہوتی 124
شریعت میں سدِ ذرائع کا بنیادی مفہوم............126
انبیاء معصوم ہوتے ہیں، یہی علماء اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے 127
میت کی تدفین کے بعد ایک مُستحب عمل 128
حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو توبہ کے کلمات بھی سکھا دیئے 129
خوف اور حزن سے مراد............129
اللہ کی نازل کردہ نشانیوں کو جھٹلانے کا انجام..........130
بنی اسرائیل پر انعامات/ بنی اسرائیل کا کتاب اللہ سے سلوک/تلبیس اور کتمان حق 131
بنی اسرائیل کو خصوصی خطاب 131
مسلمان مغلوبیت، ذلت اور پستی کا شکار کیوں ہیں؟ ...132
بنی اسرائیل کے اعمال بد 133
فَارْهَبُوْنِ کا معنی............134
قرآن پاک کو بحیثیت کلام الٰہی تسلیم کرلو 134
تھوڑی قیمت سے مراد دنیا کی حقیر مال ہے 135
حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو............136
آج کل دین کے ساتھ ہمارا سلوک کیا ہے؟.........137

باجماعت نماز ادا کرنے کی اہمیت اور فضائل/ پریشانیوں
اور مصائب کا علاج.................... 138
نماز اور زکوٰۃ، ہر زمانہ میں دین اسلام کے اہم ارکان .. 138
مال سے محبت کی چار صورتیں.................... 140
حبّ مال جملہ اَمراض کی جڑ اور بنیاد ہے 141
وعظ و نصیحت کرنے والوں کو تنبیہہ 142
'نماز' تعلق مع اللہ کا عنوان 143
آخرت میں مؤمنین کیلئے دیدار الٰہی کی نعمت 144
سفارش پر تکیہ کرنا نری بے وقوفی ہے/
فرعون کی بنی اسرائیل کو تعذیب کی وجہ 146
اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد کرنے کا حکم 146
اسلامی تاریخ کی حفاظت.................... 148
اُمت محمدیہ خیر اُمت 149
شفاعت کن لوگوں کے حق میں مقبول ہوگی 150
گئو سالہ پرستوں کا قتل عام/ مرتد کی سزا قتل کیوں ہے؟ 153
فرعونیوں کی غرقابی کا دن.................... 154
طورِ سینین اور وادیِ مقدس 155
شریعت موسوی میں شرک اور ارتداد کی سزا 158
منتخب ستر آدمیوں کی موت اور دوبارہ زندگی/
بنی اسرائیل کا جہاد سے انکار.................... 160
بقائمی ہوش وحواس کلام الٰہی سننے کی فرمائش 161
موت کی بعد کی زندگی اس پر اشکال 162
من وسلویٰ کی حقیقت.................... 163
تحریف کلام الٰہی کی سزا.................... 165
احکام الٰہی سے تمسخر اور مذاق.................... 166
بارہ چشموں کا پھوٹنا/ استسقاء کی حقیقت/
فساد فی الارض حقیقتاً ہے کیا چیز؟ 167
استسقا کی حقیقت 169
معجزہ اور کرامت 170
ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر.................... 171
فساد فی الارض کیا ہے؟ 173
طعام کی تبدیلی/ ذلت اور مسکنت کا مفہوم/ آیات الٰہی کا انکار
.... 174
غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر 175
بنی اسرائیل کی ناشکری.................... 175
اعلیٰ چیز کے بدلے ادنیٰ اور کمتر چیز لینا چاہتے ہو؟ 176
مسکنت و دناءت کا اصل معنی ومفہوم 177
ایک اعتراض اور اس کا جواب.................... 178
داعیان حق کا قتل اور ان کی تذلیل واہانت.......... 179
مَنۡہِیَّات سے باز رہا جائے اور مَاۡمُوۡرَات کو بجالایا
جائے 179
بنی اسرائیل کا عہد/ دین میں جبر نہیں کا مطلب 181
یہود، نصاریٰ اور صابئین 181
شریعت کے احکام میں اولین حکم 183
ایک ہیبت ناک منظر.................... 184
ایک شبہ اور اس کا ازالہ.................... 185
پختہ عہد و پیمان کے باوجود روگردانی.............. 186
اصحاب سبت کا انجام/ جمعہ کی فضیلت/ تبدیلی اشکال کی توجیہہ
.... 188
ہفتے کے دن تعدی اور زیادتی کرنے والے 188
ناجائز حیلہ سازی پر سخت سزا 189
یہود و نصاریٰ کے مقدس دن.................... 190
جمعہ اہلِ اسلام کیلئے سب سے عظیم دن 190
اہل علم کیلئے دعوت وتبلیغ ضروری ہے 191

نیچری حضرات کی توجیہہ 192
انسان اور جانور میں فرق 192
اخلاق اور قانون میں فرق 193
عذاب کے واقعات ہماری عبرت ونصیحت کیلئے 194
گائے کو ذبح کرنے کے حکم پر بنی اسرائیل کی کٹ
حجتیاں/ گائے کی نشانیاں 195
تَعَمُّق کا معنی ومفہوم 197
مسلمانوں کو ذبح گاؤ پر پابندی قبول نہیں کرنی چاہیئے . 198
اس واقعہ سے حاصل ہونے والا سبق 200
اس واقعہ سے ملنے والی معلومات 200
لاش کا زندہ ہو کر قاتل کا پتہ بتانا/
دل سخت ہوتا کیوں ہے اور اس کا علاج 202
اللہ کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے 202
قاتل کی تین جرائم 203
انسان کا دوبارہ زندہ قرآن کی مثالیں 204
قاتل وراثت سے محروم، اور اس پر اہل علم کا اجماع ... 205
وہ دل، جو پتھروں سے بھی زیادہ سخت 205
دلوں کی سختی افراد اور امتوں کے لئے سخت تباہ کن 206
قساوت قلبی کے اسباب، اور علاج نبوی ﷺ 207
نبی آخر الزمان ﷺ سے متعلقہ آیات کو چھپانا اور ان میں
تحریف/ حق کو چھپانا بہت بڑا جرم ہے 209
تورات وانجیل میں لفظی اور معنوی تحریف 209
باطل پرست علماء کی تحریف 210
یہودیوں کے دس بڑے عالم 211
منافق یہودی جب صحابہ کرام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم سے ملتے
.... 212
ضرورت کے وقت علم حق کو چھپانا 213
بے بنیاد اور غلط قسم کی آرزوئیں 214
غلط فتووں کی کمائی/ باطل عقائد کی بنیاد/
مسلمانوں کے باطل عقائد 216
تورات کے احکام ردوبدل کرنے والے 216
یہود کا من گھڑت عقیدہ اور اس کے تین جواب 218
شفاعت کا مسئلہ اور قرآن پاک کی وضاحت 220
گناہ کا احاطہ کا مفہوم ومطلب 220
مؤمنین کے ایمان اور عمل صالح پر بشارت 221
دین میں عبادات کا مقام/ عبادت کا ناقص تصور
خون ناحق اور جلاوطنی 223
اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ موڑنے والے 223
عبادت کی چار قسمیں 224
عبادت کا لفظ تین معانی پر مشتمل 225
عبادت ایک جامع لفظ 225
اسلام کی بنیادی پانچ چیزیں 226
چند اعمال اور مراسم عبودیت کا ہمارا تصور 227
خون ناحق اور جلاوطنی 227
ہر نبی کی بنیادی اور اولین دعوت 228
دور نبوی میں یہود کا انجام/ مسلمانوں کی حالت زار 230
مدینہ میں یہود کے مشہور قبائل اور ان کے مذموم افعال
.... 230
یہود سے چار عہد ان کا اس کے برعکس طرز عمل 232
دنیا میں ہی یہود کا عبرتناک انجام 233
یہودیوں کے جزوی ایمان کا نقشہ اور مسلمانوں کی موجودہ
حالت 234
بہتر انجام اور دنیا وآخرت کی رسوائی سے بچنے کی دعا 235

بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونے والے انبیاء/
یہود کا قول کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں.........237
انبیاورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ قرآن کریم میں ..237
حضرت مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام کی فضیلت 238
حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات 239
احکامِ الٰہی پر اپنی خواہشات کو ترجیح دینے والے.....240
انبیاورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کو شہید کرنے والا گروہ....241
دین سے دوری کا بہانہ، قرآنی جواب اور حقیقت 242
یہود اور نزول قرآن/ نظریہ توسل کی حقیقت 245
مصدق کتاب سے مراد قرآن پاک ہے 245
نظریہ توسل کی حقیقت 246
یہود کے پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہ لانے کی اصل وجہ
247..
حسد کی تعریف اور اس کی مذمت 248
ایمان لانے میں بڑی رُکاوٹ نسلی وخاندانی تعصب...249
گستاخوں کو اچھا سمجھنے والا خود بھی گستاخ ہی ہے 250
حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات 251
ایمانی قوت معلوم کرنے کا طریقہ/ موت کی آرزو/
یہود کی جینے کی ہوس 252
کفروانکار کی انتہا 252
گئوسالہ پرستی کے جراثیم 253
قرآن مجید پر ایمان لانے کا مطلب 254
برائی کی لذت وحلاوت/ ایمان اور نیک اعمال کی شیرینی
255..
موت کی محبت اور اللہ کی ملاقات کا شوق مقبول بندوں کا طریقہ
255..
دعوت مباہلہ/ اور اسلامی اصطلاح میں مباہلہ کا مطلب ..257
قرآنی پس منظر 258
یہود کو دنیا کی زندگی کی ہوس 258
زندگی کی اصل قدر 259
یہود کی جبریل دشمنی کی وجہ/ مقربین کا عنادی لعنتی ہے
کتاب اللہ سے روگردانی..........................260
نزول وحی کی مختلف صورتیں 260
ضد، حسد اور فرقہ سازی کا جنون 261
فرشتۂ رحمت اور فرشتۂ عذاب 262
فرشتوں سے دشمنی کفر اور غضب الٰہی کا سبب 263
محبت اور تعظیم کا صحیح مطلب 263
معجزات اور واضح نشانیاں 264
فسق کا اصلی مفہوم 264
یہودیوں کا تورات پر ایمان ہی نہیں 265
کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دینے والا گروہ 266
جادو کے ذریعہ میاں بیوی میں جدائی ڈالنا/ جادو کی حقیقت
قرآن وسنت کی روشنی میں اور اُس کا علاج 267
یہودیوں میں جادوٹونا کرنے کی بیماری 267
شہر بابل کا جغرافیائی محل وقوع 268
حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نبی برحق............269
میاں بیوی کے درمیان تفریق کرانا گناہِ کبیرہ ہے ...270
جادو ایک حقیقت ہے 270
سزائیں دینا صرف اِسلامی حکومت کا کام ہے 272
ازروئے شریعت جادو کرنا یا کرانا کفر ہے 274
دنیا کی عارضی زندگی اور متاعِ قلیل 275
مشتبہ الفاظ کے استعمال کی ممانعت/ تنسیخ آیات کی وجوہات
276..
رَاعِنَا کے بجائے "اُنْظُرْنَا" کہنے کا حکم..........276

یہودیوں کی ایک اور کمینگی 277
کلمہ کفر کہنے والوں کیلئے دردناک عذاب 278
رحمت سے مراد نبوت 278
نَسخ کا معنیٰ ومفہوم اور نَسخ کے منکرلوگ 279
نسخ کے چنداحکام 281
مختلف شرائع میں بعض اختلافات 282
کثرت سوالات کی ممانعت/حسد بدترین بیماری ہے .. 283
شرعی قانون میں بھی تبدیلی 283
یہود کا اسلام سے متنفر کرنے کا اور طریقہ 284
بے مقصد اور فضول سوالات سے بچو 285
کسی مسئلہ کی تحقیق کیلئے سوال کرنے کی ممانعت نہیں... 286
یہودیوں کا مسلمانوں کے کفروارتداد کی تمنا کرنا 287
کفار کے نزدیک انسان فُحاشی وبیحیائی کے بغیر مہذب نہیں کہلا سکتا 288
نماز ادا کرنے کے آداب واحکام/ نیکی کا بدلہ نیکی/ رجا اور اُمْنِیَّۃ کی تحقیق وتفسیر 290
نماز اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں شامل ہے 290
نماز کی لفظی ومعنوی حقیقت 291
زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن 292
جنت میں داخلے کے زبانی دعوے کرنا جہالت وحماقت ہے 293
آخرت کی کامیابی اور جنت میں جگہ پانے کا اُصول ... 295
یہود ونصاریٰ آمنے سامنے/ بڑا ظالم کون ہے؟/مسجد کے آداب 297
تین گمراہ کُن فرقے 297
اللہ کی مساجد کی رونق اور آبادی کے بجائے ان کو ویران کرنے والے 299
اللہ کی عبادت سے روکنا بہت بڑا گناہ ہے۔ 301
اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات سے لاپرواہی 301
سمت کا تعین، مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی 302
اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے/سُبۡحٰنَہٗ کی تحقیق وتفسیر 304
اہل کتاب کے غلط عقائد کی بحث 304
اللہ تعالیٰ ہرعیب اور نقص سے پاک ہے 305
زمین وآسمان کی ہر مخلوق خدا کی مملوک 306
تکوینی حکم کی خلاف ورزی کی کسی میں مجال نہیں 306
بے پناہ قدرت، لامحدود اختیار اور مطلق حاکمیت 307
جاہل لوگوں کے مطالبات 308
زمانہ قدیم کے گمراہ اور موجودہ دور کے گمراہوں میں فرق 309
حسی معجزات معنیٰ ومطلب 310
علمی دلائل معنیٰ ومطلب 310
ہدایت الٰہی ہی اصل ہدایت ہے/تلاوت قرآن کے ظاہری اور باطنی آداب 312
کفار کی ایذارسانیوں اور مشکلات کے موقعوں پر دلی تسلی 312
لفظ"ملت" کی وضاحت 313
اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے اور اسی کی پیروی کرنا ہے 314
اسلام کا تمام ادیان پر غلبہ 315
کتاب اللہ کے حقوق 317
تلاوت قرآن کے ظاہری آداب 318
تلاوت قرآن کے باطنی آداب 318
امتحان کی غرض وغایت/حضرت ابراہیم (علیہ السلام) امام الناس ہیں/مساجد کی ظاہری وباطنی صفائی 319

جوحضور اکرم ﷺ کا ہوگیا عزت پا گیا اور جو ان سے پھر گیا ذلیل ہوگیا 319
شفاعت کافر کے لیے نہیں ہے 320
ابتلاء آزمائش کا لغوی معنی اور قرآنی وشرعی مفہوم 321
حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی قربانی ہی قربانی تھی 322
اولاد کے لئے دعاء خیر کرنا سنت اِنبیاء ہے 323
شیشہ کی گنبد نما عمارت 324
ظاہری و باطنی صفائی سنت اِنبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام .. 324
تعمیر کعبہ کے مختلف ادوار/ پُر امن شہر مکہ مکرمہ کی فضیلت/ مناسک حج کی تعلیم 326
نیکی کر کے قبولیت کی دعا کرنا سنّتِ خلیل 326
مکہ مکرمہ روئے زمین پر سب سے مقدس اور پر امن شہر 327
مکہ مکرمہ کی فضیلت 328
خانہ کعبہ کی تعمیر مختلف ادوار میں دس (10) بار ہوئی ... 329
لفظ مناسک کا لغوی اور اصطلاحی معنی و مفہوم 330
کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد حدیث ہے 331
اسلام دین امن وسلامتی ہے/ اولاد کو صحیح عقائد اور نیک اعمال کی وصیت کرنی چاہیئے 333
یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب کی تردید 333
اسلام کے دین امن وسلامتی ہونے کی بڑی دلیل 334
اَلدِّیْنَ سے مراد یہاں اسلام ہے 335
وَثَنِیَّت کا معنی و مفہوم مختلف مذاہب میں اس کا تصور 337
اَمْ کُنْتُمْ شُهَدَآءَ آیت کا شانِ نزول اور تفسیر 338
لفظ حنیف کی تحقیق و تفسیر/ راہِ ہدایت/ صحابہ کرام معیارِ حق .340
آخرت میں کام آنے والے صرف اپنے ہی اعمال ہوں گے 340
یہودیوں، عیسائیوں اور تمام مذاہب کا رد 341
لفظ حنیف'' معنی و مفہوم اور مختصر تشریح 342
اَلْاَسْبَاطِ کا معنی مفہوم اور مختصر تشریح 343
انبیاء کرام علیھم الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے متعلق چند باتیں یاد رکھیں 345
صحابہ کا ایمان بارگاہِ الٰہی میں معتبر اور دوسروں کیلئے مثال 345
جھوٹی نسبت مفید نہیں/ کتمان شہادت ظلم ہے/ اہل اسلام کیلئے لمحہ فکریہ 347
توحید، عبادت، ریاضت، دیانت اور ایمان کا رنگ ... 347
عیسائیوں کی مذہبی رسم ''بپتسمہ'' 348
اللہ تعالیٰ کی رحمت لامحدود 349
آیت کا بنیادی مقصد بے لاگ توحید اور نظریاتی پختگی کا اظہار ہے 350
یہودیت و عیسائیت کا معرضِ وجود 351
توراۃ میں حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کے متعلق واضح پیشین گوئیاں 352
اپنے اپنے افعال کی خود جوابدہی کرنا ہوگی 352
اہل اسلام کو تنبیہ 353

عرضِ مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ!

کچھ عرصہ قبل حافظ محمد نعیم عارف کی طرف سے اصرار تھا کہ تم پانچ دس منٹ کی مجھے ویڈیو بنا کر دو تا کہ میں یوٹیوب پر اپ لوڈ کر دیا کروں، اور میں بار بار انکار کرتا رہا (اس کے لئے انہوں نے باقاعدہ موبائل سٹینڈ، مائیک اور گرین کپڑا دیا جس سے اب تک ویڈیو بن رہی ہیں اور اپ لوڈ ہو رہی ہیں) کیونکہ میں اپنی عدمِ علمیت سے خوب واقف ہوں، اور میں اپنی جہالتوں، غلاظتوں اور کمزوریوں سے بخوبی آگاہ ہوں دوسروں کے سامنے بیان کرنے سے کوسوں دور بھاگتا ہوں حالانکہ حافظ صاحب نے بڑا سمجھایا اور ان کا اصرار بڑھتا رہا اور فرمایا کہ جہاں آپ نے کچھ کہنا ہے وہاں بندہ ہوگا نہ بندے کی ذات صرف موبائل کا کیمرہ ہوگا اور تم ہوگے، پھر دل کو کچھ ڈھارس ہوئی اور ہمت ہوئی پھر میرے دل میں یہ داعیہ شدت سے پیدا ہوا پھر کچھ دوستوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اپنے اکابر کی تفاسیر سے استفادہ کرکے اللہ کا نام لے کر شروع کر دو، مگر جب اپنی علمی بساط پر نظر ڈالتا تو مجھے یہ خیال بھی مضحکہ خیر لگتا تھا کہاں تفسیر قرآن اور کہاں یہ سراپا جہل وعصیاں تھا، میں اس سچائی کا محض روایتی اور عاجزانہ نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ اعتراف کرتا ہوں کہ خدمتِ قرآن کی اب تک کی تاریخ میں مجھ سے کم علم آدمی کوئی نہیں گزرا ہوگا، بہر حال میں نے علمائے امت کی تفاسیر سے استفادے کے سوا کچھ نہیں کیا میرے اس جمع وترتیب میں کوئی حسن وخوبی کا پہلو دکھائی دے تو وہ اللہ کے فضل وکرم کا نتیجہ جس نے مجھے یہ توفیق عنایت فرمائی اور متقدمین کی پُرخلوص کوششوں کا

ثمرہ ہے، کوتاہی اور کمزوری کو میری کم علمی اور کوتاہ فہمی تصور کرتے ہوئے آگاہ کیا جائے تا کہ اس کی تصحیح کی جائے، چنانچہ کافی غور وخوض کے بعد بندہ نے حافظ صاحب اور دیگر دوست احباب کے کہنے پر یہ کام کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تا کہ قیامت کے دن میرے جیسا گناہوں میں ڈوبا ہوا شخص بھی اللہ کے حضور کوئی نیک عمل پیش کر سکے۔ اور میرا اصل مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم کے مضامین کو سادہ اور عام فہم انداز میں ناظرین، سامعین، قارئین تک پہنچا دیا جائے، میں نے کوشش کی کہ سادہ اور عام فہم لفظوں میں قرآن کریم کے مضمون کو اس طرح بیان کیا کہ لفظی ترجمہ اور عام فہم الفاظ میں اس کے مرکزی مفہوم کی مختصر تشریح بیان کی ہے۔ پھر قرآن کریم سے ملنے والی ہدایات اور عملی زندگی میں قرآن کریم کے پیغام کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، یہ سلسلہ ایک دو تین آیات روزانہ کی بنیاد پر بیان کرتے کرتے آج یہ تحریر کرتے وقت ہمارا سبق سورہ یوسف تک پہنچ گیا ہے۔

بہر حال اب تک یہی دھڑکا اور ڈر لگا ہوا ہے کہ کہیں یہ سلسلہ شروع کر کے غلطی تو نہیں کر دی اور وہ ثواب کے بجائے عذاب کا مستحق نہ بن جاؤں اس لیے بندہ کی کوشش ہے کہ کوئی بھی تحقیق طلب بات معتبر تفاسیر دیکھے بغیر نہ بیان کروں، دوسرے مرحلے پر تمام قارئین و ناظرین سے دست بستہ مؤدبانہ درخواست ہے کہ اگر کوئی بات اسلاف کے مسلک کے خلاف نظر آئے تو وہ اس کی نشاندہی کر کے ممنون فرمائیں۔ ''اے اللہ! مجھ پر حق کی حقانیت واضح کر اور مجھے اس کی اتباع عطا فرما''۔ ''اے اللہ! مجھ پر باطل کا بطلان واضح کر اور مجھے اس سے اجتناب عطا فرما۔ اے اللہ تو مجھے اس تفسیر قرآن کریم کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرما دے، اے اللہ! میں اپنی گندی زبان اور گم صم زبان اور قلم سے تیرا شکر کیسے ادا کروں کہ تو نے ایک جاہل اور گناہ گار کو اپنی کتاب مقدس کی خدمت کی توفیق دے دی جس کے پاس نہ علم ہے نہ عمل، نہ ظاہری اوصاف ہیں نہ باطنی کمالات! اے علیم وخبیر! میں اپنی جہالتوں، غلاظتوں اور کمزوریوں سے بخوبی آگاہ ہوں دوسری جانب تیری فیاضیوں، پردہ پوشیوں اور مادی اور معنوی نعمتوں سے بھی بے خبر نہیں۔ اے رؤف ورحیم! کوشش اور خواہش کے باوجود میں ان نزاکتوں، آداب، احتیاطوں اور تدبیروں کو ملحوظ نہیں رکھ سکا جن کا لحاظ رکھنا اس عظیم کتاب کی خدمت کے لیے ضروری تھا۔ میری اس کوتاہی کو معاف فرما دے۔ اے رحمن ورحیم!

تو سچے دل سے توبہ کرنے والوں کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے مگر یہ تو ایک نیکی ہے تیری کتاب کی خدمت سے بڑھ کر نیکی کیا ہو سکتی ہے تو اسے واقعی اور حقیقی نیکی بنادے۔ اے حلیم و کریم! تجھے تیری مبارک کتاب کا واسطہ! مجھے ظاہری اور باطنی غلاظتوں سے پاک فرمادے، میرے گناہوں کو معاف فرمادے، میرے عیوب پر پردہ ڈال دے، میری اس ناقص سی خدمت کو قبول فرمالے، اسے میرے لیے، میرے والدین اور اہل وعیال کے لیے اور میرے تمام اساتذہ کے لیے ذخیرہ آخرت بنادے۔ اور کتاب مقدس کی خدمت، میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنادے۔

اللہ تعالیٰ ہماری یعنی حافظ محمد نعیم عارف جنہوں نے ہمارے چینل عمر گیلری کے سب سلسلے ویڈیو ایڈٹ سے لیکر ویڈیو اپ لوڈنگ تک کا سب کام سنبھالا ہوا ہے اور پارہ 9 کے نصف سے بھائی ظفر محمود ملک تفسیر کی ویڈیو ایڈیٹنگ میں شامل ہوئے، اور لفظی ترجمہ کی کمپوزنگ، ٹائٹل وغیرہ ان کی محنت ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس محنت کو قبول فرمائیں، بعافیت اس کی تکمیل فرمائیں یہ ذخیرہ آخرت ثابت ہو، اور امت کو اس سے فائدہ پہنچے۔ آخر میں ایک دفعہ پھر انتہائی عجز و انکساری اور اپنی تمام تر لغزشوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے رب کریم کی بارگاہ عفو و کرم میں ہم دست بدعا ہیں کہ خدمت قرآن کے زمرہ میں ہماری یہ حقیری کوشش قبول فرمائے جو بلاشبہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انجام پذیر ہو سکی نیز! اللہ رب العزت ان تمام ومعاونین کرام کو جزائے احسن فی الدارین عطا فرمائے جنہوں نے کسی بھی طرح ہماری حوصلہ افزائی کی اور ہمیں نیک تمناؤں اور دعوات صالحہ سے نوازا۔ ہم قارئین ناظرین کرام سے یہ بھی التماس کرتے ہیں کہ "قرآن کریم کی اس تفسیر ذخیرۃ البرھان فی فھم القرآن کی اس کوشش وکاوش سکو عقیدت ومحبت سے دیکھ کر اور چوم کر بند کر کے نہ رکھ دینا، بلکہ اس کے ایک ایک صفحہ کا بغور مطالعہ فرمائیں، اپنے اعزہ واحباب کو تحفتاً پیش کریں، ہو سکتا ہے کوئی اور بھی آپ کی وساطت سے عمل و کردار کی تڑپ، ابلاغ حق اور اشاعت حق کے جذبوں سے سرشار ہو جائے۔ اللہ رب العزت ہمیں عمل کی توفیق دے۔ آمین یارب العٰلمین۔

قاری محمد اکرام غفرلہ

11 ذوالحجہ 1447ھ بمطابق 28 مئی 2026

قرآن مجید سے غفلت اور بے اعتنائی باعث تباہی ہے

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَخَاتَمِ النَّبِیّٖنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے، جس نے اپنے کلام آخری کتاب کو حضور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل کر کے قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے لئے ہدایت کا پورا سامان مہیا کر دیا۔ تمام درود وسلام محبوب خدا، رسول امین شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جنہوں نے بیت اللہ، خانہ کعبہ کو بتوں کی آلودگی سے پاک کر کے دین توحید کا پھریرا لہرا دیا، جن کی احادیث میں وحی کی خوشبو ہے، جن کے اعمال کو اللہ نے اسوہ حسنہ قرار دیا جن کے اصحاب دین حق کی شمعیں لے کر نکلے تو ظلمت کدۂ دہر توحید وسنت کے نور سے جگمگا اٹھا۔

قرآن کریم رب کائنات کا کلام اور ہمیشہ باقی رہنے والی کتاب لازوال و بے مثال ہے، یہ آخری ہدایت ہے جو دلوں میں خوف خدا اور آخرت پر یقین وایمان رکھنے والوں کی رہبری کے لئے لوح محفوظ سے حضور رسالت مآب جناب حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قلب اطہر پر اتاری گئی، اس کی ہر آیت لاریب اور اس کی صداقت وسچائی ہر طرح کے شکوک وشبہات سے مبرا اور بلند و بالا ہے۔

چودہ سو برس پہلے جب دین ابراہیمی کی روشنی ماند پڑ گئی تھی، انسانی شرف ومجد بتوں اور دیوتاؤں کے قدموں میں نچھاور کیا جارہا تھا، انسانی عقل و دانش حسب ونسب کے غرور اور سیارگان سماؤں کی چمک دمک میں ہی گم ہو کر رہ گئی تھی، (سیارگانِ سماؤں (فارسی اور عربی کا مرکب) کے لغوی معنی

” آسمان کے گھومنے والے ستارے یا سیارے“ ہیں ۔) انسان تھے مگر انسانیت ذلت و رسوائی کی دلدل میں غرقاب ہو رہی تھی، جانوروں اور درندوں کو کمزور وضعیف غلاموں کی نسبت زیادہ عزت و آزادی حاصل تھی مظلوم اور ستم رسیدہ انسانوں کے بچے بھیڑوں، بکریوں، بلیوں اور کتوں کی راحت و عیش اور آزادی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے، طاقتور لوگ کمزوروں پر خدا بن بیٹھے تھے ان کی پوجا اور پرستش کی جاتی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جیتے جاگتے معجزات میں سے قرآن کریم وہ زندہ وجاوید معجزہ ہے جو امت مسلمہ کی اصلاح اور دینی و دنیاوی ترقی کے لئے سب سے محکم پیغامِ خداوندی ہے جو ایک مسلمان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کیلئے مصلح ہے اور اور زندگی کے تمام امور میں بھی مینارہ نور ہے اور قرآن مجید پوری انسانیت کے لیے کتابِ ہدایت ہے، اور اسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ دنیا بھر میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔اسے پڑھنے اور پڑھانے والوں کو امامِ کائنات نے اپنی زبانِ صادقہ سے معاشرے کے بہترین لوگ قرار دیا ہے اور اس کی تلاوت کرنے پر اللہ تعالیٰ ایک ایک حرف پر ثواب عنایت کرتے ہیں۔ دورِ صحابہ سے لے کر دورِ حاضر تک بے شمار اہل علم نے اس کی تفہیم وتشریح اور ترجمہ وتفسیر کرنے کی خدمات سرانجام دی ہیں۔امت مسلمہ کی ذلت و رسوائی کا ایک بڑا سبب حدیث پاک، قرآن حکیم سے منہ موڑنا ہے۔اگر کچھ لوگ قرآن پڑھتے بھی ہیں تو اس کے معانی ومفاہیم سے بے خبر ہیں۔ضرورت ہے کہ ہر مسلمان خدا کی آخری کتاب کو سمجھنے کو شش کرے۔

قطب الاقطاب حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ نے فرمایا:

قرآن شریف پر عمل کرنے سے برکت ہوتی ہے، جس قوم پر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت کاملہ سے فضل فرمانا چاہتے ہیں اس کے پاس اپنے کسی بندے کو بھیج دیتے ہیں اور اس کو کتاب عطا فرما دیتے ہیں تاکہ اس پر عمل کریں، اس میں محض نصیحت ہوتی ہے اور دین و دنیا کی کامیابی اور قرب خداوندی حاصل کرنے کے اصول بتائے گئے ہوتے ہیں۔اس کا ادب یہی ہوتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ نے اس امت کے لئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھیجا اور آپ

ﷺ پر کتاب نازل فرمائی ۔جس قوم کی خوش بختی اور خوش نصیبی ہوتی ہے وہ اس پر عمل کرتی ہے اور فائز المرام ہوتی ہے اور جس قوم کی بد نصیبی ہوتی ہے وہ محض اس کو تبرک سمجھتی ہے ۔لوگ اسے چومتے چاٹتے ہیں ۔غلاف چڑھاتے ہیں اور محض برکت کے لئے گھر میں رکھتے ہیں ۔لیکن عمل اس کے خلاف کرتے ہیں ،تو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ ۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک یادگار تحریر فرماتے ہیں :

قرآن مجید ہر سچے مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا بہترین راہنما ہے ۔میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ قرآن مجید ہماری اخلاقی ،معاشرتی ،اقتصادی اور سیاسی ضرورتوں میں بہترین راہنما ہے اور اس کا دعوی ہے کہ اس کی ہدایات میں سچائی اور انصاف کو انتہائی حد تک محفوظ رکھا گیا ہے اس میں ارشاد ہے :

تَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَعَدۡلًا ۔

اس اعلان کی بنا پر ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی زندگی کا مکمل اور بہترین پروگرام فقط مسلمان کے پاس ہے ۔میرے اس دعویٰ کی تصدیق قائداعظم کے خط کے وہ فقرے ہیں جو انہوں نے اگست ۱۹۴۴ء میں مسٹر گاندھی کو لکھا تھا ۔وہ لکھتے ہیں :

قرآن مسلمانوں کا ضابطہ حیات ہے ۔اس میں مذہبی اور مجلسی ،دیوانی اور فوجداری ،عسکری ، تعزیری ،معاشی اور معاشرتی غرضیکہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں ۔مذہبی رسوم سے لے کر کے امور حیات تک روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک ،جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق وفرائض تک دنیوی زندگی جزاوسزا سے لے کر عقبی کی جزاوسزا تک ہر فعل وقول روزانہ اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے ۔"

۱۹۵۴ء میں قائداعظم نے عید کا پیغام دیتے ہوئے کہا :

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات واخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کا دین وایمان اور قانون حیات ہے یعنی مذہبی ،معاشرتی ،تجارتی تمدنی عسکری ،عدالتی اور تعزیری احکام کا مجموعہ ہے ۔"

تلاوت سے پہلے تعوذ کا حکم/حمد اور شکر میں لغوی فرق

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

سورہ فاتحہ کا تعارف

یہ سورت جمہور علماء کے مطابق مکی (یعنی ہجرت سے پہلے نازل ہوئی) ہے اور یہ سب سے پہلی سورت ہے جو ایک ہی وقت میں مکمل نازل ہوئی۔ البتہ بعض اہل علم کے مطابق سورہ فاتحہ کا نزول دو مرتبہ ہوا۔ پہلی مرتبہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، جبکہ دوسری مرتبہ ہجرت مدینہ کے بعد جب بیت اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنادیا گیا، اس وقت یہ سورت دوبارہ نازل کی گئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم! سورہ فاتحہ کے کلمات کی تعداد ستائیں، حروف کی تعداد ایک سو چالیس اور آیات کی تعداد بہ اتفاق علمائے کرام سات ہے، البتہ آیات کی تعیین میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر اہل علم کے نزدیک تسمیہ جزو فاتحہ نہیں، اس لیے سات آیات یوں ہوں گی، کہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْن مستقل آیت ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اور بعض اہل علم، تسمیہ کو مستقل آیت قرار دے کر جزو فاتحہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان حضرات کے نزدیک اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ " الگ آیت نہیں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذہب کے مطابق، تسمیہ کو مستقل آیت قرار دیا گیا ہے۔

ترتیب نزولی میں سورت فاتحہ پانچویں جبکہ موجودہ قرآنی ترتیب میں پہلے نمبر پر ہے۔ اس

میں ایک رکوع اور سات (۷) آیات ہیں۔

مکی اور مدنی سورتوں میں فرق

قرآن کریم کی بعض سورتیں مکی ہیں اور بعض مدنی، راجح قول کے مطابق ان میں فرق یہ ہے کہ جو سورتیں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں (خواہ وہ کہیں بھی نازل ہوئی ہوں) وہ سورتیں "مکی" کہلاتی ہیں اور جو سورتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں (خواہ وہ بدر، احد، احزاب، حدیبیہ، یا فتح مکہ کے موقع پر مکہ مکرمہ ہی میں کیوں نہ نازل ہوئی ہوں) وہ سب سورتیں مدنی کہلاتی ہیں۔ (مناہل العرفان، ج:۱ص:۱۹۴)

قرآن کریم حق تعالٰی کی طرف زندگی گزارنے کا بہترین دستور ہے

قرآن کریم حق تعالٰی کی طرف سے بندوں کی جانب آخری پیغام اور زندگی گزارنے کا بہترین دستور ہے، دنیا و آخرت کی جملہ فوز و فلاح اسی سے وابستہ ہیں۔ قرآن کریم ہی آئین و قانون، دستور و منشور، علم و عمل، موعظت و ہدایت، شفا اور سکون ہے۔ عقیدہ و فکر سے لے کر عمل و آداب اور حسن معاشرت تک سبھی کچھ قرآن کریم میں ہے۔ اس سے عبادات، معاملات، اخلاق و آداب، انفرادی، گھریلو اور اجتماعی زندگی وابستہ ہے۔ نظام مملکت، نظام عدل، نظام معیشت، و مستقبل، دنیاء نظامِ معاشرت، نظام اُسرَہ (یعنی خاندانی نظام)، قوموں کا عروج و زوال تاریخی عالم انسانیت کا ماضی، حال اور مستقبل برزخ، آخرت، حیوانات، نباتات، جمادات، نوری، خاکی، ناری، جنت، جہنم، خوف خدا، تقوی، پرہیزگاری، انبیاء و رسل علیہم السلام کے حالات، صالحین و ابرار سیئین و فجار، اسباب ترقی اور اسباب تنزلی وغیرہ کے تذکرے بھی اسی میں موجود ہیں۔ قرآن کریم وحی الٰہی بھی ہے اور کلام الٰہی بھی۔ یہ حق تعالٰی کی شان جلال اور شان جمال کا مظہر ہے۔

بصورت قرآن، اللہ تعالیٰ بندوں سے ہم کلام بھی ہے اور تنبیہ تسلی کناں بھی۔ قرآن ذکر فکر، لذت آشنائی، معرفت الٰہی، حقوق العباد، باعث رحم انسانیت اور اطمینان قلب ہے تبھی تو حق تعالٰی نے جا بجا اس کتاب کو پڑھنے، سمجھنے، وابستہ ہونے عمل کرنے اور اس کتاب کو اپنانے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ

عزتوں اور علم وعمل کے نور کو وابستہ کیا، جبکہ اس سے انحراف کی صورت میں ذلتیں اور جہالت کے اندھیرے مقدر فرمائے۔اسی سے علم کے موتی اور عمل کے سانچے نمودار ہوتے ہیں۔اسی سے مفلوک الحال طبقات کی ڈھارس اور خوش حال لوگوں کی خوش حالی جڑی ہوئی ہے۔اسی لیے اس کا حق ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے، سمجھا جائے، اس کی گہرائیوں میں اترا جائے عمل کیا جائے، اپنایا جائے، اس وفادار کلام سے دوستی کر کے قبر حشر میں اس کی رفاقت حاصل کی جائے۔اہل اسلام کو اپنی عظمت رفتہ کے حصول کے لیے پھر سے انفرادی و اجتماعی طور پر قرآن کریم کو اپنانا ہوگا، اپنے انفرادی وجود سے لے کر اپنی ریاست تک کو قرآنِ کریم کی برکات سے آراستہ کرنا ہوگا۔قرآن کریم سے صحیح معنوں میں استفادہ تبھی ممکن ہے، جب اسے خوب سمجھا جائے، اس میں تدبر کیا جائے، اس کے علوم ومعارف تک رسائی حاصل کی جائے۔

تعوذ کا حکم

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○

اَعُوْذُ	میں پناہ مانگتا ہوں	بِاللّٰهِ	اللہ کی
مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○		شیطان مردود سے	

نماز میں سورہ فاتحہ سے پہلے (اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ) پڑھنا ضروری ہے کیونکہ سورہ فاتحہ قرآن کا حصہ ہے جس کے متعلق قطعی حکم سورہ نحل میں ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ یہ قرآنی آیت (سورۃ النحل، آیت 98) تلاوتِ قرآن سے قبل شیطان مردود کے وسوسوں سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ (تعوذ) مانگنے کا حکم دیتی ہے۔ اس کا مقصد قرآن پاک کے علمی وروحانی فیض کو شیطان کی مداخلت سے پاک رکھنا اور تلاوت کے دوران توجہ وخشوع برقرار رکھنا ہے۔اور اس کے ساتھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھنا سنت ہے چنانچہ امام اعوذ باللہ اور بسم اللہ دونوں آہستہ پڑھے گا۔۔بہر حال قرآن کریم کی تلاوت کے

وقت بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ، سے پہلے (اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ) پڑھنا بھی ضروری ہے جب تم قرآن کریم پڑھنے لگو تو اللہ کی جناب میں شیطان رجیم سے پناہ مانگو۔ قرآن مجید کی تلاوت، شروع کرنے قبل تعوذ پڑھنا، یہ اللہ تعالی کا حکم ہے، اور اس کی حکمت یہ ہے کہ دوران تلاوت، ذہن شیطانی خیالات اور وساوس سے محفوظ رہے، تاکہ شیطان قرآن مجید میں تدبر کرنے اور اس پر عمل کرنے سے نہ روکے ۔

اللہ تعالیٰ کے تین عظیم صفاتی نام

بِسۡمِ اللّٰہِ	اللہ کے نام سے (شروع)	الرَّحۡمٰنِ	(جو) نہایت مہربان
الرَّحِیۡمِ ○		بہت رحم کرنے والا	

بِسۡمِ یعنی" شروع کرتا ہوں" اللّٰہِ یعنی" اللہ کے نام سے" الرَّحۡمٰنِ یعنی" بہت زیادہ رحم کرنے والا" ، اور الرَّحِیۡمِ ، یعنی" بار بار رحم کرنے والا" ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے تین عظیم صفاتی نام آئے ہیں:" اللہ" وہ ذات جس کی عبادت کی جاتی ہے، جو سب کا خالق و مالک ہے۔" الرحمن" اس کی رحمت تمام مخلوقات پر عام ہے، چاہے وہ مومن ہوں یا کافر۔" الرحیم" اس کی خاص رحمت اہل ایمان کے لیے ہے، یعنی وہ بار بار رحم کرنے والا ہے۔ حضرت انس کی روایت میں آتا ہے (2 مسلم ص 172 ج 1) کہ میں نے اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی مگر کسی نے بھی بسم اللہ بلند آواز سے نہیں پڑھی اونچی آواز سے قرأت الحمد اللہ سے شروع کرتے تھے تاہم بسم اللہ کا پڑھنا ضروری (یعنی سنت ہے) اس کے بعد جب سورہ فاتحہ پڑھ کر دوسری سورہ ملانے لگے تو دونوں سورتوں کے درمیان بھی بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے اور پڑھنے والا ثواب کا مستحق ہوگا۔ البتہ اگر دو سورتوں کے درمیان بسم اللہ نہ بھی پڑھی جائے تو نماز میں خلل واقع نہیں ہوتا۔ احناف اسی بات کا فتویٰ دیتے ہیں ہر اہم کام کے شروع میں" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھنا سنت ہے، حدیث شریف میں وارد ہے کہ جو بھی اہم کام" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بغیر شروع کیا جائے تو وہ ناقص اور بے برکت ہوتا ہے، یعنی جس کام کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ

لی جائے تو وہ کام بابرکت ہونے کی وجہ سے پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ آیت ہر کام کی ابتدا میں اللہ کی مدد اور برکت طلب کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہے، اور اس میں اللہ کی عظمت اور اس کی رحمت کی وسعت بیان کی گئی ہے۔

سورہ فاتحہ تورات، انجیل اور قرآن کی ہر سورت سے بڑی سورت ہے

اللہ کے لئے	لِلّٰهِ	ہر قسم کی تعریف	اَلْحَمْدُ
تمام جہانوں کا	الْعٰلَمِيْنَ ①	(جو) رب ہے	رَبِّ

سورۃ الفاتحہ قرآن مجید کی سب سے پہلی سورت ہے جس کی احادیث میں بڑی فضیلت آئی ہے فاتحہ کے معنی آغاز اور ابتدا کے ہیں۔ اس لئے اسے الفاتحہ یعنی فاتحۃ الکتاب کہا جاتا ہے۔ اس کے اور بھی متعدد نام احادیث سے ثابت ہیں مثلاً صحیح احادیث میں اس کا نام "فَاتِحَةُ الْكِتَابِ، اَلصَّلَاةُ، سُوْرَةُ الْحَمْدِ، اَلسَّبْعُ الْمَثَانِيْ، اَلْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ، اُمُّ الْقُرْآنِ" اور "اُمُّ الْكِتَابِ" آیا ہے، جیسا کہ فاتحہ کے فضائل کی احادیث میں آ رہا ہے۔ اسماء کی کثرت سورت کے معانی و مطالب کی کثرت کی دلیل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: "ایک دفعہ حضرت جبریل علیہ السلام نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے اپنے اوپر زور سے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو سر اٹھایا اور فرمایا: "یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھولا گیا ہے، آج سے پہلے یہ کبھی نہیں کھولا گیا۔" تو اس سے ایک فرشتہ اترا، پھر فرمایا: "یہ فرشتہ زمین پر اترا ہے جو آج سے پہلے کبھی نہیں اترا۔" اس فرشتے نے سلام کہا اور کہا: "آپ کو دو نوروں کی خوش خبری ہو، جو آپ کو دیے گئے ہیں، آپ ﷺ سے پہلے وہ کسی نبی کو عطا نہیں ہوئے، فاتحۃ الکتاب اور سورہ بقرہ کی آخری آیات۔ آپ ان دونوں میں سے جو بھی پڑھیں گے وہ چیز آپ کو ضرور عطا کر دی جائے گی۔" [مسلم، صلاۃ المسافرین، باب فضل الفاتحۃ۔۔ 806] جس طرح اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے مراتب میں فرق ہے، ان میں سے بعض بعض سے افضل ہیں، ہمارے نبی کریم ﷺ پوری اولاد آدم کے سردار ہیں، اسی طرح سورہ فاتحہ تورات، انجیل اور قرآن کی ہر سورت سے بڑی سورت ہے، اگرچہ بہت سی

سورتیں آیات کے اعتبار سے اس سے لمبی ہیں، مگر عظمت میں یہ سب سے بڑھ کر ہے، جیسا کہ آیات میں آیت الکرسی سب سے عظیم آیت ہے، گو اس سے لمبی آیات بہت سی ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی تفسیر کے بارے میں علماء نے بیان کیا ہے کہ "الحمد" سے مراد ہر قسم کی تعریف، شکر اور حمد ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔"لِلّٰهِ" یعنی یہ تعریف اللہ کے لیے ہے، جو تمام کائنات کا رب ہے۔"رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" میں "رب" سے مراد وہ ذات ہے جو پیدا کرنے والا، پالنے والا، سنوارنے والا اور ہر چیز کی تدبیر کرنے والا ہے۔"العالمین" سے مراد تمام جہان، یعنی انسان، جنات، فرشتے، حیوانات، نباتات، اور ہر وہ چیز جو موجود ہے۔حمد کا معنی تعریف بھی ہوسکتا ہے اور شکر بھی۔تعریف (حمد) عام ہے اور شکر خاص۔حمد کا تعلق قابل تعریف کارناموں سے ہے۔مثلاً اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان، شمس و قمر اور ستاروں کی حرکت غرض تمام کائنات کا اس قدر مربوط اور منظم نظام بنادیا ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔اس پر اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔اور شکر کا تعلق ان خاص انعامات سے ہوتا ہے جو کسی خاص ذات سے متعلق ہوں۔مثلاً اللہ تعالیٰ کا انسان کو احسن تقویم پر پیدا کرنا۔کسی کو صحت اور رزق کی فراوانیوں سے مالا مال کرنا۔ایسی نعمتوں کے اعتراف کو شکر کہا جاتا ہے۔لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی ہر طرح کی حمد اور شکر کا مستحق ہوا۔علاوہ ازیں اگر مخلوق میں سے کوئی شخص کوئی قابل تعریف کارنامہ سرانجام دے اور اس پر اس کی تعریف کی جائے تو وہ بھی حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہوگی۔کیونکہ قابل تعریف کام کرنے کی صلاحیت اور توفیق بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔گویا ہر طرح کی تعریف کا مستحق اللہ تعالیٰ ہی قرار پاتا ہے۔خلاصہ یہ کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا مطلب ہے: تمام تعریفیں اور شکر صرف اللہ کے لیے ہیں، جو تمام جہانوں کا رب، مالک، پرورش کرنے والا اور تدبیر کرنے والا ہے۔اس آیت میں اللہ کی عظمت، اس کی نعمتوں اور اس کی ربوبیت کا اعتراف اور اظہار ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق ایک الگ جہان ہے

"الْعٰلَمِيْنَ" "اَلْعَالَمُ" کی جمع ہے، جہان۔"اَلْعَالَمُ" جمع ہے جس کا واحد نہیں، جیسے

"قَوْمٌ، رَهْطٌ، نَاسٌ" وغیرہ۔ اَلْعٰلَمِیْنَ کو جمع اس لیے ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق ایک الگ جہان ہے، مثلاً عالم انس، عالم جن، عالم نبات، عالم جماد، عالم ارض اور عالم سماء وغیرہ۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے کئی عالم ہیں، مثلاً انسانوں میں ہر جنس، ہر زبان اور ہر علاقے والوں کا الگ جہان ہے۔ غرض اتنے بے حساب جہاں ہیں جنھیں رب تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، فرمایا: (وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ) [المدثر: 31] "اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" ایک چیونٹی ہی کی ہزاروں قسمیں ہیں، پرندوں کے بیشمار جہان ہیں، سمندر کی مخلوقات کا شمار ہی نہیں، بیشمار کہکشائیں اور ان کے سیارے جن کے مقابلے میں سورج چاند وغیرہ ایک انگوٹھی کی طرح ہیں، ہر ایک الگ جہان ہے۔ ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے وحدہ لاشریک لہ ہونے کے علم کا ذریعہ ہے۔ رب العالمین ان میں سے ہر ایک کو پیدا کرنے والا، پھر ہر لمحہ اس کی ہر ضرورت پوری کرنے والا اور اسے کمال تک پہنچانے والا ہے۔ غرض سب تعریف اللہ کے لیے ہے، کیونکہ وہ "رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ہے۔

"الرحمن" میں عام رحمت اور "الرحیم" میں خاص رحمت

الرَّحْمٰنِ	نہایت مہربان	الرَّحِیْمِ ②	بہت رحم کرنے والا ہے

"الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" دونوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں جو "رحمت" سے مشتق ہیں۔ "الرحمن" کا معنی ہے: وہ ذات جو اپنی رحمت سے تمام مخلوقات کو نوازتی ہے، چاہے وہ مؤمن ہوں یا کافر، مطیع ہوں یا عاصی۔ اس میں اللہ کی رحمت کی وسعت اور عمومیت بیان ہوتی ہے۔ "الرحیم" کا معنی ہے: وہ ذات جو خاص طور پر مؤمنین پر اپنی رحمت فرماتی ہے، یعنی آخرت میں خصوصی رحمت اور انعامات سے نوازتی ہے۔ اس طرح "الرحمن" عام رحمت اور "الرحیم" خاص رحمت کے معنی میں آتا ہے۔ لفظ "الرحمن" مبالغہ کے صیغے پر ہے، جو رحمت کی شدت اور وسعت کو ظاہر کرتا ہے، اور یہ نام صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے، کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ جبکہ "الرحیم" کا اطلاق مخلوق پر بھی ہو سکتا ہے، جیسے قرآن میں رسول اللہ ﷺ کے لیے "رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ" فرمایا گیا۔ ایک اور

وضاحت کے مطابق: ''الرحمن'' دنیا میں سب کے لیے رحمت ہے اور ''الرحیم'' آخرت میں مؤمنین کے لیے خاص رحمت ہے۔ خلاصہ یہ کہ ''الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' میں رؤف'' اور'' رحیم'' اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں جن کا مطلب بہت مہربان، شفقت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ یہ الفاظ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر، اور رسول اللہ ﷺ کی شانِ شفقت کو بیان کرنے کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت، دوام اور خصوصیت دونوں پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔

عبادت اور استعانت کا مفہوم/ جبریہ اور قدریہ دونوں فرقوں کا ردّ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝٤

مٰلك اور "مَلِك دونوں قراءتیں متواتر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں

مٰلِكِ	مالک ہے	يَوْمِ	دن کا	الدِّيْنِ ۝٣	بدلے کے

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ "الدِّيْنِ" "دَانَ يَدِيْنُ" کا مصدر ہے، بدلہ دینا، جزا دینا۔رحمٰن ورحیم کے بعد جزا کے دن کا مالک ہونے کی صفت بیان فرمائی۔ایک قراءت (مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ) ہے یعنی روز جزا کا مالک اور دوسری "مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" ہے، یعنی روز جزا کا بادشاہ۔قرآن مجید کے رسم الخط میں "مٰلِكِ" لکھا ہے، اسے "مَالِكِ" اور "مَلِكِ" دونوں طرح پڑھا جاسکتا ہے اور دونوں قراءتیں متواتر طور پر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔مالک وہ ہے جو اپنی ملکیت میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار رکھتا ہو، آپ پتھر کے مالک ہیں، تو آپ کو اختیار ہے کہ اس کو مسجد کے منبر میں لگائیں یا بیت الخلاء کے فرش میں، یعنی روز جزاء کا مطلب ہے وہ دن جب تمام بندوں کو ان کے دنیا میں کیے ہوئے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، یوں تو روز جزاء سے پہلے

بھی کائنات کی ہر چیز کا اصلی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے؛لیکن یہاں خاص طور پر روز جزاء کے مالک ہونے کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہی انسانوں کو بہت سی چیزوں کا مالک بنایا ہوا ہے، یہ ملکیت اگرچہ ناقص اور عارضی ہے تاہم ظاہری صورت کے لحاظ سے ملکیت ہی ہے،لیکن قیامت کے دن جب جزاء وسزا کا مرحلہ آئے گا تو یہ ناقص اور عارضی ملکیتیں بھی ختم ہو جائیں گی،اس وقت ظاہری ملکیت بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی نہ ہوگی۔قیامت کے دن کا مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کامل مختار ہیں ،جس کا قصور چاہیں تو معاف کر دیں اور جس کو چاہیں سزا دیں، اسلام سے پہلے بعض مذاہب کے ماننے والوں کا خیال تھا کہ گنہگاروں کو گناہ کی سزا دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، وہ گناہ کو معاف نہیں کرسکتا،عیسائیوں کے'عقیدۂ کفارہ' کی بنیاد یہی ہے کہ ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ انسانیت کے گناہ کو معاف کرنا چاہتے تھے؛مگر ایسا کرنا اس کے لئے روا نہیں تھا؛اس لئے (نعوذ باللہ) مجبور ہو کر اس نے اپنے بیٹے کو دنیا میں قربانی کے لئے بھیجا؛ تاکہ وہ انسانیت کے گناہ کا کفارہ بن سکے،قرآن مجید نے اسی کی تردید کے لئے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت اور بدلہ کے دن کا مکمل مالک ہے۔اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کا مالک بھی ہے اور بادشاہ بھی۔

"الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے ساتھ قیامت کے دن کے مالک اور بادشاہ ہونے کی مناسبت یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی بہت رحم کرنے والا ہوتا ہے مگر اس کی ملکیت میں کچھ نہیں ہوتا،اس لیے وہ چاہتے ہوئے بھی رحم نہیں کرسکتا، پھر کوئی شخص بہت سی ملکیت کا مالک ہوتا ہے مگر اس کا بادشاہ کوئی اور ہوتا ہے،وہ مالک ہوتے ہوئے بھی پورا اختیار نہیں رکھتا۔

"يَوْمِ الدِّيْنِ" کے معنی

"يَوْمِ الدِّيْنِ" کے معنی یوم جزا کے ہیں۔اس دنیا میں بھی مکافات یعنی اعمال کی جزا کا سلسلہ جاری رہتا ہے،مگر اس جزا کا مکمل ظہور چونکہ قیامت کے دن ہوگا اس لیے قیامت کے دن کو خاص طور پر"يَوْمِ الدِّيْنِ"(بدلے کا دن) کہا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس دن کے"مَالِكِ" اور "مَلِكِ" (بادشاہ) ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس روز ظاہری طور پر بھی مالکیت اور ملوکیت کا یہ سلسلہ ختم

ہو جائے گا، فرمایا: (یَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا ۖ وَالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ) [الانفطار: 19] ”جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کی مالک نہیں ہوگی اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا۔“ اور فرمایا: (لِمَنِ الۡمُلۡكُ الۡیَوۡمَ ؕ لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ) [المؤمن: 16] ”آج بادشاہی کس کی ہے؟ اللہ ہی کی جو ایک ہے، دبدبے والا ہے۔“ اس دن مالک بھی اللہ تعالیٰ ہوگا، بادشاہ بھی وہی ہوگا، صرف اسی کا حکم چلے گا۔ صفت رحمت اور بدلے کے دن کی ملکیت میں مناسبت اس حدیث سے واضح ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کے پاس سو رحمتیں ہیں، جن میں سے اس نے ایک رحمت جن وانس، جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے درمیان نازل فرمائی ہے، اسی کے ساتھ وہ ایک دوسرے پر شفقت کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ وہ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ وحشی جانور اپنے بچوں پر شفقت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ننانویں رحمتیں مؤخر کر رکھی ہیں، جن کے ساتھ وہ قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔“ [مسلم، بخاری]

شرک کی جملہ اقسام کے استیصال کے لیے یہ اکیلی آیت ہی کافی ہے

اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ ④

اِیَّاكَ	صرف تیری ہی	نَعۡبُدُ	ہم عبادت کرتے ہیں
وَاِیَّاكَ	اور صرف تجھ ہی سے	نَسۡتَعِیۡنُ ④	ہم مدد مانگتے ہیں۔

اس آیت میں (نَعۡبُدُ) اور (نَسۡتَعِیۡنُ) سے پہلے (اِیَّاكَ) کا لفظ لایا گیا ہے جو حصر کا بھی فائدہ دے رہا ہے اور تاکید کا بھی اور اس کا معنی یوں بنتا ہے کہ ہم صرف اور صرف تیری ہی عبادت کرتے اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ تیرے سوا نہ کسی کی عبادت کرتے ہیں نہ کریں گے اور نہ ہی کسی سے مدد مانگتے ہیں اور نہ مانگیں گے۔ گویا شرک کی جملہ اقسام کے استیصال کے لیے یہ اکیلی آیت ہی کافی ہے۔ یہ لفظ تین معنوں میں آتا ہے۔ (1) پرستش (2) اطاعت و فرمانبرداری (3) ہمہ وقت کی بندگی اور غلامی۔ یہاں یہ لفظ اپنے تینوں معنوں میں مستعمل ہے۔ نیز اس آیت میں جمع متکلم کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ واحد متکلم کے نہیں ہوئے۔ کیونکہ اسلام نماز باجماعت کی بھی تاکید

کرتا ہے اور معاشرتی اجتماعی زندگی اور نظم وضبط کی بھی۔علاوہ ازیں (نَعۡبُدُ) کے فوراً بعد (نَسۡتَعِيۡنُ) کالفظ لایا گیا تاکہ انسان کو اپنی عبادت پر غرور نہ پیدا ہو جائے بلکہ وہ یہ سمجھے کہ اسے عبادت کی توفیق بھی اللہ ہی کی مدد کی بنا پر میسر آئی ہے۔"اِيَّاكَ نَعۡبُدُ"کو پہلے اور"وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ "کو بعد میں ذکر کر کے دعا کا سلیقہ سکھایا گیا ہے کہ درخواست سے پہلے اللہ کی حمد وثنا اور تمجید کے بعد اپنی بندگی اور اپنے تعلق کا حوالہ پیش کرو، یعنی اپنے عمل کے وسیلے سے درخواست کرو۔ یہ وسیلہ حق ہے، جیسا کہ فرمایا: (رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعۡنَا مُنَادِيًا يُّنَادِىۡ لِلۡاِيۡمَانِ اَنۡ اٰمِنُوۡا بِرَبِّكُمۡ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَكَفِّرۡ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الۡاَبۡرَارِ) [آل عمران:193] "اے ہمارے رب! بیشک ہم نے ایک آواز دینے والے کو سنا، جو ایمان کے لیے آواز دے رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ تو ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے رب! پس ہمیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہم سے ہماری برائیاں دور کر دے اور ہمیں نیکوں کے ساتھ فوت کر۔"

اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ فاتحہ کا خلاصہ

"اِيَّاكَ نَعۡبُدُ" کے بعد "وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ" لانے میں یہ سبق بھی ہے کہ آدمی یقین رکھے کہ وہ کوئی بھی نیکی اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا اور مکمل طور پر اللہ کے سامنے بے بس اور بے اختیار ہونے کا عقیدہ رکھے اور اس کا اظہار واقرار بھی کرے۔ یعنی ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور تیری عبادت میں اور اپنے تمام کاموں میں تیری ہی مدد مانگتے ہیں، تیری مدد کے بغیر نہ ہم تیری عبادت کر سکتے ہیں نہ کچھ اور۔ اس لفظ میں اللہ پر توکل اور اپنے تمام کام اس کے سپرد کرنے کی اعلیٰ ترین تعلیم دی گئی ہے۔ بعض سلف نے فرمایا، فاتحہ قرآن کا خلاصہ ہے اور (اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ) فاتحہ کا خلاصہ ہے۔ کیونکہ "اِيَّاكَ نَعۡبُدُ" کہنے سے انسان شرک سے بری ہو جاتا ہے اور "وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ" کہنے سے وہ اپنی قوت و طاقت اور اختیار سے خالی ہو کر صرف اللہ پر توکل واعتماد کا اقرار و اظہار کرتا ہے۔ اس استعانت سے مراد ان کاموں میں مدد طلب

کرنا ہے جن کا اختیار اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے پاس رکھا ہے، کسی مخلوق کو ان کا اختیار نہیں دیا، مثلاً معالج دوا دے سکتا ہے مگر شفا صرف اللہ کے پاس ہے۔ کوئی صاحب خیر کچھ روپے پیسے دے سکتا ہے مگر غنی یا فقیر کر دینا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ طبیب علاج کر سکتا ہے مگر اولاد سے نوازنا صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ فوج، آدمیوں اور اسلحے سے ایک دوسرے کی مدد ہو سکتی ہے مگر فتح و شکست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ غرض دنیا کے ظاہری اسباب و وسائل جو انسانوں کو عطا کیے گئے ہیں، ان میں ایک دوسرے سے مدد مانگنا بھی جائز ہے اور ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی لازم ہے، جیسا کہ فرمایا (وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى [المائدۃ: 2] "نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔" افسوس کہ بعض لوگ ان ہستیوں کو مدد کے لیے پکارتے ہیں جو سنتے ہی نہیں، نہ پاس موجود ہوتے ہیں اور ایسی چیزوں کی مدد مانگتے ہیں جو اگر وہ زندہ ہوں یا سن رہے ہوں تب بھی ان کے اختیار میں نہیں۔ کتنا ظلم ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں "وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" (صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں) کا اقرار کرتے ہیں، پھر غیر اللہ سے مدد مانگتے ہیں، مثلاً "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَغِثْنِيْ" (اے اللہ کے رسول! میری مدد کیجیے) یا اے مولا علی، اے شیر خدا! میری کشتی پار لگا دینا، یا المدد یا غوث اعظم، یا مدد کن یا معین الدین چشتی۔ غرض صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کے عہد و اقرار کے بعد غیروں کو رب تعالیٰ کا شریک بنا کر انھیں رب کے اختیارات کا مالک سمجھتے ہیں اور ان سے استغاثہ و استعانت کرتے ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال ہے کہ "اِيَّاكَ نَعْبُدُ" سے آخر فاتحہ تک دعا کرنے والا جمع کے صیغے سے دعا کرتا ہے، جب کہ دعا کرنے والا ایک ہے، اس لیے واحد کا صیغہ ہونا چاہیے تھا، اگر جمع کا لفظ تعظیم کے لیے مانا جائے تو یہ دعا کے مناسب نہیں ہے۔ جواب اس کا یہ ہے کہ بندہ اپنی انتہائی تواضع کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عالی بارگاہ میں اپنی درخواست اکیلا پیش کرنے کی جرأت نہیں کرتا، بلکہ تمام عبادت کرنے والے جن و انس اور فرشتوں کے ساتھ مل کر پیش کرتا ہے کہ ہم سب (جن میں تیرا یہ

عاجز بندہ بھی ہے) تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

بعض اہل علم نے یہ حکمت بیان فرمائی کہ جمع کے صیغے میں ایک لطیف تواضع پائی جاتی ہے، وہ یہ کہ واحد کے صیغے میں اپنی کچھ بڑائی کا اظہار ہوتا ہے جو جمع کے صیغے میں نہیں ہے۔ (ابن کثیر) بعض مفسرین نے اس میں یہ حکمت بیان فرمائی کہ ہر مومن دوسرے مومنوں کے ساتھ ایک جسم کی مانند ہے اور ہر مومن تمام مومنوں کی نمائندگی کرتا ہے، اس لیے وہ اکیلا ہی تمام مسلمانوں کی طرف سے عرض کرتا ہے کہ ہم سب صرف تیری تعریف کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ("ایمان والے لوگ، ان کے خون آپس میں برابر ہوتے ہیں، ان کا سب سے معمولی آدمی بھی ان کے عہد کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اپنے سوا سب کے مقابلے میں ایک ہاتھ ہوتے ہیں۔" [أبو داؤد، الدیات، باب أیقاد المسلم من الکافر؟: 4530، وقال الألبانی حسن صحیح]

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ عبادت و استعانت کی بہترین صورت اجتماعی عبادت و استعانت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی جامع صورت نماز کو باجماعت ادا کرنے کا حکم دیا: (وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّكٰوۃَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ) [البقرۃ: 43] "اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔" وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ کس کام کے لیے مدد مانگتے ہیں، تاکہ وہ عام رہے، مقصد یہ ہے کہ ہر کام میں تیری مدد مانگتے ہیں۔

جبریہ اور قدریہ دونوں فرقوں کا ردّ

دنیا میں عموماً تین قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے آپ کو تقدیر کے ہاتھوں میں محض ایک کھلونا سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ جبریہ کہلاتے ہیں دوسرے وہ جو اپنے آپ کو مختار مطلق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان جو کچھ چاہے کر سکتا ہے ایسے لوگ قدریہ کہلاتے ہیں۔ معتزلین بھی اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تیسرے وہ جو نہ اپنے آپ کو مختار مطلق سمجھتے ہیں اور نہ مجبور محض اور یہی لوگ دراصل حق پر ہیں۔ اس چھوٹی سی چار الفاظ کی آیت میں جبریہ اور قدریہ دونوں کا رد موجود

ہے۔وہ یوں کہ جب ہم نَعۡبُدُ کہتے ہیں یعنی ہم عبادت کرتے ہیں تو اختیار ثابت ہوگیا اور اس میں جبریہ کا رد ہے اور جب ہم مدد چاہتے ہیں۔تو اس سے بندہ کا محتاج ہونا ثابت ہوا یعنی وہ مختار مطلق نہیں اور اس میں قدریہ کا رد موجود ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ عبادت میں وہ تمام باتیں داخل ہیں جو بندگی کا حصہ ہیں، یعنی: نماز، سجدہ، قربانی، قسم، نذر، کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے جائز ہیں، اللہ کے سوا کسی زندہ یا مردہ کے لئے جائز نہیں، اور دعاء صرف اللہ ہی سے کی جائے گی، اللہ کے ماسوا سے استمداد اور استعانت حرام ہے۔بہرحال اس آیت میں بندوں کو اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ واضح کردیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی قسم کی عبادت کے لائق نہیں، نیز ہر کام میں حقیقی مدد اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنی چاہیے؛ کیونکہ صحیح معنی میں کارساز اس کے سوا کوئی نہیں، دنیا کے بہت سے کاموں میں بعض اوقات کسی انسان سے جو مدد مانگی جاتی ہے، وہ اسے کارساز سمجھ کر نہیں؛ بلکہ ایک ظاہری سبب سمجھ کر مانگی جاتی ہے۔

صراطِ مستقیم/ انعام والے اور گمراہ لوگ کون ہیں؟/ سورت فاتحہ سے آغاز قرآن کی وجہ؟

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ ○ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ⑤ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۧ⑦

ہدایت کے کئی مفہوم

اِهۡدِنَا	ہدایت دے ہمیں	الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ⑤	سیدھے راستے کی

ہدایت کے کئی مفہوم ہیں، راستے کی طرف رہنمائی کرنا، راستے پر چلا دینا، منزل مقصود تک پہنچا دینا۔ اسے عربی میں ارشاد توفیق، الہام اور دلالت سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی ہماری صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرما، اس پر چلنے کی توفیق اور اس پر استقامت نصیب فرما، تاکہ ہمیں تیری رضا (منزل مقصود) حاصل ہوجائے۔ یہ صراط مستقیم محض عقل اور ذہانت سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس آیت سے دعا کی ابتداء ہورہی ہے۔ اللہ کے بندے اس کے حضور عرض کرتے ہیں اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ دکھلا ہم کو سیدھا راستہ۔ صراط مستقیم کیا ہے؟ اس کی تشریح خود قرآن پاک میں موجود ہے۔ اس راستے سے مراد اسلام دین اور توحید کا راستہ ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر اللہ

کے تمام انبیاء علیہم السلام گامزن رہے۔سورۃ الحجر میں جہاں ابلیس نے انسانوں کو اللہ کے راستے سے بہکانے کا چیلنج کیا ہے، وہاں اللہ نے فرمایا ہے هٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ یہی سیدھا راستہ ہے جو میری طرف آتا ہے اس کے اصول وضوابط قرآن پاک میں بتلا دیے گئے ہیں اور اس راستے پر چلنے والے مخلص بندوں پر شیطان کا کوئی داؤ کامیاب نہیں ہوسکے گا یہ وہی راستہ ہے جو اللہ کی رضا اور اس کے قرب کے مقام تک پہنچانے والا ہے،مفسرین نے اس آیت کے مختلف معنی بیان فرمائے ہیں۔حضرت عمر فاروق رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ’’یہ راستہ اپنے اوپر چلنے والے کو سیدھا چلاتا ہے یہاں تک کہ اس پر چل کر وہ جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس آیت کا معنی یہ ہے کہ دلائل کے ساتھ لوگوں کی سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرنا ہمارے ذمے ہے۔(قرطبی، الحجر، تحت الآیۃ: ۴۱، ۵ / ۲۱، الجزء العاشر)

امام فخر الدین رازی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں’’اس آیت کا ایک معنی یہ ہے کہ اخلاص مجھ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے۔(تفسیر کبیر، الحجر، تحت الآیۃ: ۴۱، ۷ / ۱۴۵) علامہ اسماعیل حقی رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ نے اس آیت کا یہ معنی بیان فرمایا کہ’’ چنے ہوئے بندوں کا ابلیس کے بہکاوے سے بچ جانا وہ راستہ ہے جو سیدھا اللّٰہ تعالٰی تک پہنچا دیتا ہے۔(روح البیان، الحجر، تحت الآیۃ: ۴۱، ۴ / ۴۶۹)

آگے سورہ نحل میں آتا ہے وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے،اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ نے رسول بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر سیدھے راستے کو بیان کرنا اپنے ذمہ کرلیا ہے، یہ اس کا فضل اور احسان ہے لہٰذا جو ہدایت حاصل کرے گا تو وہ اپنے فائدے کیلئے کرے گا اور جو گمراہ ہوگا تو گمراہی کا نقصان بھی اسی کو ہے۔ وَ مِنْهَا جَآىٕرٌ اور بعض ٹیڑھے راستے بھی ہیں جن پر چل کوئی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا یہ کفر و شرک کے شیطانی راستے ہیں، شیطان لوگوں کو ان راستوں کی طرف لے جانا چاہتا ہے مگر اسلام دین حق اور توحید کا یہی صراط مستقیم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف جاتا ہے۔یعنی ان راستوں میں سے کچھ راستے ایسے ہیں جو صراطِ مستقیم سے منحرف ہیں اور ان پر چلنے والا منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔کفر اور گمراہی کی تمام راہیں جیسے یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت وغیرہ یونہی اپنی خواہشات

سے نئے نئے مسلک بنانے والے سب اس میں داخل ہیں۔

قَصۡدُ السَّبِیۡلِ سے مراد

اس سے معلوم ہوا کہ " قَصۡدُ السَّبِیۡلِ" سے مراد دین اسلام اور اہلسنّت والجماعت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم، حسنِ اعتقاد اور اچھے اعمال پر اِستقامت عطا فرمائے اور کفر، گمراہی اور بدمذہبی سے ہماری حفاظت فرمائے۔ روح البیان، سورۃ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین برحق صرف اسلام ہے جو اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت کا راستہ ہے، تمام انبیاء ملائکہ اور نیک لوگ یہی راستہ اختیار کرتے آئے ہیں یہی صراطِ مستقیم ہے۔ ہر نبی کا دین اسلام ہی تھا لہٰذا اسلام کے سوا کوئی اور دین بارگاہِ الٰہی عَزَّ وَجَلَّ میں مقبول نہیں لیکن اب اسلام سے مراد وہ دین ہے جو حضرت محمد مصطفٰی صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ لائے، چونکہ آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کیلئے رسول بنا کر مبعوث فرمایا اور آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو آخری نبی بنایا، تو اب اگر کوئی کسی دوسرے آسمانی دین کی پیروی کرتا بھی ہو لیکن چونکہ وہ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے اِس قطعی اور حتمی دین اور نبی کو مکمل طور پر نہیں مان رہا لہٰذا اس کا آسمانی دین پر عمل بھی مردود ہے۔ یہود و نصاریٰ وغیرہ کفار جو اپنے دین کو افضل و مقبول کہتے ہیں اس آیت میں ان کے دعویٰ کو باطل فرمایا گیا ہے۔

اللہ عَزَّوَجَلّ کے نزدیک پسندیدہ دین

اللہ نے واضح طور پر فرمادیا ہے وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا: اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین چاہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور قرآن پاک میں کئی جگہ فرمادیا کہ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کے نزدیک پسندیدہ دین صرف اسلام ہے اور اسلام کے علاوہ کوئی دین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اِس زمانے میں معتبر نہیں۔ اسلام کے علاوہ کوئی کسی دین کی اخلاقی باتوں پر جتنا چاہے عمل کرلے جب تک مکمل طور پر بطورِ عقیدہ اسلام کو اختیار نہیں کرے گا اس کا کوئی عمل بارگاہِ الٰہی میں مقبول نہیں اور اب اسلام سے مراد وہ دین ہے جسے حضرت محمد مصطفٰی صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ لے کر آئے۔ جو

آدمی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ تلاش کرے گا تو وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ اور ایسا شخص آخرت میں سخت نقصان اٹھانے والا ہوگا۔ وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا بلکہ خدا تعالیٰ کے غضب کا شکار ہو کر جہنم میں پہنچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننا انسان کا فطری حق ہے جو شخص ان فطری تقاضوں کے مطابق چلے گا، فرائض کو ادا کرے گا نواہی سے پرہیز گاری کرے گا وہی صراط مستقیم کا مسافر ہوگا، اور وہی راستہ ہے جس کی تعلیم و تلقین تمام انبیاء کرتے آئے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ صراط مستقیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ وہ سیدھی راہ ہے جو بندے کو اللہ تک پہنچانے والی ہے۔ اور اس میں کوئی پیچ وخم یا افراط وتفریط نہیں اور یہ ایک ہی ہو سکتی ہے جبکہ باطل راہیں لاتعداد ہوتی ہیں۔ اسی راہ کو اللہ تعالیٰ نے حبل اللہ بھی فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ سے تعبیر فرمایا ہے اور صراط مستقیم کی دوسری تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حق کا وہ راستہ جو سیدنا آدم سے لے کر تا قیامت ایک ہی رہا اور رہے گا اور وہی راستہ توحید ہر نبی کو وحی کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ دعا ان تمام امور پر مشتمل ہے۔ جب انسان سیدھے راستے کی دعا کرتا ہے تو کہتا ہے کہ پروردگار! ہمیں صحیح راستہ دکھا، اس پر چلا اور اس پر استقامت عطا فرما۔

انعام یافتہ گروہ/گمراہ لوگ کون ہیں؟

صِرَاطَ	راستہ	الَّذِيْنَ	(ان لوگوں کا) جو	اَنْعَمْتَ	تو نے انعام کیا
عَلَيْهِمْ	ان پر	غَيْرِ	نہ	الْمَغْضُوْبِ	غضب کیا گیا
عَلَيْهِمْ	ان پر	وَلَا	اور نہ	الضَّآلِّيْنَ ⑦	سب گمراہ ہوئے
آمین			قبول فرما		

انعام والے اور گمراہ لوگ کون ہیں؟: وہ لوگ نہیں جنہیں مال و دولت یا حشمت وجاہ کی فراوانیاں حاصل ہیں۔ اور آپ کے ارشاد کے مطابق (آیت مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ) سے مراد تو یہود ہیں جو گناہ کے کاموں پر دلیر ہو گئے تھے اور ان پر اللہ کا عذاب اور پھٹکار نازل ہوئی اور الضَّآلِّيْنَ سے مراد عیسائی حضرات ہیں جو فلسفیانہ موشگافیوں میں پھنس کر تثلیث اور گمراہی کا شکار ہوئے

(۱) کون لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے؟ خود قرآن مجید میں ان کا ذکر ہے کہ وہ چار ہیں: 'انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین' (النساء: ۶۹) گویا ان کی راہ پر چلنا اور ان کی پیروی کرنا دین میں مطلوب ہے، معلوم ہوا کہ قرآن مجید نے جہاں کہیں آباء واجداد کی اتباع سے منع کیا ہے، اس سے وہ آباء واجداد مراد ہیں، جو حق کے راستے سے ہٹے ہوئے تھے، جو لوگ راہِ حق پر ثابت قدم تھے، ان کی راہ پر قائم رہنے کی تو دعاء کرائی گئی ہے، اسی سے ائمہ مجتہدین کی تقلید کا جائز ہونا ثابت ہوتا ہے ؛ کیوں کہ وہ صالحین میں تھے۔ (۲) انسان کی گمراہی کا ہمیشہ دو میں سے ایک سبب ہوتا ہے، حق اور سچائی کی تلاش میں کوتاہی اور اس کی وجہ سے نادانستہ گمراہی کا ارتکاب "الضَّآلِّیۡنَ" سے یہ لوگ مراد ہیں، دوسرے: سچائی کو جاننے کے باوجود اس کا انکار، ایسے لوگ غضب شدید کے مستحق ہوتے ہیں، یہ " مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ " ہیں، قرآن مجید نے ان دونوں گروہوں کی غلطی سے بچانے کے لئے دُعاء سکھائی ہے۔

مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ کا مصداق، اور "الضَّآلِّیۡنَ سے مراد

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ "مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ " کا مصداق یہود اور "الضَّآلِّیۡنَ" سے مراد عیسائی ہیں، (مجمع الزوائد: ۶/ ۳۱۴ بحوالہ مسند احمد، نیز دیکھئے: صحیح ابن حبان :۱۶/ ۱۸۴، عن عدی بن حاتم) اس کا مقصود یہ ہے کہ مغضوب گروہوں اور قوموں میں ایک یہود اور گمراہوں اور ضالین میں ایک عیسائی ہیں، نہ یہ کہ صرف یہی قومیں اس سے مراد ہیں، اور ایسا آپ نے اس لئے ارشاد فرمایا کہ عیسائیوں نے نبی برحق حضرت مسیح علیہ السلام کے سلسلے میں افراط سے کام لیا اور ان کو "رسول اللہ" سے 'ابن اللہ' (خدا کا بیٹا) بنادیا؛ اس لئے وہ گمراہ ہوئے 'الضَّآلِّیۡنَ' کے زمرہ میں داخل ہوئے، یہودیوں نے اللہ کے پیغمبروں کے ساتھ تفریط کی، ان کی ایذاء رسانی اور اہانت کے درپے ہوئے؛ اس لئے بار بار اللہ کے غضب کا شکار ہوئے، گویا اُمت کو دونوں باتوں سے منع فرمایا گیا، اس سے بھی کہ اللہ کے نیک بندوں کے معاملہ میں افراط اور مبالغہ سے کام لیا جائے، کہ یہی گمراہی کا پیش خیمہ ہے، اور اس سے بھی منع کیا گیا کہ ان کے بارے میں اہانت وتحقیر کا

رو یہ اختیار کیا جائے؛ کہ یہ خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے۔(۳) سورۂ فاتحہ کے ختم پر ”آمین“ کہنا مسنون ہے، اس کے معنی ہیں: ’اے رب! قبول فرمالیجئے‘ ابومیسرہ سے مروی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو سورۂ فاتحہ پڑھائی، جب ”وَلَا الضَّآلِّيْنَ“ پر پہنچے تو کہا کہ آپ ﷺ آمین کہیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے آمین کہا، (مصنف ابن أبي شيبة، باب ماذكر في آمين الخ، حدیث نمبر: ۸۰۴۴) اس سے معلوم ہوا کہ نماز کے باہر بھی ”آمین“ کہنا مسنون ہے، نماز میں امام اور مقتدی دونوں آمین کہیں گے، حدیث میں آمین کا زور سے کہنا بھی منقول ہے اور آہستہ کہنا بھی؛ اس لئے دونوں طرح آمین کہنا درست ہے؛ البتہ آہستہ کہنا افضل ہے؛ کیوں کہ ”آمین“ بالاتفاق دعاء ہے اور قرآن مجید نے دعاء کا ادب یہی بتایا ہے کہ آہستہ کی جائے ”وَادْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً“۔(اعراف:۵۵) سورہ فاتحہ کو آپ قرآن کریم کا چھوٹا سا نسخہ بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ پورے قرآن کریم کے مضامین اللہ تبارک وتعالی نے سورہ فاتحہ میں جمع فرمادیے، یہ گٹھلی کی طرح ہے، گٹھلی کا اثر پورے درخت کے پتوں، شاخوں، ٹہنیوں اور پھلوں میں ہوتا ہے، سورۃ فاتحہ کا اثر بھی قرآن پاک کی بقیہ ایک سو تیرہ سورتوں میں ہے، ایک سو تیرہ سورتوں کو سمیٹو تو سورت فاتحہ بنتی ہے۔ اور سورت فاتحہ کو کھولو تو قرآن کی ایک سو چودہ سورتیں ظاہر ہو جاتی ہیں، قرآن کے تیس پارے ظاہر ہو جاتے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کا خلاصہ

☆ انسان اپنی زندگی میں چند اہمیت کے حامل اصول اور قوانین کا محتاج ہوتا ہے جو اس سورت میں مذکور ہیں:

☆ نظامِ معاش: ”رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ“

☆ نظامِ عدالت: ”مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ“ ☆ نظامِ قانون کے سامنے انقیاد: ”اِيَّاكَ نَعْبُدُ“

☆ قانونِ حیات: ”اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ“

☆ قومی وملّی مدافعتی ودفاعی نظام: ''غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ''

☆ پوری سورت توحید، مبدأ ومعاد جیسے اہم مضامین پر مشتمل ہے، اس لیے اس کو ''اُمُّ الْكِتَاب'' بھی کہتے ہیں۔

☆ کہتے ہیں کہ قرآن مجید ساری آسمانی کتابوں کا خلاصہ ہے، اور پورے قرآن کا خلاصہ سورۃ فاتحہ ہے، اور سورۃ فاتحہ کا خلاصہ ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' ہے۔

☆ شاید اس بنیاد پر حدیث میں سورۃ فاتحہ کو ''أعظم سورۃ في القرآن'' کہا گیا ہے، جس طرح آیۃ الکرسی کو ''أعظم الآیات'' کہا گیا، اب کتابوں میں قرآن کریم ''أعظم الکتب''، اور سورتوں میں فاتحہ ''أعظم السور''، اور آیتوں میں آیۃ الکرسی ''أعظم الآیات'' ہے۔

سورۃ الفاتحہ سے قرآن اور نماز کا آغاز

سورۃ الفاتحہ سے قرآن کا آغاز کیا گیا اور ہر نماز میں فاتحہ پڑھوائی گئی، اکیلے نماز پڑھ رہے ہو یا امام ہو تو ہر رکعت میں فاتحہ پڑھو، اور اگر مقتدی ہو تو من كانَ لهُ إمامٌ فقراءةُ الإمامِ لهُ قراءةٌ'' (سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۸۵۰) امام نے فاتحہ پڑھی تو اس نے تمہاری طرف سے بھی پڑھی لیکن فاتحہ بہر صورت پڑھی گئی، بعض لوگ غلط پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ حدیث کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے امام صاحب ان تمام احادیث پر عمل کرتے ہیں جن کی صحت کے متعلق آئمہ میں اتفاق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے دونوں قسم کی روایات منقول ہیں۔ بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فاتحہ امام کے قائل نہیں ہیں مگر بعض سے شبہ ہوتا ہے کہ شائد وہ بھی قائل ہوں اگر قائل ہیں تو وہ بھی استحباب کے درجے میں فرض واجب نہیں سمجھتے۔ تینوں آئمہ کرام فرماتے ہیں کہ فاتحہ خلف امام صرف سری نمازوں میں مستحب ہے۔ جہری نماز میں قرات کرنا امام کے ساتھ جھگڑا کرنے کے مترادف ہے البتہ امام ابوحنیفہ امام اوزاعی اور امام سفیان ثوری رحمۃ

اللہ علیہم کا مسلک یہ ہے کہ فاتحہ خلف الامام نہ سری نماز میں پڑھے اور نہ جہری میں خلاصہ بحث یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص منفرد نماز پڑھتا ہے یا بطور امام نماز پڑھاتا ہے تو وہ سورہ فاتحہ بھی پڑھیگا اور اس کے ساتھ دوسری سورہ بھی ملائے گا۔ اور اگر نمازی کسی امام کے پیچھے مقتدی ہے تو وہ خاموش رہے گا اور امام کی قرآت کو سنے گا کیونکہ اسکے لیے امام کی قرأت کفایت کر جائے گی۔ امام ابوحنیفہ کا مسلک احادیث کے مطابق ہے اور اس سے تمام احادیث پر عمل ہو جاتا ہے۔ روایت کے ایک حصے پر عمل کرنا اور دوسرے حصے کو چھوڑ دینا مناسب نہیں ہے امام ترمذی فرماتے ہیں کہ بعض نے تشدد کیا ہے تشدد کرنا ٹھیک نہیں بلکہ بات ہمیشہ دلیل کیساتھ ہونی چاہیے پھر دیکھیں کہ قوی دلائل کدھر ہیں چنانچہ قوی دلائل امام ابوحنیفہ کے مسلک کی حمایت میں ہیں الھذا امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ بہرحال اگر صرف فرض نماز اور وتر دیکھیں تو ایک دن میں بیس مرتبہ ہم نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھتے ہیں، یہ کیا وجہ ہے کہ نماز میں فاتحہ، ہر رکعت میں فاتحہ، قرآن کے آغاز میں فاتحہ، یاد رکھیے! اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورۃ الفاتحہ، قرآن کے تمام مضامین کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اگر فاتحہ سمجھ میں آئی تو قرآن سمجھ میں آ گیا، اگر فاتحہ پر عمل ہوا تو نماز کا نور آپ کو نصیب ہو گیا، فاتحہ سے نماز کی بھی تکمیل ہو گئی، اور اگر فاتحہ نہ ہو تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس نماز میں فاتحہ نہ ہو وہ نماز ناقص ہے۔ (صحیح مسلم، ج:ص: ۲۰۶، رحمانیہ)

بہرحال اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد اس کی صفات کا ذکر ہوا اور اس کے بعد عبادت و استعانت کا ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہونے کا بیان تھا۔ پھر بندوں کی طرف سے درخواست کی گئی کہ مولا کریم! ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ انسانوں کی اولین ضرورت یہ ہے کہ ان کے سامنے صراط مستقیم واضح ہو جائے۔ اس کے بعد صراط مستقیم کے لیے نمونے کا ذکر کیا گیا کہ یا اللہ! ہمیں ان لوگوں کے راستے پر چلا جن پر تیرا انعام ہوا۔ قرآن پاک نے انعام یافتہ چاروں گروہوں یعنی انبیاء صدیق، شہید اور صالحین کی وضاحت

فرمادی کہ یہی وہ لوگ ہیں جن نمونے پر چلنے کی ضرورت ہے اور جن کا طریقہ اختیار کیے بغیر کوئی انسان فلاح حاصل نہیں کرسکتا۔ نیز اس سے ابتدا کرنے کی بظاہر یہ وجہ بھی ممکن ہے کہ جو شخص قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کا خواہش مند ہو، اسے سب سے پہلے اپنے خالق و مالک کی صفات کا اعتراف کرتے ہوئے اس کا شکر ادا کرنا چاہیے اور حق کے ایک سچے طلب گار کی طرح اسی اللہ سے سیدھے رستے اور ہدایت کی دعا مانگنی چاہیے، اس لیے فاتحہ میں" صراط مستقیم کی جو دعا سکھائی گئی ہے، آگے مکمل قرآن مجید اسی سیدھے رستے کی تشریح ہی ہے۔ (آسان ترجمہ قرآن)

سورۃ اور آیت کا مفہوم و مطلب/ ریب کا لغوی مفہوم متقین کے لیے ہدایت

تعارف سُورَۃُ البَقَرَہ

یہ سورہ ترتیب قرآنی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر اور ترتیب نزولی کے لحاظ سے ۸۷ ستاسی نمبر پر ہے یعنی مدنی سورتوں میں سب سے پہلی سورت ہے۔ مکہ میں چھیاسی (86) سورتیں نازل ہوئیں، اگر چہ اس سورہ کا بیشتر حصہ ابتدائی مدنی دور میں نازل ہوا تاہم اس کی کچھ آیات بہت مابعد کے دور میں نازل ہوئیں مثلاً حرمت سود کی آیات جو 10 ھ کے اواخر میں نازل ہوئیں۔ سورۃ البقرہ بالاتفاق مدنی اور قرآن کریم کی سب سے لمبی سورت ہے، اس کی دو سو چھیاسی (۲۸۶) آیات اور چالیس (۴۰) رکوع ہیں۔ یاد رکھیے کہ قرآنی سورتوں کی دو طرح سے ترتیب بیان کی جاتی ہے: قرآن کریم کے مطالعہ اور تفسیر کے ضمن میں ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ توقیفی (یا ترتیب مصحفی) دو بنیادی اصطلاحات ہیں۔ ان کا مطلب اور مفہوم درج ذیل ہے:

ترتیبِ نزولی

1 ترتیبِ نزولی: معنی و مطلب: اس سے مراد وہ ترتیب ہے جس کے مطابق قرآن کریم کی آیات اور سورتیں نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئیں۔ یعنی کونسی سورت اور آیت، کب کہاں اور کس ترتیب سے نازل ہوئی۔ گویا جس ترتیب سے سورتیں نازل ہوئی ہیں، اس ترتیب کو ترتیب نزولی کہا جاتا ہے۔ اور

ترتیب زمانی بھی کہا جاتا ہے مثال کے طور پر۔سب سے پہلی وحی: سورہ العلق (آیت 1-5)۔مکی سورتیں: جن میں عقائد، توحید، اور آخرت کا ذکر ہے (ابتدائی زمانہ)۔مدنی سورتیں: جن میں احکام، قوانین، اور معاشرتی مسائل کا ذکر ہے (ہجرت کے بعد کا زمانہ)۔مقصد: اس ترتیب کو جاننے کا مقصد قرآن کے تدریجی نزول، احکام کی بتدریج منسوخی اور نفاذ، اور تاریخِ اسلام کو سمجھنا ہے۔

ترتیبِ توقیفی یا ترتیبِ مصحفی

2 ترتیبِ توقیفی یا ترتیبِ مصحفی: قرآن کریم نازل ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کی جو ترتیب صحابہ کرام کو سمجھائی کہ کسی آیت کو کس سورت میں رکھا جائے؟ اور آیات کو کیسے ترتیب دیا جائے، یعنی جس ترتیب کے مطابق قرآن مجید آج ہمارے پاس کتابی شکل (مصحف) میں موجود ہے۔سورہ فاتحہ سے شروع ہو کر سورہ الناس پر ختم ہونے والی ترتیب ہے ترتیبِ توقیفی۔ یہ ترتیب نزول کے مطابق نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق ہے۔آپ ﷺ نے وحی کے نزول کے وقت ہی کاتبین وحی کو بتا دیا تھا کہ یہ آیت یا سورت کس جگہ رکھی جائے۔حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں اسی ترتیب کے مطابق قرآن کو ایک جگہ جمع کیا گیا، اس لیے اسے ترتیبِ عثمانی بھی کہتے ہیں۔موجودہ زیرِ تلاوت قرآن مجید ترتیب نزول میں نہیں بلکہ اسے مصحفی قرآن کہا جاتا ہے۔ ترتیب مصحف (یعنی کتابی صورت) میں قرآن موجود ہے اس پر تمام مسلمانوں کا مکمل اتفاق ہے۔آیات قرآنی جو اللہ کی طرف سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے نازل ہوتی گئیں اس تسلسل کو ترتیب نزول قرآن کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی سب سے طویل آیت

اسی سورت میں قرآن کریم کی سب سے بڑی آیت، آیتِ دین یا آیتِ مداینہ (یعنی سورہ البقرہ، آیت 282) قرآن مجید کی سب سے طویل آیت ہے، جو قرض کے لین دین، معاملات کو لکھ لینے اور گواہ بنانے کے احکام بیان کرتی ہے۔'مداینہ کے معنی قرض کے لین دین کے ہیں، اور یہ آیت مالیاتی لین دین میں شفافیت، ناانصافی کے خاتمے، اور بھول چوک سے بچنے کے لیے

تحریری دستاویز (دستاویز) کو لازم قرار دیتی ہے۔ نیز اس سورت میں آیت الکرسی بھی ہے، جو اجر وثواب کے لحاظ سے تمام قرآنی آیات سے افضل آیت ہے، قرآن کریم کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾ بھی اسی سورت میں ہے۔ اس سورت کا کمال یہ ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کے لوگوں کا ذکر کیا ہے، انسانوں کی جتنی اقسام ہیں، مومن، کافر، منافق، نیک و بد وغیرہ سب کا ذکر اللہ نے سورۃ البقرہ میں کیا ہے۔

لفظ سورہ اور آیت کا تعارف وتشریح

لفظ سورہ س کے ساتھ آیا ہے۔ اور اس کا معنی ہے "قِطْعَةٌ مِّنَ الْاٰيَاتِ" کا مطلب ہے " آیتوں پر مشتمل ایک ٹکڑا یا حصہ۔ گویا چند یا زیادہ آیتیں مل کر ایک ٹکڑا بن جائے تو اسے سورہ کہا جاتا ہے۔ کسی سورہ کیلئے کم از کم تین آیات کا ہونا ضروری ہے۔ چناچہ سورہ عصر، سورہ کوثر اور سورہ نصر تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔ سورہ کے ہر ٹکڑے کو آیت کہتے ہیں۔ جس طرح سورتیں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ اسی طرح آیتیں بھی چھوٹی بڑی ہوتی ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی آیت ایک لفظ کی بھی ہو سکتی ہے جیسے الٓمّٓ یا حٰمٓ اور ایک حرف بھی ایک آیت ہو سکتا ہے۔ جیسا نٓ، قٓ وغیرہ اور بعض آیات اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ پورے ایک رکوع پر مشتمل ہوتی ہیں۔ جیسے سورہ مزمل کے دوسرے رکوع والی آیت ہے۔ آیت کے مختلف معانی: آیت کا معنی علامت اور اس کا دوسرا معنی دلیل ہے۔ قرآن کریم میں آیت کا لفظ ان دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ میں زمین وآسمان کی پیدائش، دن رات کے اختلاف، پانی میں چلنے والی کشتی، بارش اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے پھلوں وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ اس میں عقلمندوں کیلئے قدرت کی نشانیاں یا علامات ہیں۔

فضائل سورہ البقرۃ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس گھر میں سورہ البقرہ پڑھی جائے، شیطان اس گھر سے نکل جاتا

ہے ۔(مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین وقصرھا، باب استحباب الصلوۃ النافلۃ فی بیتہ ۔۔ الخ) نیز آپ ﷺ نے فرمایا: دو جگمگانے والی سورتیں یعنی البقرہ اور آل عمران پڑھا کرو۔ قیامت کے دن وہ اس حال میں آئیں گی جیسے وہ دو بادل یا دو سائبان یا پرندوں کے دو جھنڈ ہیں اور وہ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے (مغفرت کے لیے) جھگڑا کریں گی (لہٰذا) سورہ البقرہ پڑھا کرو۔ اسے حاصل کرنا برکت اور چھوڑ دینا حسرت ہے اور باطل قوتیں (جادو وغیرہ) اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ (مسلم، کتاب فضائل القرآن سورہ البقرۃ)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

الٓمّٓ ۝١ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٢

الٓمّٓ ۝	ال م

حُروفِ مُقَطَّعات اور اس کی اقسام

انہیں حروف مقطعات کہا جاتا ہے، یعنی علیحدہ علیحدہ پڑھے جانے والے حروف۔ قرآنِ حکیم میں 114 سورتیں ہیں، جن میں سے 29 سورتوں کی شروعات مختلف مُفرد حُروف اور کلمات سے ہوتی ہے جیسا کہ الٓمّٓ، یٰسٓ، طٰہٰ، نٓ وغیرہ، ان کو حُروفِ مُقَطَّعات کہتے ہیں۔ حُروفِ مُقَطَّعات کی اقسام: حروف مقطعات پانچ طرح کے ہیں: ایک حرفی: یہ تین سورتوں میں ہیں، جیسا کہ نٓ، قٓ اور صٓ۔ دو حرفی: یہ نو سورتوں میں ہیں جیسا کہ حٰمٓ، یٰسٓ، طٰہٰ، طٰسٓ وغیرہ۔ تین حرفی: یہ تیرہ سورتوں میں ہیں جیسا کہ الٓمّٓ، طٰسٓمّٓ، الٓرٰ، عٓسٓقٓ وغیرہ۔ چار حرفی: یہ دو سورتوں میں ہیں جیسا کہ الٓمّٓرٰ، الٓمّٓصٓ۔ پانچ حرفی: یہ بھی دو سورتوں میں ہیں جیسا کہ کٓھٰیٰعٓصٓ، حٰمٓ عٓسٓقٓ۔ ان کلمات کے معنیٰ تک دماغوں کی رسائی نہیں اور ان کے معنیٰ سمجھ ہی نہیں آتے ہیں۔ علّامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: غالب گمان یہ ہے کہ حروف مقطعات پوشیدہ علم اور راز ہیں، جن سے علما ناواقف ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت سیّدُنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہر کتاب کے راز ہوتے ہیں اور قرآن مجید کے راز سورتوں کے شروع میں آنے والے حروف ہیں ان کے معنی کے بارے میں کوئی

مستند روایت نہیں ہے۔ واللہ اعلم بمرادہ۔ سلف صالحین کی عام طور پر یہ رائے ہے کہ اس کی صحیح مراد سے اللہ تعالیٰ ہی واقف ہیں، گویا ان حروف کے ذریعہ اصحابِ عقل و دانش کا امتحان ہے، نادان کا امتحان یہ ہوتا ہے کہ اس کو تحقیق و جستجو کا حکم دیا جائے اور دانا کا امتحان یہ ہے کہ اس کے فکر و تدبر کے لئے سرحدیں مقرر کر دی جائیں کہ اِن سے آگے قدم نہیں رکھنا ہے، انسانی عقل کہیں رکنا نہیں چاہتی، چاند پر قدم رکھ دیا تو مریخ پر قدم ڈالنا چاہتی ہے، مریخ زیرِ قدم آجائے تو سورج کو اپنا اسیر بنانا چاہتی ہے؛ چنانچہ اِن 'حروفِ مقطعات' کا مقصود عقل انسانی کا امتحان ہے کہ خدا کے منشاء کے مطابق وہ اس کی کھوج میں پڑنے سے باز رہے، پھر چوں کہ ان حروف کے معانی معلوم ہونے پر نہ دنیا کا کوئی حکم شرعی موقوف ہے اور نہ آخرت میں نجات یا عذاب؛ اس لئے انسان کے اس سے ناواقف ہونے میں کچھ حرج نہیں۔

کفار مکہ کے قرآن کے نزول پر دو طرح کے اعتراض

ذٰلِكَ	وہ	الْكِتٰبُ	کتاب
لَا رَيْبَ	کوئی شک نہیں	فِيْهِ	اس میں

یعنی اس کتاب قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے، اس کے نبی ﷺ کے دل پر اترنے اور نبی کے اس پیغام کو لوگوں تک پہنچا دینے میں کسی مقام پر شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ یہ سب امور اللہ تعالیٰ کی براہ راست نگرانی میں طے پا رہے ہیں۔ ریب دراصل ایسے شک کو کہتے ہیں جس میں اضطراب اور خلجان کا عنصر بھی شامل ہو۔ کفار مکہ کے قرآن کے نزول پر دو طرح کے اعتراض تھے۔ ایک یہ کہ محمد ﷺ خود ہی اس کو تصنیف کر کے ہمیں یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ کلام منزل من اللہ ہے اور دوسرا اعتراض یہ تھا کہ یہ قرآن دوسرے عالموں سے سیکھ کر ہمیں سنا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ منزل من اللہ ہے۔ اگر بات اتنی ہی ہوتی تو خلجان اور اضطراب کا کوئی عنصر اس میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ قرآن جو دعوت پیش کر رہا تھا اس میں سب سے زیادہ زور ہی عقیدہ آخرت اور اخروی باز پرس پر دیا جا رہا تھا جب کہ کفار مکہ بعث بعد الموت کے کلی طور پر منکر تھے اور انہیں

اضطراب اور بے چینی اس بات پر تھی کہ اگر بالفرض قرآن کی دعوت سچی ہے تو پھر ان کی خیر نہیں۔ بعث بعد الموت کا مطلب ہے مرنے کے بعد قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے قبروں سے اٹھانا۔ یہ عقیدہ اجزائے ایمان میں سے ہے، جس کا مقصد نیکو کاروں کو جزا اور گناہ گاروں کو سزا دینا ہے، تاکہ دنیا میں ہونے والے اعمال کا حساب کتاب لیا جاسکے۔

انسانی اضطراب اور خلجان کا علاج

ان کے اسی اضطراب اور خلجان کو دور کرنے کے لیے اس سورہ کے تمہیدی الفاظ میں ہی یہ واضح کر دیا گیا کہ اس کتاب کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول اور اس کے مضامین سب کچھ قطعی اور یقینی ہیں اور اس پر ایمان لانے والوں کو کسی قسم کا شک اضطراب اور خلجان باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا تمہارے اضطراب اور خلجان کا بھی یہی علاج ہے۔ کہ تم اسے تسلیم کر کے اس پر ایمان لے آؤ۔ قرآن کو 'کتاب' کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن مجید پیغمبر اسلام ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں ایک مُصحف اور کتاب کی صورت میں مرتب ہو چکا تھا، جس کا ایک ایک حرف آج تک محفوظ ہے، یہ محض متفرق یادداشتوں کا مجموعہ نہیں، جسے پیغمبر اسے ان کے مختلف اصحاب نے موقع بہ موقع سنا ہو، پھر سینہ بہ سینہ ان کی روایت ہوئی ہو اور بعد کو یہ یادداشتیں الفاظ و معانی کی نوع بہ نوع تبدیلیوں کے ساتھ نقل اور جمع کی گئی ہوں، دنیا میں اسلام کے سوا دوسرے اہل مذاہب کے پاس جو مذہبی صحیفے موجود ہیں، ان کا یہی حال ہے؛ اسی لئے وہ صحائف نہ لفظی تبدیلیوں سے محفوظ رہے، نہ معنوی تحریفات سے۔ یعنی قرآن مجید کے اللہ کی طرف سے ہونے میں کوئی شبہ نہیں، نیز قرآن مجید میں جتنے حقائق و واقعات بیان کئے گئے ہیں، گذشتہ اقوام کے قصص و واقعات ہوں، مستقبل کی خبریں ہوں یا کائنات کی چھپی ہوئی حقیقتوں کا ذکر ہو، خواہ ان کا تعلق فلکیات سے ہو، طبعیات سے ہو یا حیاتیات سے، یہ سب حقیقت پر مبنی ہیں، ان کے بارے میں شک و شبہ کا کوئی کانٹا دل میں نہیں چبھنا چاہئے، اگر کسی بات میں شبہ ہو تو یہ انسان کی عقلِ کوتاہ اور فہمِ نارسا کا قصور ہے، نہ یہ کہ قرآن مجید کا بیان غلط ہے؛ چنانچہ آج تک نت نئی سائنسی تحقیقات حرف بہ حرف قرآن مجید کی تصدیق کرتی جاتی ہیں۔

تمام لوگوں کی ہدایت سے مُراد

تمام متقین کے لئے	لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۝	ہدایت ہے	هُدًى

هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ہدایت کا ایک معنی راستہ دکھانا ہے، اس لحاظ سے تو قرآن تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ (هُدًى لِّلنَّاسِ) [آل عمران : 4] "تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔" دوسرا معنی منزل تک پہنچا دینا ہے۔ اس لحاظ سے یہ صرف متقین کے لیے ہدایت ہے، کیونکہ منزل پر وہی پہنچتا ہے جو رہبر کے کہنے پر چلتا ہے، شفا اسی مریض کو ہوتی ہے جو نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کرتا ہے۔ شرع میں متقی وہ ہے جو ہر ایسی چیز سے اپنے آپ کو باز رکھے، جس کے کرنے یا چھوڑنے سے خطرہ ہو کہ وہ اللہ کے عذاب کا مستحق ہو سکتا ہے۔ (کشاف) جیسے سورج کی روشنی ہر شخص تک پہنچتی ہے؛ لیکن اس سے فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے جس کو دیکھنے والی آنکھ بھی میسر ہو، جو آنکھ ہی سے محروم ہو، اس کے لئے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں برابر ہے، بادل ہر زمین پر برستا ہے؛ لیکن سیراب وہی زمینیں ہوتی ہیں، جن میں پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی ہو، چٹیل اور سنگلاخ زمین کو بارش سے کچھ نفع نہیں ہوتا، اسی طرح قرآن مجید کے مخاطب تو تمام انسان ہیں؛ لیکن قرآن مجید کی دعوتِ ہدایت سے فائدہ انھیں لوگوں کو حاصل ہوگا، جو ہدایت کے طلب گار بھی ہوں، اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ دل میں خدا کا خوف ہو، گناہ اور اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی خواہش ہو اور خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ ہو، ایسے ہی لوگوں کو "متقین" کہا گیا ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کا معنی

تقویٰ کا معنی ہے: "نفس کو خوف کی چیز سے بچانا۔" اور شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کا معنی یہ ہے کہ نفس کو ہر اس کام سے بچانا جسے کرنے یا نہ کرنے سے کوئی شخص عذاب کا مستحق ہو جیسے کفر و شرک، کبیرہ گناہوں، بے حیائی کے کاموں سے اپنے آپ کو بچانا، حرام چیزوں کو چھوڑ دینا اور فرائض کو ادا کرنا وغیرہ اور بزرگانِ دین نے یوں

بھی فرمایا ہے کہ تقویٰ یہ ہے کہ تیرا خدا تجھے وہاں نہ پائے جہاں اس نے منع فرمایا ہے۔(مدارک، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۲،)

هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ یعنی قرآن مجید اہلِ تقویٰ کے لیے ہدایت ہے۔"هُدًى" سے مراد ہے: رہنمائی، رشد و ہدایت، اور واضح راستہ دکھانا۔یعنی یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔تقویٰ کا مطلب ہے: اللہ کے احکام کی پیروی کرنا، اس کی نافرمانی سے بچنا، اور اپنے آپ کو گناہوں اور برائیوں سے بچانا۔تفسیر البغوی میں ہے: "هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ" یعنی یہ قرآن اہلِ تقویٰ کے لیے رشد و ہدایت اور بیان ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مطابق متقی وہ ہے جو شرک، کبیرہ گناہوں اور فواحش سے بچتا ہے۔لفظ"تقویٰ" کا اصل معنیٰ ہے: دو چیزوں کے درمیان رکاوٹ بنانا، یعنی انسان اللہ کے عذاب سے بچنے کے لیے اس کی اطاعت اور گناہوں سے اجتناب کو اپنی ڈھال بناتا ہے۔تفسیر مظہری میں ہے کہ "هُدًى" سے مراد ہے: وہ رہنمائی جو انسان کو منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔اور اس ہدایت کو متقین کے ساتھ خاص اس لیے کیا گیا کہ وہی اس سے حقیقی فائدہ اٹھاتے ہیں، اگرچہ قرآن کی رہنمائی سب کے لیے عام ہے۔متقی وہ ہے جو اپنے آپ کو آخرت کے نقصان سے بچاتا ہے، کم از کم شرک سے، اس کے بعد کبیرہ گناہوں سے، اور سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز سے بچے جو اسے اللہ کی یاد سے غافل کرے۔خلاصہ یہ کہ "هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ" کا مطلب ہے: قرآن مجید ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور گناہوں سے بچتے ہیں۔یہی لوگ اس ہدایت سے حقیقی فائدہ اٹھاتے ہیں۔بہر حال ھدی المتقین کا مطلب یہی ہے کہ اس قرآن پاک میں ایسی تاثیر ہے کہ جو اس سے قریب ہوں گے۔اس پر عمل کریں گے وہ متقی بن جائیں گے۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتاب صرف متقیوں کو ہدایت دیتی ہے کیونکہ خود اسی میں دوسری جگہ "هُدًى لِّلۡعٰلَمِيۡنَ بھی آیا ہے۔(تمام جہانوں کے لیے ہدایت) قرآن مجید کی ایک جامع اور اہم صفت ہے، جو سورہ آل عمران کی آیت 96 میں

خانہ کعبہ اور بالواسطہ قرآن و اسلام کی عالمگیر نوعیت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ" کا مطلب یہ ہے کہ قرآن اور دین اسلام دنیا کے ہر کونے میں رہنے والے ہر انسان کے لیے رہنمائی کا ذریعہ ہیں، جو کسی ایک گروہ تک محدود نہیں۔ کہ یہ تمام جہاں والوں کو ہدایت کا راستہ دکھاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں متقی اور پرہیز گار بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

متقین کے اوصاف/ آخرت کا مفہوم اور عقیدہ آخرت کی اہمیت

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ③ وَالَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ④ اُولٰٓئِكَ عَلٰى
هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑤

الغیب سے مراد

الَّذِيْنَ	(وہ لوگ) جو	يُؤْمِنُوْنَ	وہ ایمان لاتے ہیں	بِالْغَيْبِ	غیب پر

يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ) "الغیب" سے مراد وہ حقائق ہیں جو انسان کے حواس اور عقل کی رسائی سے باہر ہیں۔ لغوی معنی: عربی زبان میں غیب کا مطلب ہے" پوشیدہ"، " چھپا ہوا" یا" نظروں سے اوجھل"۔ شرعی اصطلاح (مطلق غیب): وہ حقائق جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، جیسے قیامت کا دن، ماں کے پیٹ میں بچے کی مکمل تفصیلات، اور کل کیا ہوگا۔ الغیب" سے مراد وہ چھپی ہوئی اور پوشیدہ چیزیں ہیں جو انسانی حواس (آنکھ، کان وغیرہ) اور مشاہدے سے دور ہوں۔ اسلامی نظریے میں، مطلق علمِ غیب صرف اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاصہ ہے، جو مستقبل، جنت/جہنم، اور روح جیسے حقائق کا مکمل علم رکھتا ہے۔ تاہم، اللہ نے اپنے نبیوں کو بھی غیب کی بعض خبریں عطا فرمائی ہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بن دیکھی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں اور وہ چھ چیزیں ہیں جن پر بن دیکھے ایمان لانا ضروری ہے: اللہ پر، اللہ کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، اخروی زندگی پر اور اس بات پر کہ ہر طرح کی بھلائی اور برائی اللہ ہی کی طرف سے مقدر ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی چیز پر بھی ایمان نہ ہونے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ سے لے کر "اَلْمُفْلِحُوْنَ" تک کی 3 آیات مخلص مومنین کے بارے میں ہیں جو ظاہری اور باطنی دونوں طرح سے ایمان والے ہیں، اس کے بعد دو آیتیں ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو ظاہری اور باطنی دونوں طرح سے کافر ہیں اور اس کے بعد 13 آیتیں منافقین کے بارے میں ہیں جو کہ باطن میں کافر ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں۔

اقامت صلوٰۃ کا مطلب

نماز	الصَّلٰوةَ	اور وہ قائم کرتے	وَيُقِيْمُوْنَ

(وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ) اور وہ نماز قائم کرتے ہیں" ہے۔ یہ متقین اور سچے مومنین کی دوسری بڑی صفت ہے۔ نماز قائم کرنے کا مطلب (اقامتِ صلاۃ): صرف نماز" پڑھنا" (ادا کرنا) اور بات ہے، لیکن نماز" قائم کرنا" (اقامت) کا مطلب ہے: نماز کو اس کے تمام ظاہری و باطنی آداب، شرائط، ارکان (رکوع، سجدہ) اور خشوع و خضوع کے ساتھ وقت پر ادا کرنا۔ نماز کو صرف ایک رسم کے طور پر نہیں، بلکہ اللہ کے حضور حاضری کے شعور کے ساتھ پڑھنا۔ نماز میں باقاعدگی اور استقامت اختیار کرنا، یعنی ہر حال میں نماز کو قائم رکھنا۔ قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے غیب پر ایمان کے ساتھ عملاً اطاعت بھی ضروری ہے، اس کی پہلی اور دائمی علامت بلا ناغہ نماز ہے، پانچ وقت اذان سن کر نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے سے اطاعت کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ ہو جاتا ہے، پھر جو شخص اطاعت پر تیار ہی نہ ہو اسے ہدایت کیسے ہو؟ اس کی کم از کم حد دن بھر میں پانچ فرض نمازوں کی بروقت اور باجماعت ادائیگی ہے۔ الا یہ کہ جماعت میں شامل نہ ہونے کے لیے کوئی شرعی عذر موجود ہو۔ یہ دوسری شرط ہوئی۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ متقین (ڈرنے والے) غیب پر ایمان لانے

کے ساتھ ساتھ عملی طور پر اللہ کی عبادت کے پابند ہوتے ہیں اور نماز کو اپنے دل اور جسم سے قائم کرتے ہیں، خلاصہ یہ کہ »وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ« کا مطلب نماز کو پوری ذمہ داری اور آداب کے ساتھ قائم کرنا ہے، جو ایمان کے بعد سب سے اہم عملی رکن ہے۔

خرچ کی مختلف مدات

وَمِمَّا	(اس میں) سے جو	رَزَقْنٰهُمْ	ہم نے رزق دیا انہیں
يُنْفِقُوْنَ ○		وہ سب خرچ کرتے ہیں۔	

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ: ”جو کچھ ہم نے انھیں دیا“ اس سے مراد ہر نعمت ہے، مثلاً مال واولاد، علم وعقل، قوت وصحت، عزت و وقار وغیرہ۔ ”ہر نعمت میں سے کچھ نہ کچھ خرچ کرتے ہیں۔“ ساری نعمت خرچ کرنے کا مطالبہ ہی نہیں۔ یعنی رزق سے مراد صرف مال و دولت ہی نہیں بلکہ ہر وہ نعمت ہے جو جسم یا روح کی پرورش میں مددگار ثابت ہو۔ اگر اللہ نے کسی کو علم و ہنر دیا ہے تو وہ دوسروں کو بھی سکھائے۔ جوانی اور صحت دی تو اسے جہاد میں یا ضعیفوں کی مدد کرنے میں خرچ کرے اور مال و دولت ہے تو اسے فقراء، یتیموں مسکینوں وغیرہ پر خرچ کرے اور اس خرچ کی کم از کم حد فرضی صدقہ یعنی زکوٰۃ ادا کرنا ہے اور بلندتر درجہ یہ ہے کہ جو کچھ ضرورت سے زائد ہو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دے یہ تیسری شرط ہے۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ یعنی متقین وہ لوگ ہیں جو ہماری دی ہوئی روزی سے خرچ کرتے ہیں خرچ کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا ہے اور خرچ کی مختلف مدات میں سے پہلے نمبر پر زکوٰۃ ہے۔ دوسرا صدقہ فطر تیسرا قربانی چوتھا عام خیرات۔ اس کے بعد سائلین، محتاجوں، مہمانوں، کمزوروں، یتامیٰ اور بیوگان کی حاجت روائی ہے۔ اس کے بعد وقف کی مد آتی ہے۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو وہ اس کے نام پر وقف کر جائے تا کہ اس کو آخرت میں فائدہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بہترین زمین کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس کا فائدہ مجھے آخرت میں پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس کو وقف کر دو، چنانچہ وہ وقف کر دی گئی۔ اسی طرح مسجدیں بنانا اور ان میں

ضروریات فراہم کرنااور دینی مدارس کا قیام بھی مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں آتا ہے۔کسی نالے پر پل تعمیر کرنا پانی کے لیے کنواں یا نل لگوانا،مسافر خانہ تعمیر کرنا۔حج اور عمرہ خود کرنا یا کسی دوسرے کو کروانا۔اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد پر مال صرف کرنا،یہ سب مدات ہیں۔جن پر خرچ کرنا انفاق فی سبیل اللہ میں آتا ہے۔اور باعث اجر وثواب ہے۔نیک کام کے لیے اخلاص کے ساتھ ایک پیسہ خرچ کرنے کا اجر دس گنا ملتا ہے۔صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جہاد میں خرچ کرنا جہاں دشمن اور کافر دین کو توڑنا چاہتے ہوں۔ان کے مقابلے کے لئے جو مال خرچ کیا جائے۔اس کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ سات سو گنا ہے۔نفقات واجبہ یعنی گھر کے ضروری اخراجات وہ بچوں کے لیے ہوں یا بیوی کے لیے،نوکر چاکر یا رشتہ داروں پر خرچ کیا جائے،یہ سب انفاق فی سبیل اللہ میں آتا ہے اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کا مصداق بنتا ہے۔

تقویٰ والوں کی تین صفتیں

یعنی اس آیت میں تقویٰ والوں کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں،اول:ایمان ویقین،دوسرے: جسمانی افعال کا صالح ہونا،تیسرے:مالی معاملات کا درست اور منشاءِ ربانی کے مطابق ہونا۔ایمان سے مراد ’غیب‘ پر ایمان ہے،یعنی اُن اَن دیکھی حقیقتوں پر یقین کرنا،جو نگاہ اور عقل کی رسائی سے باہر ہیں؛ورنہ آنکھوں دیکھی بات پر کون یقین نہیں کرتا؟اللہ تعالیٰ کا وجود،اللہ تعالیٰ کی صفات،نبوت،وحی،فرشتوں کا وجود،قرآن مجید اور پہلی آسمانی کتابیں،آخرت کا قائم ہونا،پھر اس میں حساب وکتاب اور ثواب وعذاب،یہ سب ’غیب‘ کی باتیں ہیں،جو تو ہمات نہیں ہیں:بلکہ ان ساری حقیقتوں کا علم اللہ اور اس کے رسولوں کے ذریعہ ہوا ہے،جس سے زیادہ قابل اطمینان اور لائق اعتبار کوئی اور ذریعۂ علم نہیں،ظاہر ہے کہ جو نظامِ غیبی پر ایمان نہ رکھتا ہو،وہ قرآن پر ایمان نہیں لاسکتا اور جو قرآن ہی پر ایمان سے محروم ہو،وہ قرآن سے فائدہ کیوں کر اٹھاسکتا ہے؟تقویٰ کی دوسری علامت اور قرآن سے فیضیاب ہونے کی دوسری شرط ’’اقامت صلوٰۃ‘‘یعنی تمام آداب وحقوق کی رعایت کے ساتھ نمازوں کا ادا کرنا ہے،نماز ایک ایسی عبادت ہے،جس میں انسان کا پورا وجود خدا

کے سامنے بچھ جاتا ہے، نگاہ کا دائرہ، زبان کے بول، اعضاء کی نقل وحرکت، غرض کہ ہر عضو حکم خداوندی اور سنت نبوی کا پابند ہے؛ پس گویا نماز ان تمام اعمالِ صالحہ کا عنوان ہے، جن کو جسم کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے، روزہ ہو، حج ہو، خلق اللہ کی خدمت ہو، جہاد ہو، دل ونگاہ اور جسم کے ایک ایک عضو کی گناہ سے حفاظت ہو،''اقامت صلوٰۃ'' گویا بدن سے انجام دیئے جانے والے اِن تمام نیک اعمال کو شامل ہے۔تقویٰ کی تیسری پہچان اورقرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے تیسرا ضروری وصف''انفاق''، یعنی اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا ہے،اس میں زکوٰۃ وصدقاتِ واجبہ بھی شامل ہیں، صدقاتِ نافلہ بھی داخل ہیں اور ماں باپ، بیوی، بچوں، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور مہمانوں غرض خدا کے تمام ہی بندوں کے ساتھ حسن سلوک بھی، جو شخص دوسروں کا حق ادا کرنے میں کوتاہ نہ ہو، وہ حرام طریقہ پر دوسرے بھائی کا مال کیسے حاصل کرسکتا ہے؟ وہ یقیناً سود، جوا اور کمائی کے حرام طریقوں سے بھی اپنے مال کی حفاظت کرے گا، پس گویا''انفاق'' کے لفظ میں'مال' سے متعلق شریعت کی تمام ہدایات کی طرف اشارہ ہے۔

نازل شدہ وحی پر بالتفصیل ایمان لانا ضروری ہے

وَالَّذِيْنَ		(اور وہ لوگ) جو	يُؤْمِنُوْنَ		وہ ایمان لاتے ہیں
بِمَآ	(اس) پر جو	اُنْزِلَ	نازل کیا گیا	اِلَيْكَ	آپ کی طرف
وَمَآ	اور جو	اُنْزِلَ	نازل کیا گیا	مِنْ قَبْلِكَ ج	آپ سے پہلے

یعنی وہ وحی الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں، خواہ کسی پیغمبر پر اتری ہو۔ جو لوگ کسی پیغمبر پر وحی کا اترنا ہی نہیں مانتے ان کے لیے قرآن میں کوئی رہنمائی نہیں۔ البتہ اب عمل اسی پر ہوگا جو آخری نبی ﷺ لے کر آئے، کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ [الحجر:9] جبکہ پہلی کتابیں اصل حالت میں موجود ہی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نازل شدہ سے مراد صرف قرآن ہی نہیں بلکہ قرآن کا بیان (توضیح وتشریح) بھی ہے جو قرآن میں موجود نہیں مثلاً نماز ادا کرنے کی ترکیب، محل زکوٰۃ اشیاء، نصاب زکوٰۃ اور شرح زکوٰۃ کی تعین وغیرہ لاتعداد ایسے احکام و ہدایات جو قرآنی احکام پر عمل پیرا

ہونے کے لیے ضروری تھے۔نیز وہ سابقہ انبیاء پرنازل شدہ وحی پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ان دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ آپ پرنازل شدہ وحی پر بالتفصیل ایمان لاناضروری ہے اورسابقہ انبیاء کی وحی پر اجمالاً کیونکہ قرآنی تصریحات کی روسے ان کی کتابوں میں تحریف وتبدل ہوچکا ہے۔ یہ چوتھی شرط ہے۔

دنیا کی زندگی کے بعدوالی زندگی

وَبِالْاٰخِرَةِ	اورآخرت پر	هُمْ	وہ سب	يُوْقِنُوْنَ○	یقین رکھتے ہیں

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ: آخرت کالفظ" اول" کے مقابلہ میں" آخر" کے ساتھ تاء لگانے سے بنا ہے۔دنیا کی زندگی کے بعدوالی زندگی، اس کا یقین ہی انسان کو نیک اعمال کرنے اور برے اعمال سے بچنے پرآمادہ کرسکتا ہے، اس لیے یہ ایمان کا بنیادی جز ہے۔ "هُمْ" ضمیر کے ساتھ حصر پیدا ہوتا ہے، یعنی آخرت پر صحیح یقین رکھنے والے اہل اسلام ہی ہیں۔یہ گویا 'غیب پر ایمان' ہی کی مزید تشریح وتوضیح ہے، قرآن مجید پرتو تفصیلی ایمان مطلوب ہے، یعنی قرآن نے گذشتہ یا آئندہ کی جن باتوں کی خبر دی ہے، ان کا یقین کرنا، جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے، ان کو حلال اور جن کو حرام قرار دیا ہے، ان کو حرام سمجھنا بھی مومن ہونے کے لئے ضروری ہے، قرآن مجید کے کسی مستحب حکم کا انکار بھی باعث کفر ہے؛ لیکن پہلی آسمانی کتابوں پر''اجمالی ایمان'' کافی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء پر یہ کتابیں نازل فرمائی تھیں، اس کا یقین کرے؛ البتہ موجودہ حالات میں یہ کتابیں جن مضامین پر مشتمل ہیں؛ چوں کہ ان میں بہت کچھ تبدیلی اورملاوٹ ہوچکی ہے؛ اس لئے تنہا ان پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔

آخرت کا لفظ ایک جامع اصطلاح

آخرت کا لفظ ایک جامع اصطلاح ہے جس میں کئی طرح کے عقائدشامل ہیں مثلاً (1) مرنے پر انسان کی زندگی کا کلیتاً خاتمہ نہیں ہوجاتا۔بلکہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جائے گا۔پھر اس سے اس کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا لہٰذا وہ اس دنیا میں ایک غیر ذمہ دارانہ زندگی

گزارنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ وہ اپنے تمام اعمال کے لیے اللہ کے ہاں جواب دہ ہے (2) موجودہ نظام کائنات ابدی نہیں بلکہ ایک وقت آنے والا ہے جب یہ سب کچھ فنا ہوجائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک دوسرا عالم پیدا فرمائے گا جس میں تمام فوت شدہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کرکے اکٹھا کر دے گا اور فرداً فرداً ہر ایک سے اس کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا۔ (3) اس فیصلہ کے مطابق جو لوگ کامیاب قرار دیئے جائیں گے وہ جنت میں داخل ہوں گے اور نافرمان، کافر، مشرک وغیرہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

یوم آخرت کی تفصیلات بیشمار ہیں۔ جنہیں یہاں بیان کرنا ممکن نہیں۔ مختصراً یہ کہ ایمان بالآخرۃ، ایمان بالغیب کا اتنا اہم جزو ہے جو انسان کو زندگی کا دھارا بدلنے اور صراط مستقیم کی طرف آنے اور تقویٰ اختیار کرنے پر مجبور کردیتا ہے۔ اسی لیے اس کا ایمان بالغیب کے بعد علیحدہ طور پر بھی ذکر کردیا گیا۔ یہ ایمان بالآخرت ہدایت قبول کرنے کے لیے پانچویں شرط ہوئی۔

آیت میں فلاح سے مراد

اُولٰٓئِكَ	وہ (لوگ)	عَلٰى هُدًى	ہدایت پر ہیں
مِّنْ رَّبِّهِمْ	اپنے رب (کی طرف) سے	وَاُولٰٓئِكَ	اور وہ (لوگ)
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○	ہی سب کامیاب ہونے والے (ہیں)		

فرمایا جو لوگ مذکورہ صفات کے حاملین ہوں گے اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ یعنی جن لوگوں میں بیان کی گئی صفات پائی جاتی ہیں وہ اپنے رب عَزَّ وَجَلَّ کی طرف سے عطا کی گئی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ جہنم سے نجات پا کر اور جنت میں داخل ہو کر کامل کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ (خازن) یاد رہے کہ اس آیت میں فلاح سے مراد ''کامل فلاح'' ہے یعنی کامل کامیابی متقین ہی کو حاصل ہے ہاں اصل فلاح ہر مسلمان کو حاصل ہے اگرچہ وہ کتنا ہی گناہگار کیوں نہ ہو کیونکہ ایمان بذات خود بہت بڑی کامیابی ہے جس کی

برکت سے بہر حال جنت کا داخلہ ضرور حاصل ہوگا اگر چہ عذابِ نار کے بعد ہو۔تو مطلب یہ ہوا کہ قرآن کریم کے جس پروگرام کو لوگ نماز میں "اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ " کہہ کر مانگتے ہیں وہ سارا پروگرام یہاں تک بتا دیا گیا ہے جو لوگ اس پروگرام کو تسلیم کر کے اس پر عمل کریں گے۔فلاح پائیں گے۔اور جو قوم اس سے روگردانی کرے گی۔وہ فلاح حاصل نہیں کر سکے گی۔ اگر چہ وہ دنیوی لحاظ سے جس قدر بھی آسودہ حال ہو جائے۔پروگرام کو واضح کر دیا گیا ہے یعنی ایمان،تقویٰ،انفاق فی سبیل اللہ۔پھر اس کے بعد سابقہ کتابوں اور آخرت پر ایمان،اور پھر ان اصولوں پر استقامت ہی فلاح کا دارومدار ہے۔اسی کی وجہ سے دائمی عذاب سے نجات حاصل ہوگی اور آخرت میں اعلیٰ درجات نصیب ہوں گے۔اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں بھی ذکر کردہ صفات کے حاملین لوگوں میں شامل فرمائے۔(آمین)

کفر کی تعریف اور ازلی کافروں کو تبلیغ کرنے کا حکم دینے کی وجہ/مہر کیوں اور کب لگتی ہے؟ انسانوں کے تین گروہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْہِمْ ءَاَنْذَرْتَہُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْہُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ⑥ خَتَمَ اللّٰہُ
عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ ؕ وَعَلٰٓی اَبْصَارِہِمْ غِشَاوَۃٌ ۡ وَّلَہُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ⑦

ہدایت اور گمراہی کے اعتبار سے تین گروہ

اِنَّ	بیشک	الَّذِیْنَ	(وہ لوگ) جنہوں نے	کَفَرُوْا	کفر کیا
سَوَآءٌ	برابر ہے	عَلَیْہِمْ	ان پر	ءَاَنْذَرْتَہُمْ	خواہ آپ ڈرائیں انہیں
اَمْ لَمْ		یا نہ		تُنْذِرْہُمْ	آپ ڈرائیں انہیں
لَا یُؤْمِنُوْنَ(6)			نہیں وہ ایمان لائیں گے		

ہدایت (اور گمراہی) کے اعتبار سے انسان تین گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ پہلا گروہ مومنین کا ہے جو ہدایت کو ظاہراً اور باطناً قبول کرتے ہیں اور اسے اپناتے ہیں۔ یہ مومن متقی کہلاتے ہیں۔ سورہ بقرہ کی پہلی چار آیتوں میں ان کا حال، ان کے اوصاف اور ان کا انجام بیان ہوا ہے۔ انسانوں کا دوسرا

گروہ وہ ہے، جو ہدایت الٰہی کا ظاہراً بھی انکار کرتے ہیں اور باطناً بھی انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ کسی طور پر ہدایت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، لہٰذا کافر کہلاتے ہیں۔ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے انہیں لوگوں کا حال اور ان کا انجام بیان فرمایا ہے۔ان کا تیسرا گروہ زبان سے تو ہدایت ربانی کا اقرار کرتا ہے۔مگر دل سے تسلیم نہیں کرتا۔ یہ لوگ منافق ہوتے ہیں۔آئندہ تیرہ آیات میں انہی لوگوں کا حال بیان ہوا ہے۔کیونکہ انہوں نے علی الاعلان ہدایت کو قبول نہیں کیا۔اور کفر پر اڑے ہوئے ہیں۔ البتہ منافقین کا گروہ چونکہ زیادہ خطرناک ہے اس لئے اس گروہ کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ان کی مثالیں بھی دی ہیں۔تشبیہات کے ساتھ بھی سمجھایا ہے، کیونکہ منافقین کا یہ گروہ بڑا خطرناک گروہ ہے۔ لَا يُؤْمِنُوْنَ اس سے مراد تمام کفار تو ہو نہیں سکتے، کیونکہ بیشمار کافر دعوت کے نتیجے میں ایمان لائے اور لا رہے ہیں۔اس لیے یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو پچھلی آیات میں مذکور چھ چیزوں کا یا ان میں سے بعض کا انکار کر دیتے ہیں اور ہٹ دھرمی کی اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ اگر یہ حق بھی ہو تو ہم اسے نہیں مانیں گے، جیسے بعض یہود مدینہ (بقرۃ:146) اور ابو جہل اور اس کے ساتھی وغیرہ (انفال:32)۔جب کوئی طے کرلے کہ میں نے ماننا ہی نہیں تو اسے ایمان کیسے نصیب ہوسکتا ہے؟ سوئے ہوئے کو جگایا جاتا ہے، جاگتے ہوئے مدہوش کو کون جگا سکتا ہے؟ اس کے یہ معنی نہیں کہ ڈرانا بالکل فضول ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہر شخص تک پہنچانا فرض ہے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اللہ کے علم میں کون ایمان لانے والا ہے اور کس کی قسمت میں کفر پر اصرار ہے، ہمیں ہر حال میں ڈرانے پر ثواب ملے گا اور نہ ڈرانے پر باز پرس ہوگی۔

ہمزہ تسویہ کسے کہتے ہیں؟

اس لیے فرمایا کہ ڈرانا نہ ڈرانا ان پر برابر ہے، یہ نہیں فرمایا کہ آپ پر برابر ہے، یہاں ہمزہ کا معنیٰ 'کیا' نہیں ہوگا، بلکہ یہ برابری کا مفہوم ادا کر رہا ہے، اسے 'ہمزہ تسویہ' کہتے ہیں۔ہمزہ تسویہ (ء) عربی گرامر میں وہ ہمزہ ہے جو دو باتوں یا کاموں کے درمیان برابری (تساوی) پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، یعنی دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ عموماً "سَوَاءٌ" کے لفظ کے ساتھ آتا ہے،

جیسے ”سَوَاۗءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (ان کے لیے برابر ہے، خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ یہ ڈرانا اور نہ ڈرانا ان کے حق میں برابر تھا، نہ کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے حق میں، کہ آپ ﷺ کو تو بہر حال تبلیغ دین کا اجر حاصل ہوتا معلوم ہوا کہ دعوتِ حق رد کر دی جائے، تو یہ ان لوگوں کی محرومی ہے، جو اس دعوت کو قبول نہ کریں، داعی بہر حال اجر و ثواب کا حقدار ہوگا۔ اس لئے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَاۗءٌ عَلَيْهِمْ : بیشک وہ لوگ جن کی قسمت میں کفر ہے ان کے لئے برابر ہے چونکہ ٹھنڈک کی پہچان گرمی سے، دن کی پہچان رات سے اور اچھائی کی پہچان برائی سے ہوتی ہے اسی لئے اہل ایمان کے بعد کافروں اور منافقوں کے افعال اور ان کے انجام کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ ان کی پہچان بھی واضح ہو جائے اور آدمی کے سامنے تمام راہیں نمایاں ہو جائیں۔

دو باتیں ذہن نشین رکھنے والی

یہاں دو باتیں ذہن نشین رکھیں: (1)......ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا انکار یا تحقیر و استہزاء کرنا کفر ہے اور ضروریاتِ دین، اسلام کے وہ احکام ہیں، جن کو ہر خاص و عام جانتے ہوں، جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی نبوت، نماز، روزے، حج، جنت، دوزخ، قیامت میں اُٹھایا جانا وغیرہا۔ عوام سے مراد وہ مسلمان ہیں جو علماء کے طبقہ میں شمار نہ کئے جاتے ہوں مگر علماء کی صحبت میں بیٹھنے والے ہوں اور علمی مسائل کا ذوق رکھتے ہوں، اس سے وہ لوگ مراد نہیں جو دور دراز جنگلوں پہاڑوں میں رہنے والے ہوں جنہیں صحیح کلمہ پڑھنا بھی نہ آتا ہو کہ ایسے لوگوں کا ضروریاتِ دین سے ناواقف ہونا اِس دینی ضروری کو غیر ضروری نہ کر دے گا، البتہ ایسے لوگوں کے مسلمان ہونے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ وہ ضروریاتِ دین کا انکار کرنے والے نہ ہوں اور یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ اسلام میں جو کچھ ہے حق ہے اور ان سب پر اجمالاً ایمان لائے ہوں۔

(2)......ایمان سے محروم کفار کے بارے میں معلوم ہونے کے باوجود انہیں تبلیغ کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا تا کہ ان پر حجت پوری ہو جائے اور قیامت کے دن ان کے لئے کوئی عذر باقی

نہ رہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :"رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا (النساء: ۱۶۵)(ہم نے)رسول خوشخبری دیتے اور ڈرسناتے (بھیجے) تا کہ رسولوں (کو بھیجنے) کے بعد اللہ کے یہاں لوگوں کے لئے کوئی عذر(باقی) نہ رہے اور اللہ زبردست ہے،حکمت والا ہے۔اور ارشاد فرمایا:" وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَیْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى" (طٰہ: ۱۳۴)اور اگر ہم انہیں رسول کے آنے سے پہلے کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو ضرور کہتے: اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا کہ ہم ذلیل ورسوا ہونے سے پہلے تیری آیتوں کی پیروی کرتے؟ نیز انہیں تبلیغ کرنے سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوا کہ وہ اگرچہ ایمان نہیں لائے لیکن حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو انہیں تبلیغ کرنے کا ثواب ضرور ملے گا اور یہ بات ہر مبلغ کو پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اس کا کام تبلیغ کرنا اور رضائے الٰہی پانا ہے،لوگوں کو سیدھی راہ پر لا کر ہی چھوڑنا نہیں لہٰذا مبلغ نیکی کی دعوت دیتا رہے اور نتائج اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے اور لوگوں کے نیکی کی دعوت قبول نہ کرنے سے مایوس ہونے کی بجائے اس ثواب پر نظر رکھے جو نیکی کی دعوت دینے کی صورت میں اسے آخرت میں ملنے والا ہے۔

دلوں پر مُہر کیسے لگتی ہے؟

خَتَمَ اللّٰهُ	مہر لگا دی ہے اللہ نے	عَلٰى قُلُوْبِهِمْ	ان کے دلوں پر
وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ	اور ان کے کانوں پر	وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ	اور ان کی آنکھوں پر
غِشَاوَةٌ	پردہ (ہے)	وَّ لَهُمْ	اور ان کیلئے
عَذَابٌ	عذاب ہے	عَظِیْمٌ (7)	بہت بڑا۔

مہر کیسے کافروں کو لگتی ہے؟ اللہ تعالیٰ مہر صرف ان کافروں کے دلوں پر لگاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو خوب سمجھ لینے کے بعد محض اپنی ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے ٹھکرا دیتے ہیں۔جیسے ایک دوسرے مقام پر فرمایا: آیت وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا

وَّعُلُوًّا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ اوران لوگوں نے ہٹ دھرمی اور تکبر کی بنا پر (ان حقائق کا) انکار کر دیا جن پر ان کے دل یقین کر چکے تھے اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا: آیت (كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ جس بات کو پہلے ایک دفعہ جھٹلا چکے تھے اس پر ایمان لانے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ان کے کفر اور اعمال بد کے نتیجے میں ان کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں اور قبول حق کی استعداد جو فطرتاً ہر شخص میں رکھی گئی ہے، ان سے چھن چکی ہے۔ یہ مہر اگرچہ اللہ تعالیٰ نے لگائی ہے، مگر اس کا باعث ان کا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے اندر حق کو قبول کرنے کی فطری استعداد رکھی ہے؛ لیکن جب آدمی عناد کے جذبہ سے کسی بات کے نہ ماننے پر بہ ضد ہو جاتا ہے تو اس کی یہ استعداد آہستہ آہستہ ختم ہوتی جاتی ہے، اب دل میں حقائق کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی ، کان موجود ہیں ؛ لیکن کان سے دلوں کا فاصلہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ سنی اَن سنی ہو جاتی ہے، آنکھیں موجود ہیں ؛ لیکن وہ خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر خدا تک پہنچنے سے قاصر ہیں، اسی کیفیت کا اس آیت میں ذکر ہے، ایسا نہیں ہے کہ خدا کے مہر لگانے کی وجہ سے وہ کفر پر بہ ضد ہیں ؛ بلکہ جانتے بوجھتے ان کے انکار و عناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے اور ان کو بے توفیق اور محروم کر دیا ہے، گویا ان کا انکار و عناد سبب ہے اور بے توفیقی اس کا نتیجہ۔ دل کا کام بات کو سمجھنا اور کان کا کام سننا ہے اور یہ دونوں اعضاء کسی مخصوص جانب کے پابند نہیں۔ لیکن آنکھ صرف سامنے سے ہی دیکھ سکتی ہے۔ لہٰذا دلوں اور کانوں پر تو مہر کا ذکر کیا گیا اور آنکھ پر صرف پردے کا۔ ایسے لوگ حقائق کو سمجھنے کے لیے کیا تیار ہوں گے جنہیں ان کا سننا اور دیکھنا بھی گوارا نہ ہو۔ کیونکہ کان اور آنکھ ہی تو دل کے دو بڑے دروازے ہیں جن سے دل کو ہر طرح کی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ مہر کیوں اور کب لگتی ہے؟ انسان کو اللہ تعالیٰ نے آنکھیں، کان اور دل اس لیے نہیں دیئے تھے کہ وہ ان اعضاء سے صرف اتنا ہی کام لے جتنا دوسرے حیوان لیتے ہیں اور جانوروں کی طرح صرف اپنے کھانے پینے اور دنیاوی مفادات پر ہی نظر رکھے۔ کیونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے فہم و دانش کی دوسرے جانوروں سے بہت زیادہ قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ انسان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابیں نازل فرمائیں جو انسان کی توجہ کو کائنات میں ہر سو

اللہ تعالیٰ کی بکھری ہوئی نشانیوں کی طرف مبذول کرتی ہیں۔تاکہ انسان ان سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے۔پھر اگر انسان کانوں سے قرآن کی آیات کو سننا تک گوارا نہ کرے اور کائنات میں بکھری ہوئی آیات کو آنکھوں سے دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کرے تو اس کی ہدایت کی کوئی صورت باقی رہ جاتی ہے؟ اور اس سے بھی بدتر صورت حال ان لوگوں کی ہے جو اللہ کی آیات سن بھی لیتے ہیں اور ان کے دل انہیں سمجھ بھی لیتے ہیں، لیکن وہ اپنی چودھراہٹوں یا بعض دوسرے دنیوی مفادات کی خاطر حق کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، بلکہ الٹا مخالفت اور تعصب پر اتر آتے ہیں تو ایسے لوگوں کی آئندہ ہدایت پانے کی بھی کوئی صورت باقی نہیں رہ جاتی اور اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے دلوں اور کانوں پر مہر لگانے اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے سے تعبیر فرمایا ہے اور اسی بات کی تائید درج ذیل مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے۔

دل پر سیاہ نقطے

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔پھر اگر وہ گناہ چھوڑ دے اور استغفار کرے اور توبہ کرے تو اس کا دل صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر دوبارہ کرے تو نقطہ بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ دل پر چھا جاتا ہے اور یہی وہ زنگ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آیت كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔مہر لگانے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیوں؟ رہی یہ بات کہ اگر کافروں کے دلوں اور کانوں پر مہر ان کی اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے لگتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب کیوں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی اللہ ہی کا قانون ہے کہ جن اعضاء یا جن قویٰ سے انسان کام لینا چھوڑ دیتا ہے یا ان کی فراہم کردہ معلومات کو پس پشت ڈال دیتا ہے تو ان اعضاء اور قویٰ کی استعداد از خود زوال پذیر ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔مثلاً انسان اگر اپنے بازو سے کچھ مدت کوئی کام نہ لے اور اسے حرکت تک نہ دے تو وہ از خود شل ہو جائے گا، اس میں حرکت کرنے کی استعداد باقی ہی نہیں رہے گی اور یہ قانون بھی چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کا بنایا ہوا ہے۔لہٰذا اس فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف درست ہوئی۔اگرچہ یہ انسان کے اپنے ہی

شامت اعمال کے نتیجہ میں واقع ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس رکوع میں قرآن کی عظمت اور اس کی ہدایت کو بیان کیا ہے۔پھر متقین کی صفات بیان کی گئیں: وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔مزید فرمایا کہ وہ ان سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں جو اللہ نے نبی اکرم ﷺ پر اور پچھلے انبیاء پر نازل کیں، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔اس رکوع میں بنیادی طور پر ایمان، نماز، انفاق، اور آخرت پر یقین کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ حقیقی کامیابی انہی صفات کے حامل لوگوں کے لیے ہے ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے اعتبار سے انسانوں کے دوسرے گروہ یعنی کفار کا ذکر کیا ہے۔پہلے گروہ متقین کا بیان ہو چکا ہے۔یہ دوسرے گروہ کا بیان ہے اور تیسرے گروہ منافقین کا تذکرہ اگلے رکوع میں آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ دوسرا گروہ کفار کا ہے۔جو ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکار کرتے ہیں۔اور ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔اللہ تبارک ہمیں ہدایت یافتہ گروہ میں شامل فرمائے۔آمین

منافقین کا گروہ اور اس کی قسمیں/ نفاق دینی بیماری ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ⑧ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ⑨ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ ۙ
فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ⑩ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ لَا
تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪ اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ
لَّا یَشْعُرُوْنَ ⑫

منافقوں کا حال اور منافقین کی قسمیں

وَمِنَ النَّاسِ	اور لوگوں میں سے	مَنْ یَّقُوْلُ	جو وہ کہتا ہے
اٰمَنَّا	ہم ایمان لائے	بِاللّٰہِ	اللہ پر
وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ	اور آخرت کے دن پر	وَمَا ھُمْ	حالانکہ نہیں وہ سب
بِمُؤْمِنِیْنَ (8)		ایمان لانے والے۔	

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ: اور کچھ لوگ کہتے ہیں۔ اس سے پہلی آیات میں مخلص ایمان والوں کا ذکر کیا گیا جن کا ظاہر و باطن درست اور سلامت تھا، پھر ان کافروں کا ذکر کیا گیا جو سرکشی اور عناد پر قائم تھے اور اب یہاں سے لے کر آیت نمبر 20 تک منافقوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے جو کہ

اندرونِ خانہ کافر تھے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے۔اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ اپنی زبانوں سے اس طرح کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں کیونکہ ان کا ظاہر ان کے باطن کے خلاف ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ منافق ہیں۔(روح البیان،البقرۃ،تحت الآیۃ:۸، ۱/ ۵۱)

اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں:(1)......جب تک دل میں تصدیق نہ ہو اس وقت تک ظاہری اعمال مؤمن ہونے کے لیے کافی نہیں۔(2)......جو لوگ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور کفر کا اعتقاد رکھتے ہیں سب منافقین ہیں۔(3)...... یہ اسلام اور مسلمانوں کیلئے کھلے کافروں سے زیادہ نقصان دہ ہیں۔منافق کی کئی قسمیں ہیں۔پہلی قسم کا منافق وہ ہے جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے مگر باطن میں کفر بھرا ہوا ہے۔اور وہ اس پر مطمئن ہے۔دوسری قسم کا منافق وہ ہے جو ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے متذبذب ہوتا ہے۔وہ ظاہراً اور باطناً شک میں ہوتا ہے ایسا منافق مُّذَبۡذَبِیۡنَ بَیۡنَ ذٰلِکَ درمیان میں ڈگمگارہے ہیں۔یعنی منافقین کفر اور ایمان کے درمیان ڈگمگا رہے ہیں کیونکہ نہ تو یہ حقیقی طور پر مومن اور مخلص ایمان والوں کے ساتھ ہیں اور نہ واضح طور پر کافر اور صریح شرک کرنے والوں کے ساتھ ہیں اور اے حبیب !صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ،آپ ان منافقین کے راہِ راست پر آنے کی امید نہ رکھیں کیونکہ جسے ہدایت و توفیق کی لیاقت نہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو آپ اس کے لئے کوئی ایسا راستہ نہ پائیں گے جس پر چل کر وہ حق تک پہنچ سکے۔(خازن)ایسا منافق مُّذَبۡذَبِیۡنَ بَیۡنَ ذٰلِکَ کا مصداق ہوتا ہے ان دونوں قسم کے منافقین کا نفاق شدید ہوتا ہے ان کے اعتقاد فاسد ہوتا ہے۔اور اس مقام پر جن منافقین کا ذکر ہے۔وہ یہی اعتقادی منافق ہیں۔جن کے عقیدے میں کفر بھرا ہوا ہے۔تیسری قسم کا منافق وہ ہے جو اخلاقی اور عملی منافق ہوتا ہے ایسا شخص اپنے گناہوں کی وجہ سے آخرت کے نقصان کو دنیا کے نقصان پر ترجیح دیتا ہے۔اور دنیا کے نفع کو آخرت کے نفع پر ترجیح دیتا ہے۔یہ ایسے منافق ہوتے ہیں کہ اگرچہ ان میں ایمان موجود ہوتا ہے۔مگر یہ لوگ آخرت کو دنیا پر ترجیح نہیں دے سکتے۔

قرآن کریم میں منافقین کا حال مختلف سورتوں میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔بعض سورتیں

صرف منافقین کے نام پر ہیں ۔مثلاً سورہ منافقون ۔اسی طرح نزول کے اعتبار سے آخری سورہ توبہ میں بھی منافقین کی سازشوں سے آگاہ کیا گیا ہے ۔اوران سے خبر دار رہنے کی تلقین کی گئی ہے ۔

ایمان میں منافقت اور عملی منافقت

یُخٰدِعُوْنَ	وہ دھوکہ دینا چاہتے ہیں	اللّٰہَ	اللہ کو	وَالَّذِیْنَ	اور جو (لوگ)
اٰمَنُوْا	ایمان لائے	وَمَا یَخْدَعُوْنَ	حالانکہ وہ نہیں دھوکہ دیتے	اِلَّآ	مگر
اَنْفُسَھُمْ	اپنے آپ کو	وَمَا یَشْعُرُوْنَ(9)	اور نہیں وہ سب شعور رکھتے ۔		

وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر وہ اللہ اور مومنوں سے دغابازی کرنا چاہیں بھی تو ایسا کر نہیں سکتے ۔کیونکہ اللہ تو دلوں کے راز تک جانتا ہے اور ان ارادوں اور حرکات سے مسلمانوں کو اپنے رسول کے ذریعے مطلع کر دیتا ہے ۔اس طرح ان کی دغابازی کا وبال انہیں پر پڑے گا اور وہی ذلیل ورسوا ہوں گے ۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ ظاہر و باطن کا تضاد بہت بڑا عیب ہے ۔یہ منافقت ایمان کے اندر ہو تو سب سے بدتر ہے اور اگر عمل میں ہو تو ایمان میں منافقت سے تو کم تر ہے لیکن فی نفسہ سخت خبیث ہے، جس آدمی کے قول و فعل اور ظاہر و باطن میں تضاد ہوگا تو لوگوں کی نظر میں وہ سخت قابل نفرت ہوگا۔ایمان میں منافقت مخصوص لوگوں میں پائی جاتی ہے جبکہ عملی منافقت ہر سطح کے لوگوں میں پائی جا سکتی ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ: وہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ دھوکا تو وہاں دیا جا سکتا ہے ۔جہاں کوئی حالات سے ناواقف ہو ۔اللہ تعالیٰ تو علیم کل ہے اسے دھوکا کیسے دیا جا سکتا ہے ۔اس اشکال کے متعلق امام بیضاوی (رحمہ اللہ) اور دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کو دھوکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ زبان سے کہتے ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں آپ کے پیروکار اور فدائی ہیں، مگر قلب کفر سے بھرپور ہے ۔ایمان کی مقدار ایک رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے ۔اور ویسے محاورے کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جو اہل اللہ کو دھوکا دیتے ہیں ۔وہ گویا خدا تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں مقصد یہ کہ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں ۔قرآن پاک میں اس کی مثال موجود ہے "اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ" یعنی اے

پیغمبر! جولوگ آپ کے دست مبارک پر بیعت کرتے ہیں، وہ گویا اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا“

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ کیونکہ رسول خدا کا نائب اور اس کا پیغام مخلوق تک پہنچانے والا ہوتا ہے۔ اور وہ تمام امور اس کی رضا کے لیے انجام دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ کو دھوکا دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کے رسول کو دھوکا دیتے ہیں۔

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہ جس نے رسول کا حکم مانا بیشک اس نے اللہ کا حکم مانا۔} آیتِ مبارکہ کا شانِ نزول کچھ اس طرح ہے کہ سرورِ کائنات صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ایک مرتبہ فرمایا: جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی اطاعت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی اُس نے اللہ عَزَّ وَجَلَّ سے محبت کی، اِس پر آج کل کے گستاخ بد دینوں کی طرح اُس زمانہ کے بعض منافقوں نے کہا کہ محمد مصطفٰی صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ یہ چاہتے ہیں کہ ہم انہیں رب مان لیں جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو رب مانا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کے رد میں یہ آیت نازل فرما کر اپنے نبی صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے کلام کی تصدیق فرما دی کہ بے شک رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ (بغوی، النساء، تحت الآیۃ: ۸۰، ۱/ ۳۶۲)

تو جس نے ان کی اطاعت سے اِعراض کیا تو اس کا وبال اسی پر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس لئے نہیں بھیجا کہ آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ بہر صورت انہیں جہنم سے بچائیں بلکہ صرف تبلیغ کیلئے بھیجا ہے۔

نفاق کی بیماری سے بیشمار مزید نفسیاتی بیماریاں

فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ	ان کے دلوں میں	مَّرَضٌ	بیماری (ہے)
فَزَادَھُمُ	پس زیادہ کر دیا انہیں	اللّٰہُ	اللہ نے

اوران کیلئے	وَلَهُمْ	بیماری میں	مَرَضًا
دردناک	اَلِيْمٌ	عذاب ہے	عَذَابٌ

وہ جھوٹ بولتے ۔	يَكْذِبُوْنَ(10)	سب تھے	كَانُوْا	اس وجہ سے جو	بِمَا

مرض سے مراد نفاق، دین اسلام سے نفرت اور مسلمانوں سے حسد اور عناد ہے ۔ پھر جوں جوں اسلام اور اہل اسلام کی شوکت بڑھتی گئی، ان کی بیماری میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اس بیماری سے بیشمار نفسیاتی بیماریاں مزید پیدا ہوتی اور بڑھتی چلی جاتی ہیں، مثلاً جھوٹ، خیانت، وعدہ خلافی، بد عہدی، بدزبانی جنھیں رسول اللہ ﷺ نے منافق کی نشانیاں قرار دیا ہے ۔ اسی طرح فساد، خود پسندی، بے وقوفی، دورخی جن کا ذکر آئندہ آیات میں ہے اور بہت سی دیگر بیماریاں مثلاً بزدلی، طمع، بخل، جہاد سے فرار وغیرہ جن کا ذکر سورہ توبہ اور دیگر سورتوں میں ہے ۔ نفاق کی بیماری جسمانی بیماری نہیں بلکہ دین کی بیماری ہے ۔ جس طرح اجسام کی بیماریاں ہوتی ہیں، اسی طرح دین اور عقیدے کی بھی بیماریاں ہوتی ہیں ۔ تو اس بیماری سے مراد عقیدے کی بیماری ہے ۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اعتدال کی حالت سے نکل جاتا ہے ۔ وہ بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ جسم کے مختلف عناصر اور اجزاء جب تک اعتدال پر قائم رہیں انسان کی صحت درست رہتی ہے ۔ اور جب یہ اعتدال خراب ہو جائے تو جسم بیمار ہو جاتا ہے ۔ عقیدے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے ۔ جب آدمی اعتدال کا راستہ چھوڑ دیتا ہے ۔ تو پھر بدعقیدگی، حسد، کینہ، اور گناہوں کے ساتھ محبت کا راستہ کھل جاتا ہے ۔ اور یہی وہ چیز ہے جو انسانوں کو فضیلت کی باتوں سے روکتی ہے ۔ اور ابدی اور حقیقی زوال کا باعث بنتی ہے اسی لئے عربی زبان میں مرض کا لفظ نفاق پر بھی بولا جاتا ہے ۔ کینے اور حسد کو بھی نفاق کہتے ہیں نفاق کا کام یہ ہے کہ خیر کو ظاہر کرتا ہے اور شر کو چھپاتا ہے ۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اچھائی کا کام کر رہا ہے ۔ مگر باطن میں فتنہ پوشیدہ ہوتا ہے ۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے دل کی بیماریوں کا پتہ چلتا ہے ۔ "فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ" ان کے دلوں میں بھی بیماری ہوتی ہے ۔ اور یہ بیماری خون صفرا وغیرہ کی

ظاہری بیماری نہیں ہوتی جو ظاہری جراثیم سے پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے محرک باطنی جراثیم یعنی گناہ ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑے گناہ شرک، کفر، نفاق، شک، تردد اور الحاد وغیرہ ہیں۔ اور ان سے پیدا ہونے والی روحانی بیماریاں ہوتی ہیں۔

منافقین کے دو بڑے عیوب

وَاِذَا	اور جب	قِيْلَ	کہا جائے	لَهُمْ	ان سے
لَا تُفْسِدُوْا	مت تم فساد کرو	فِی الْاَرْضِ	زمین میں		
قَالُوْٓا	وہ کہتے ہیں	اِنَّمَا نَحْنُ	درحقیقت ہم		
مُصْلِحُوْنَ(11)	اصلاح کرنے والے ہیں۔				

یہاں منافقین کے دو عیوب بیان ہوئے ہیں، فساد یعنی زمین میں بگاڑ پیدا کرنا۔ اس میں اللہ کی ہر نافرمانی شامل ہے، کیونکہ اس سے زمین میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، فرمایا: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِی النَّاسِ [الروم: 41] ”خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا، اس کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا۔“ دوسرا عیب بگاڑ پیدا کرنے کو عین اصلاح قرار دینا۔ یہ لوگ دل میں کفر رکھنے کی وجہ سے کفار سے دوستی رکھتے تھے، مسلمانوں کے راز انہیں بتاتے اور اسلام کے عقائد و احکام پر اعتراض کرتے تھے اور منع کرنے پر اپنے اس عمل بد کو اصلاح کا نام دیتے تھے۔ لَا يَشْعُرُوْنَ دل بیمار ہو تو اچھے برے کا شعور بھی ختم ہو جاتا ہے، پھر آدمی اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، فرمایا: اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا [فاطر: 8] ”تو کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل مزین کر دیا گیا تو اس نے اس کو اچھا سمجھا (اس شخص کی طرح ہے جو ایسا نہیں؟)“

ان کا فساد یہ تھا کہ ان کی دلی ہمدردیاں تو کافروں سے تھیں اور مسلمانوں میں شامل رہ کر ان کے حالات سے انہیں باخبر رکھتے اور ان کے لیے جاسوسی کے فرائض سر انجام دیتے تھے۔ نئے اور ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو حیلوں بہانوں سے برگشتہ کرتے تھے اور جنگ کی صورت میں مسلمانوں

کونقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔فساد اور اصلاح متضاد چیزیں ہیں۔اعتدال کی حالت کو اصلاح اور اعتدال سے خروج کو فساد کہتے ہیں۔لڑائی بھڑکانا،فتنہ برپا کرنا،کافروں سے دوستی،مسلمانوں سے دھوکا۔ان کے رازوں کا افشاء گناہوں کا اظہار،دین کی اہانت،قوانین شریعت کی خلاف ورزی یہ سب فساد فی الارض کے کام ہیں ان لوگوں کے نزدیک فلاح اور اصلاح ہے یہ لوگ نظام حق کو بگاڑتے ہیں۔عبادت الٰہی کی بجائے کفروشرک کے مرتکب ہوتے ہیں۔غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔یہی فساد ہے۔

عقیدہ وعمل کے تمام بگاڑ کی جڑ

عقیدہ وعمل کے تمام بگاڑ کی جڑ کفروشرک ہے اور یہ کفر پر ڈٹے ہوئے تھے اور اسلام،پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کے تئیں نت نئی سازشیں مرتب کرتے رہتے تھے،اسی کو زمین میں فساد و بگاڑ پیدا کرنا فرمایا گیا ہے،ہر زمانہ میں مفسدین کا یہی شیوہ رہا ہے کہ وہ فساد پیدا کرتے ہیں اور اس کو نام اصلاح کا دیتے ہیں،مسلمانوں کی تاریخ میں بھی عقیدہ وعمل کے بگاڑ کی جتنی تحریکیں اٹھیں، انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا،منافقین کے اس تذکرہ میں تنبیہ ہے کہ ہر شخص جو اصلاح کا دعویٰ کرے،اس کی بات کو پَرکھے اور کَسے بغیر قبول نہ کر لینا چاہئے،کہ ہر چمکنے والی چیز ہیرا نہیں ہوتی۔

اصل فسادی

اَلَآ	خبردار!	اِنَّھُمۡ	بیشک وہ	ھُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ	ہی فساد کرنے والے ہیں
وَلٰکِنۡ		اور لیکن	لَّا یَشۡعُرُوۡنَ(12)		نہیں وہ شعور رکھتے ہیں۔

یعنی اس لگائی بجھائی اور ان کی حرکات وسکنات سے کافروں کا بھی ان سے اعتماد اٹھ جائے گا اور ان کی حیثیت دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا کے مصداق ہوجائے گی تو انہیں معلوم ہوجائے گا کہ ان کے اعمال سراسر فتنہ وفساد پر مشتمل تھے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے واضح کردیا" اَلَآ اِنَّھُمۡ ھُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ "اصل فسادی یہی ہیں۔جو زبان سے اسلام کا نام لیتے ہیں" وَلٰکِنۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ مگر یہ لوگ سمجھتے نہیں ان کا نفاق ظاہر ہوچکا ہے اور فساد ثابت ہوگیا ہے۔غور سے دیکھا جائے تو آج

کل کی حکومتیں بھی اسی نفاق کا شکار ہیں ۔ یہ بھی حق و باطل کو یکجا کرنے کی کوشش کرتی ہیں ۔ حالانکہ یہ ممکن نہیں ۔خود ہماری حکومت کا کیا حال ہے ۔اسلام کا نام بھی لیا جارہا ہے ۔اور یورپ کے غیر اسلامی پروگرام بھی ساتھ چل رہے ہیں انگریز کا قانون بھی رائج ہے اس سے فساد فی الارض کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔اسی طرح اسلام کے نظام تعلیم اور انگریزی تعلیم کو یکجا چلانے کی کوشش کی جارہی ہے جب تک تمام باطل نظاموں کو ختم کر کے صرف اسلامی نظام کو قائم نہیں کریں گے ۔کبھی فلاح حاصل نہیں ہوسکتی ۔منافقوں کے طرزِ عمل سے یہ بھی واضح ہوا کہ عام فسادیوں سے بڑے فسادی وہ ہیں جو فساد پھیلائیں اور اسے اصلاح کا نام دیں ۔ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اصلاح کے نام پر فساد پھیلاتے ہیں اور بدترین کاموں کو اچھے ناموں سے تعبیر کرتے ہیں ۔ آزادی کے نام پر بے حیائی ،فن کے نام پر حرام افعال ،انسانیت کے نام پر اسلام کو مٹانا اور تہذیب وتمدّن کا نام لے کر اسلام پر اعتراض کرنا ،قرآن کا نام لے کر حدیث کا انکار کرنا وغیرہا سب فساد کی صورتیں ہیں ۔اللہ تبارک وتعالیٰ بیان کردہ منافقت کی تینوں قسموں سے ہماری حفاظت فرمائے ۔آمین

صحابہ معیارِ حق/صحابہ کرام اور علماء دین کا مذاق اڑانے کا حکم/بے دینوں کی فریب کاریوں سے ہوشیار رہا جائے

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ
هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ⑬ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى
شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ
فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑮

النَّاسُ سے مراد

وَاِذَا	اور جب	قِيْلَ	کہا جائے	لَهُمْ	ان سے						
اٰمِنُوْا	تم ایمان لاؤ	كَمَآ	جس طرح	اٰمَنَ	ایمان لائے	النَّاسُ	لوگ				

"النَّاسُ" سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں جو خلوص دل سے ایمان لائے اور ایک ہی طرف کے ہو گئے اور اپنے کسی دنیوی نقصان کی پروا نہ کی، منافقین نے انھیں بیوقوف کہا اور اپنے آپ کو عقل مند، کیونکہ اپنے خیال میں انھوں نے دونوں طرف سے فائدہ اٹھایا اور اپنی دنیا کا نقصان نہ ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین ہی کو بیوقوف قرار دیا، کیونکہ ان کا نہ مسلمانوں کے ہاں کچھ

اعتبار رہا نہ کفار کے ہاں اور وہ چند روزہ زندگی کے فائدے کے لیے ہمیشہ کی زندگی کا نقصان کر بیٹھے۔ فرمایا یہ ایسے بیوقوف ہیں جنھیں اپنی بے وقوفی کا بھی علم نہیں۔ اس آیت سے صحابہ کرامؓ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کہ منافقین کو ان کے ایمان جیسا ایمان لانے کا حکم دیا گیا۔

جدید، قدیم منافقین کی تردید

قَالُوْٓا	وہ کہتے ہیں	اَنُؤْمِنُ	کیا ہم ایمان لائیں	كَمَآ	جس طرح
اٰمَنَ السُّفَهَآءُ	ایمان لائے بے وقوف	اَلَآ	خبردار	اِنَّهُمْ	بیشک
هُمُ السُّفَهَآءُ	وہی بے وقوف ہیں	وَلٰكِنْ		اور لیکن	
لَّا يَعْلَمُوْنَ(13)		نہیں وہ جانتے۔			

ان منافقین نے ان صحابہ (رضي الله عنهم) کو "بے وقوف" کہا، جنہوں نے اللہ کی راہ میں جان و مال کی کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور آج کے منافقین یہ باور کراتے ہیں کہ نعوذ باللہ صحابہ کرام (رضي الله عنهم) دولت ایمان ہی سے محروم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جدید و قدیم دونوں منافقین کی تردید فرمائی۔ فرمایا کسی اعلیٰ تر مقصد کے لئے دنیوی مفادات کو قربان کر دینا، بے وقوفی نہیں، عین عقل مندی اور سعادت ہے۔ صحابہ (رضي الله عنهم) نے اسی سعادت مندی کا ثبوت مہیا کیا ہے، اس لئے وہ پکے مومن ہی نہیں، بلکہ ایمان کے لئے ایک معیار اور کسوٹی ہیں، اب ایمان ان ہی کا معتبر ہوگا جو صحابہ کرام (رضي الله عنهم) ہی کی طرح ایمان لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ، حالانکہ ایمان کا دعوے تو وہ پہلے ہی کر رہے ہیں تو ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ محض زبانی طور پر ایمان نہ لاؤ بلکہ حقیقی اور صحیح ایمان لاؤ، جیسے دوسرے مسلمان ایمان لائے ہیں کیونکہ فلاح کا دار و مدار اسی ایمان پر ہے۔ لذات فانیہ، شہوات نفسانیہ، ریا کاری، طلب جاہ وغیرہ حقیقی ایمان کی بدولت ہی دفع ہوتی ہیں، کسی باطل مقصد کے لیے خالی ایمان کا اظہار ہرگز مفید نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ حقیقی ایمان لاؤ۔ یعنی دل کی پوری تصدیق اور اخلاص کے ساتھ ایمان کو قبول کرو۔ دوسرے مقام پر آتا ہے "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا" اے ایمان والو! ایمان لاؤ یعنی محض

زبانی کلامی ایمان کافی نہیں بلکہ حقیقی اور مخلصانہ ایمان اختیار کرو۔

ایمان پر ثابت قدم رہو

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو۔} یہاں اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا ''اٰمِنُوْا'' ''ایمان لاؤ'' اگر یہ خطاب حقیقی مسلمانوں کو ہے تو اس کا معنیٰ ہو گا کہ ایمان پر ثابت قدم رہو۔ اور اگر یہ خطاب یہود و نصاریٰ سے ہو تو معنیٰ یہ ہوں گے کہ اے بعض کتابوں اور بعض رسولوں پر ایمان لانے والو! تم مکمل ایمان لاؤ یعنی تمام کتابوں اور تمام رسولوں پر جن میں قرآن اور محمد مصطفٰی صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ بھی داخل ہیں۔ اور اگر یہ خطاب منافقین سے ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اے ایمان کا ظاہری دعویٰ کرنے والو! اخلاص کے ساتھ ایمان لے آؤ۔ یہاں جو فرمایا گیا کہ رسول اور کتاب پر ایمان لاؤ تو رسول سے سیدُ الانبیاء صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اور کتاب سے قرآنِ پاک مراد ہے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ اہلِ ایمان کا لفظ حقیقی معنیٰ کے اعتبار سے موجودہ زمانے میں صرف مسلمانوں پر بولا جا سکتا ہے، کسی اور مذہب والے پر خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی اس لفظ کو نہیں بول سکتے۔ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ تم اللہ عَزَّ وَجَلَّ پر اور اس کے رسول، محمد مصطفٰی صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ پر اور قرآن پر اور اس سے پہلی ہر کتاب اور رسول پر ایمان لاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے مگر عمل صرف قرآن شریف پر ہی ہو گا۔ ان کتابوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ یہ اللہ عَزَّ وَجَلَّ کی بھیجی ہوئی کتابیں ہیں۔

امت کے لیے نمونہ

اسی سورہ بقرہ میں آگے چل کر یہودیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں، فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا '' اگر یہ لوگ بھی تمہاری طرح ایمان لے آئیں تو یہ بھی ہدایت پا جائیں گے یہاں سے معیارِ حق ہونے والی بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم معیارِ حق ہیں یہ اصحاب کیا اگرچہ نبی کی طرح معصوم تو نہیں مگر محفوظ ہیں اور امت کے لیے نمونہ ہیں بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ: تمہارے ایمان کی

طرح۔ یہودیوں کو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرح ایمان لانے کا فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ایمان بارگاہِ الٰہی میں معتبر اور دوسروں کیلئے مثال ہے۔

معیارِ حق سے مُراد

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اپنے اخلاص اور حقیقی ایمان کی وجہ سے ان خرابیوں سے محفوظ تھے جو ایمان کے باوجود انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں معیارِ حق اسی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر قرآن پاک میں فرمایا ہے: "لِّتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔ شاہ عبد القادر محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں: تا کہ ہو جاؤ تم لوگوں کو بتانے والے اور معلم اور اللہ کا رسول تمہیں بتانے والا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو نمونے کی جماعت تیار کر کے ان سے خدمت اسلام کا کام لیا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق یہ بھی فرمایا خدا کی زمین پر تم اللہ کے گواہ ہو۔ یعنی جس کی اچھائی کی گواہی تم دو گے وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہوگا اور جس کی تم برائی کی گواہی دو گے وہ اللہ کے ہاں برا ہوگا۔ اے صحابہ! تم اللہ کے گواہ ہو اور خصوصاً اے خلفائے راشدین! تم اللہ کے گواہ ہو۔ آپ نے یہ جملہ تین دفعہ فرمایا۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرمایا "یعنی اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق رکھ دیا ہے یعنی وہ حق کے سوا کوئی بات نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کے قلب و زبان پر اللہ تعالیٰ نے حق رکھ دیا ہے۔ کیا وہ معیارِ حق نہ ہوگا؟ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور ان کے ساتھی ایمان لائے ہیں۔ ان کا ایمان حقیقی ایمان ہے جو خلوص سے بھر پور ہے۔ ایسا ہی ایمان انسان کی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

اسلام لانے کے ظاہری فوائد

وَاِذَا	اور جب	لَقُوا	وہ ملتے ہیں	الَّذِيْنَ	(اُن لوگوں سے) جو

اٰمَنُوْا	ایمان لائے	قَالُوْٓا	وہ کہتے ہیں	اٰمَنَّا	ہم ایمان لائے

جو مسلمان سماج میں ذی وجاہت تھے، جیسے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر وغیرہ، ان سے خوشامد میں اپنے پکے مسلمان ہونے کا اظہار کرتے تھے؛ تاکہ اسلام کے ظاہری فوائد سے محروم نہ ہوں۔ یعنی اسلام کے جو ظاہری فوائد ہیں، جان، مال کی حفاظت، مالِ غنیمت میں حصہ داری اور نکاح کا تعلق، وہ ہم مسلمانوں سے حاصل کر رہے ہیں۔

شیاطین سے مراد

وَاِذَا	اور جب	خَلَوْا	اکیلے ہوتے ہیں	اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ	اپنے شیطانوں کے پاس
قَالُوْٓا	وہ کہتے ہیں	اِنَّا	بیشک ہم	مَعَكُمْ	تمہارے ساتھ ہیں
اِنَّمَا	درحقیقت	نَحْنُ	ہم	مُسْتَهْزِءُوْنَ(14)	مذاق کرنے والے ہیں۔

شیاطین سے مراد کفر کے سردار ہیں، خواہ مشرکین و یہود سے ہوں یا خود ان منافقین سے۔ شیطان ہر سرکش اور فسادی شخص کو کہتے ہیں، شیاطین جنوں اور انسانوں دونوں سے ہوتے ہیں، فرمایا: (وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا) [الأنعام: 112] "اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیطانوں کو دشمن بنا دیا، ان کا بعض بعض کی طرف ملمع کی ہوئی بات دھوکا دینے کے لیے دل میں ڈالتا رہتا ہے۔" لفظ شیطان شَطَنَ سے مشتق ہے جس کے معنی بُعد کے ہیں، یعنی وہ جو ہر خیر سے دور ہو۔ شیطان" حق سے دور اور سرکش کو کہا جاتا ہے، خواہ انسان ہو یا جنات، قرآن مجید میں یہ لفظ گرچہ شیاطین جنات کے لئے زیادہ استعمال ہوا ہے؛ لیکن سرکش انسانوں کے لئے بھی اس کا استعمال ہوا ہے، یہاں شیاطین سے منافقین کے سرداراوران کے خاص رفقاءِ مراد ہیں۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا) اس سے ظاہر ہے کہ اہل ایمان سے ان کی ملاقات سرسری ہوتی ہے، کبھی کسی مجلس میں، کبھی سرِ راہ، مگر اپنے شیطانوں کے ساتھ اہتمام کے ساتھ خلوت ہوتی ہے۔ پھر اہل ایمان کو تاکید کے کسی لفظ کے بغیر صرف "اٰمَنَّا" کہتے ہیں اور اپنے شیاطین کو "اِنَّا"

اور"اِنَّمَا" کی تاکید کے ساتھ اپنے کفر کی یقین دہانی کراتے ہیں کہ ہم عقیدے میں بلاشک وشبہ تمہارے ساتھی ہیں، رہا ہمارا ایمان کا اقرار واظہار تو وہ محض مذاق ہے۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم اور پیشوایانِ دین کا مذاق اڑانا منافقوں کا کام ہے۔آج کل بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی مجلسوں اور مخصوص لوگوں میں "علماء وصلحاء" اور "دینداروں" کا مذاق اُڑاتے اور ان پر پھبتیاں کستے ہیں اور جب ان کے سامنے آتے ہیں تو منافقت سے بھرپور ہو کر خوشامد اور چاپلوسی کرتے ہیں اور تعریفوں کے پل باندھتے ہیں، یونہی ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جنہیں مذہب اور مذہبی نام سے نفرت ہے اور مذہبی حلیہ اور وضع قطع دیکھ کر ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت عطا فرمائے۔ یاد رہے کہ انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اور دین کا مذاق اڑانا کفر ہے، یونہی صحابہ کرام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کی بے ادبی گمراہی ہے، اسی طرح علم کی وجہ سے علماء دین کا مذاق اڑانا کفر ہے ورنہ حرام ہے۔

منافقانہ عمل کی سزا

اَللّٰہُ	اللہ	یَسْتَھْزِئُ	مذاق اڑاتا ہے	بِھِمْ	اُن کا
وَیَمُدُّھُمْ	اور وہ ڈھیل دے رہا ہے اُنہیں	فِیْ طُغْیَانِھِمْ	اپنی سرکشی میں		
یَعْمَھُوْنَ(15)	وہ اندھے ہو کر بھٹک رہے ہیں۔				

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس منافقانہ عمل کی سزا ان کو دے رہے ہیں کہ ان کو ڈھیل دیتے جا رہے ہیں؛ تاکہ وہ حق تک رسائی سے مسلسل محروم رہیں اور سخت سزا کے حقدار ہو جائیں ،قرآن کی بعض آیات میں بعض اوصاف ذمیمہ مثلاً استہزاء مکر اور خدع کی اللہ تعالیٰ کی طرف جو نسبت کی گئی ہے، یہ محض اہل عرب کے محاورہ کی وجہ سے ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن اہل عرب اور بالخصوص قریش کے محاورہ کے مطابق نازل ہوا ہے۔ایسے افعال اللہ تعالیٰ کی طرف کبھی اکیلے منسوب نہیں ہوتے بلکہ کافروں کے افعال کے جواب کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔عرف عام میں ایسی صورت کو مشاکلہ کہتے ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ کی ذات ایسے اوصاف سے پاک ہے۔ایسے عرب

محاوروں کی ایک مثال درج ذیل آیت میں بھی موجود ہے۔

جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا کی تشریح

"جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا" کہ برائی کے بدلہ اسی کے مثل برائی درست ہے' ظاہر ہے کہ برائی کا بدلہ برائی' نہیں ؛ مگر تقابل کے طور پر اس کو بھی 'برائی' کہا گیا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فعل مذاق اُڑانے کی سزا ہے نہ کہ خود مذاق اُڑانا؛ لیکن بہ طورِ محاورہ اس کو بھی 'استہزاء' کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے حالانکہ جو برائی کا بدلہ لے اسے برائی نہیں بلکہ انصاف کہنا زیادہ مناسب ہے۔ لیکن محاوروں میں برائی کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے جواباً مذاق اڑانے سے مراد منافقوں کو ان کے استہزاء کا پورا پورا بدلہ دینا ہے، نہ کہ ان کی طرح کا مذاق اڑانا۔ مگر محاورہ میں استہزاء کا لفظ ہی جواب کے طور پر استعمال ہوگا اور اللہ تعالیٰ ان کے استہزاء کا جواب اس صورت میں دے گا کہ عنقریب ان کے سارے پول کھول دے گا۔ جس سے یہ لوگ دنیا میں ذلیل ورسوا ہوں گے اور آخرت میں عذاب الیم سے دوچار ہوں گے۔ اس طرز کلام کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ منافقین کے تمسخر کا نقصان انہی کی طرف لوٹتا ہے۔ اللہ خود ٹھٹھا نہیں کرتا بلکہ منافقین کے **تمسخر** کا ضرر خود انہی کی طرف جاتا ہے۔ وہ خدا کو کیا ضرر پہنچائیں گے۔ نبی (علیہ السلام) اور مؤمنین کو اللہ تعالیٰ ان کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ مؤمنین کو منافقین کی چالوں سے آگاہ کر دے گا، تاکہ وہ ان کے ضرر سے بچ سکیں اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ کا یہی مطلب ہے۔ استہزاء منجانب اللہ کا ایک اور مطلوب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ جیسا ٹھٹھا مذاق کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہئے۔ چونکہ منافقین محض زبانی دعوے کی بنا پر جماعت المسلمین میں شریک ہوتے ہیں اور مفاد حاصل کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ بھی کہتا ہے۔ اچھا ان کو ایسا کرنے دو۔ وہ نمازیں پڑھیں، صدقہ دیں، جہاد میں شرکت کریں۔ مگر ان کا کوئی عمل قبول نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ دل سے تو ایمان لائے نہیں لہٰذا ان کے ساتھ بھی

وہی سلوک ہوگا جو مذاق کرنے والے کے ساتھ ہونا چاہئے ۔ یہ بھی گویا ان کے ساتھ ایک قسم کا تمسخر ہے ۔منافقین کا مسلمانوں کو بے وقوف کہنا اور کفار سے اظہارِ یکجہتی کرنا اپنی نجی محفلوں میں تھا جبکہ مسلمانوں سے تو وہ یہی کہتے تھے کہ ہم مخلص مومن ہیں، اسی طرح آج کل کے گمراہ لوگ مسلمانوں سے اپنے فاسد خیالات کو چھپاتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کی کتابوں اور تحریروں سے ان کے راز فاش کر دیتا ہے ۔بے دینوں کی فریب کاریوں سے ہوشیار رہا جائے : یاد رہے کہ اس آیت سے مسلمانوں کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ وہ بے دینوں کی فریب کاریوں سے ہوشیار رہیں اور ان کی چکنی چپڑی باتوں سے دھوکا نہ کھائیں ۔

ہدایت کے بدلے گمراہی/ اعتقادی اور عملی منافق

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ
اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ⑯ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ
الَّذِی اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّاۤ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِیْ ظُلُمٰتٍ
لَّا یُبْصِرُوْنَ ⑰ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ⑱ اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ
وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ
مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ⑲ یَكَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ ۙۗ وَاِذَاۤ
اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
شَیْءٍ قَدِیْرٌ ⑳

سراسر گھاٹے والی تجارت

اُولٰٓئِكَ		یہ (وہ لوگ ہیں)	الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا		جنہوں نے خرید لیا
الضَّلٰلَةَ		گمراہی کو	بِالْهُدٰى		ہدایت کے بدلے میں
فَمَا	پس نہ	رَبِحَتْ	فائدہ پہنچایا	تِّجَارَتُهُمْ	اُن کی تجارت نے
وَمَا	اور نہ	كَانُوْا	وہ سب تھے	مُهْتَدِیْنَ (16)	ہدایت پانے والے

فرمایا "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى " یہی وہ لوگ ہیں یہاں تجارت سے مراد ہدایت چھوڑ کر گمراہی اختیار کرنا ہے۔ جو سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ منافقین نے نفاق کا جامہ پہن کر ہی گھاٹے والی تجارت کی۔ لیکن یہ گھاٹا آخرت کا گھاٹا ہے ضروری نہیں کہ دنیا ہی میں اس گھاٹے کا انہیں علم ہو جائے۔ بلکہ دنیا میں تو اس نفاق کے ذریعے سے انہیں جو فوری فائدے حاصل ہوتے تھے، اس پر وہ بڑے خوش ہوتے اور اس کی بنیاد پر اپنے آپ کو بہت دانا اور مسلمانوں کو عقل فہم سے عاری سمجھتے تھے۔ مگر افسوس کہ اس ہدایت کو چھوڑ کر انہوں نے باطن کی بدعقیدگی اور گمراہی کو اختیار کیا "فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ " پس ان کی تجارت نے ان کو کوئی فائدہ نہ دیا "وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ " اور نہیں تھے وہ ہدایت یافتہ۔ یہ تجارت کا لفظ بھی بڑا معنی خیز ہے۔

ابدی خسارے میں مبتلا لوگ

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ جب انسان کو دنیا میں بھیجتا ہے۔ تو عمر اور تمام اسباب دیکر بھیجتا ہے کہ یہ تمہاری پونجی ہے اس کے ساتھ اعمال خریدو اس سے تمہیں آخرت کی دائمی زندگی میں فائدہ پہنچے گا۔ عمر کی یہ پونجی برف کی مانند ہے۔ اوپر سے بھادوں کی تپش پڑ رہی ہے۔ اور یہ برف پگھلتی جا رہی ہے۔ اگر اس کے پگھلنے سے پہلے اس سے قیمتی اشیاء ایمان اور اعمال صالحہ خرید لوگے تو یہ عمر کی پونجی ٹھکانے لگے گی۔ اور تم ہمیشہ کے لیے راحت پاؤ گے۔ اور اگر تم نے عمر عزیز کے بدلے کفر، شرک، بدعقیدگی، معاصی اور لہو ولعب خریدا، تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خسارے میں مبتلا ہو جاؤ گے، اسی لیے فرمایا کہ منافقین کی تجارت نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔ اس کی ایک اور مثال ایسی ہے کہ انسان تریاق کے بدلے زہر ہلاہل خریدے۔ (زہرِ ہلاہل کا مطلب انتہائی شدید، قاتل اور فوری اثر کرنے والا زہر ہے۔ یہ مرکب دو الفاظ 'زہر اور' ہلاہل (یعنی سخت زہر) کا مجموعہ ہے، جو اردو شاعری اور نثر میں ہلاکت خیزی کی انتہا، یا انتہائی خطرناک صورتحال کو بیان کرنے کے لیے بطور محاورہ استعمال ہوتا ہے اگر تریاق حاصل کر لیا تو ہر قسم کی تکلیف سے بچ جائے گا۔ زندگی آسودہ ہو جائے گی۔ اور اگر خدانخواستہ اس نے زہر کو پسند کیا تو تباہ ہو جائے گا۔

اس قسم کی تجارت نے کوئی نفع نہ دیا۔ "وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ" اور یہ لوگ ہدایت یافتہ نہ تھے۔ بلکہ ابدی خسارے میں مبتلا ہوئے۔

تاریکی اور روشنی کی مثال

مَثَلُهُمْ	ان کی مثال	كَمَثَلِ	(اس شخص کی) مثال کی طرح ہے
الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا		جو خوب بھڑکائے آگ	

اسْتَوْقَدَ نَارًا "اَوْقَدَ نَارًا" کے معنی ہیں اس نے آگ جلائی۔ "اسْتَوْقَدَ" میں سین اور تاء زیادہ ہونے سے معنی میں اضافہ ہوگیا، اس لیے اس کا ترجمہ "خوب بھڑکائی" کیا گیا ہے۔

فَلَمَّآ	پس جب	اَضَاءَتْ	اس نے روشن کر دیا	مَا حَوْلَهٗ	جو اس کے ارد گرد ہے
ذَهَبَ اللّٰهُ	لے گیا اللہ	بِنُوْرِهِمْ	اُن کی روشنی کو		
وَتَرَكَهُمْ	اور اس نے چھوڑ دیا اُنہیں	فِيْ ظُلُمٰتٍ	اندھیروں میں		
لَّا يُبْصِرُوْنَ(17)	نہیں وہ دیکھ پاتے ہیں۔				

حضرت عبداللہ بن مسعود (رضي اللہ عنہ) اور دیگر صحابہ (رضي اللہ عنہم) نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے: کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب مدینہ تشریف لائے تو کچھ لوگ مسلمان ہو گئے، لیکن پھر جلد ہی منافق ہو گئے۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اندھیرے میں تھا، اس نے روشنی جلائی جس سے اس کا ماحول روشن ہوگیا اور مفید اور نقصان دہ چیزیں اس پر واضح ہوگئیں، دفعتاً وہ روشنی بجھ گئی، اور وہ حسب سابق تاریکیوں میں گھر گیا۔ یہی حال منافقین کا تھا۔ پہلے وہ شرک کی تاریکی میں تھے، مسلمان ہوئے تو روشنی میں آ گئے۔ حلال وحرام اور خیر وشر کو پہچان گئے، پھر وہ دوبارہ کفر ونفاق کی طرف لوٹ گئے تو ساری روشنی جاتی رہی۔ (فتح القدیر) تشبیہ کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ایمان لانے کی وجہ سے دنیا میں انھیں مسلمانوں والی عزت حاصل ہوئی، مسلمانوں کے ساتھ ان کے رشتے ناتے رہے، وہ ایک دوسرے کے وارث بنتے رہے، مال غنیمت اور دوسرے بیشمار فوائد حاصل کرتے رہے، مگر جب فوت ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ عزت چھین لی، جیسے اس آگ والے سے اس کی روشنی چھین

لی اور انھیں بہت سے اندھیروں (یعنی قبر، یوم محشر اور جہنم کے عذاب) میں چھوڑ دیا۔ (طبری عن ابن عباس بسند حسن) مطلب یہ ہے کہ منافقوں کو خود نورِ صداقت دیکھنا گوارا نہیں تو اللہ نے بھی انہیں تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت کے بدلے گمراہی خریدنا یعنی ''ایمان کی بجائے کفر اختیار کرنا'' نہایت خسارے اور گھاٹے کا سودا ہے۔

بہرے، گونگے اور اندھے

صُمٌّۢ	بہرے	بُکۡمٌ	گونگے	عُمۡیٌ	اندھے	فَھُمۡ	پس وہ
لَا یَرۡجِعُوۡنَ(18)				نہیں لوٹیں گے			

صُمٌّۢ بہرے "اَصَمّ" کی جمع ہے۔ بُکۡمٌ (گونگے) "اَبۡکَمۡ" کی جمع ہے اور عُمۡیٌ (اندھے) "اَعۡمٰی" کی جمع ہے۔ ان کے بہرے، گونگے اور اندھے ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے کان، زبانیں یا آنکھیں ہیں ہی نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ انھوں نے یہ سب کچھ رکھنے کے باوجود ان سے فائدہ نہیں اٹھایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَعَلۡنَا لَھُمۡ سَمۡعًا وَّاَبۡصَارًا وَّاَفۡـِٕدَۃً فَمَاۤ اَغۡنٰی عَنۡھُمۡ سَمۡعُھُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُھُمۡ وَلَاۤ اَفۡـِٕدَتُھُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِذۡ کَانُوۡا یَجۡحَدُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللہِ [الأحقاف:26] ''اور ہم نے ان کے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تو نہ ان کے کان ان کے کسی کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔'' فَھُمۡ لَا یَرۡجِعُوۡنَ کہ اب ان کے نیکی کی طرف واپس پلٹ آنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ یعنی وہ اس گمراہی سے جو خرید بیٹھے اور اس ہدایت کی طرف جسے فروخت کر بیٹھے واپس نہیں لوٹتے۔ جو شخص مرگیا اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ کہ واپس آ کر کوئی نئی کمائی کرلے گا۔ انسان جو اعمال دنیوی زندگی میں کما گیا۔ ان میں تغیر تبدل نہیں ہوسکے گا۔ دنیا میں تو کئی چیزیں منسوخ بھی کر دی جاتی ہیں۔ مگر آخرت میں پہنچ کر دنیا میں کیے گئے اعمال میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکے گا۔ ان آیات میں ان منافقین کا ذکر ہے جو زبان سے مومن اور دل میں پکے کافر تھے۔ اسلام کے بارے میں تمام منافقین کی سوچ یکساں نہ تھی، بعض تو قبولِ حق کے لئے

بالکل ہی تیار نہ تھے، گویا ان کے کان تھے؛لیکن حق کو قبول کرنے سے محروم اور بہرے، زبان تھی؛ لیکن حق کے اقرار و اعتراف سے عاجز، آنکھیں تھیں؛لیکن حق کے ادراک کی صلاحیت سے قاصر، یہ کفر میں زیادہ سخت تھے اور یہ مثال ان ہی لوگوں کی ہے، کہ نبوت کا نور ان کے سامنے دوپہر کے آفتاب کی طرح روشن تھا؛ مگر انھوں نے اپنے آپ کو اس کی روشنی سے محروم رکھا تھا۔یعنی ان منافقوں کی حالت یہ ہوگئی کہ یہ حق بات سننے کے لیے بہرے، حق کہنے کے لحاظ سے گونگے ہیں اور حق سامنے موجود ہو تب بھی انہیں نظر نہیں آتا۔

بارش سے مراد/ اندھیروں اور گرج سے مراد

اَوۡ كَصَيِّبٍ	یا بارش کی طرح	مِّنَ السَّمَآءِ	آسمان سے	فِيۡهِ	اس میں
ظُلُمٰتٌ	اندھیرے	وَّرَعۡدٌ	اور گرج	وَّبَرۡقٌ	اور بجلی
يَجۡعَلُوۡنَ	وہ ڈال لیتے ہیں	اَصَابِعَهُمۡ	اپنی انگلیاں		
فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ	اپنے کانوں میں	مِّنَ الصَّوَاعِقِ	کڑکوں (کی وجہ) سے		
حَذَرَ الۡمَوۡتِ ؕ	موت کے ڈر سے	وَاللّٰهُ	اور اللہ		
مُحِيۡطٌۢ	گھیرنے والا ہے	بِالۡكٰفِرِيۡنَ(19)	کافروں کو۔		

بارش سے مراد اسلام ہے، اندھیروں اور گرج سے مراد وہ تکلیفیں اور مصیبتیں ہیں جو اسلام کی راہ میں پیش آتی ہیں، چمک سے مراد مسلمانوں کو حاصل ہونے والی کامیابیاں اور کڑکنے والی بجلیوں سے مراد جہاد کے احکام ہیں، جن میں منافقین کو موت دکھائی دیتی ہے۔ یہ مثال اللہ تعالیٰ نے منافقین کے دوسرے گروہ کی بیان فرمائی ہے،یعنی وہ لوگ جو بظاہر مسلمان تو ہو گئے تھے مگر ضعف ایمان کی وجہ سے ہمیشہ شک اور تذبذب میں مبتلا رہتے تھے، راحت و آرام کی صورت میں مطمئن نظر آتے، جب تکالیف کا سامنا ہوتا تو شک و شبہ میں پڑ جاتے۔: حدیث پاک میں آتا ہے کہ اعتقادی منافق کفر ہی کی ایک قبیل سے ہے۔ بلکہ کفار میں سے بھی بدترین قسم کا کافر ہے۔منافق کی ایک اور قسم عملی منافق ہے۔ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ دل میں نور ایمان موجود

ہے۔اللہ تعالیٰ کی وحدانیت،پیغمبر(علیہ السلام)کی رسالت اورقیامت پرایمان ہے۔

عملی منافق کی نشانیاں

مگرظاہراور باطن میں مطابقت نہیں پائی جاتی۔حضورﷺنےعملی منافق کی بہت سی نشانیاں بتائی ہیں مثلاً وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ ". جب اس کے پاس امانت رکھی جائےتو خیانت کرتا ہے۔" وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ، "جب کسی سے جھگڑا کرتا ہےتو گالی گلوچ پر اتر آتا ہے۔اور" وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، جب وعدہ کرتا ہےتو خلاف ورزی کرتا ہے۔إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، جب بات کرے تو جھوٹ بولے،ایسا شخص اعتقادی نہیں بلکہ عملی منافق ہے۔اللہ تعالیٰ کے عاید کردہ فرائض نماز،روزہ وغیرہ کوفرض سمجھتے ہوئے انہیں بجانہیں لاتا۔ایسے عملی منافقوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔

شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:دین اسلام میں آخرسب نعمت ہے،مگراول کچھ محنت ہے،جیسے بارش کہ آخراسی سے آبادی ہےاوراول کڑک ہےاوربجلی ہے۔منافق لوگ اول سختی سے ڈرجاتے ہیں اوران کو آفت سامنےنظرآتی ہےاورجیسے بادل کی چمک میں کچھ اجالا ہوتا ہےاورکبھی اندھیرا،اسی طرح منافق کے دل میں کبھی اقرارہے کبھی انکار۔

دوسری قسم کے منافقوں کی مثال

يَكَادُ الْبَرْقُ	وہ قریب ہے بجلی	يَخْطَفُ	وہ اچک لے		
أَبْصَارَهُمْ	اُن کی بصارت کو	كُلَّمَآ	جب	أَضَآءَ	روشنی کرتی ہے
لَهُمْ	اُن کے لئے	مَّشَوْا	وہ چل پڑتے ہیں	فِيْهِ	اُس میں
وَإِذَآ	اور جب	أَظْلَمَ	اندھیرا چھا جاتا ہے	عَلَيْهِمْ	اُن پر
قَامُوْا	وہ کھڑے ہو جاتے ہیں	وَلَوْ	اور اگر	شَآءَ اللّٰهُ	چاہے اللہ
لَذَهَبَ	البتہ لے جائے	بِسَمْعِهِمْ	اُن کی سماعت (کو)		
وَأَبْصَارِهِمْ	اور اُن کی بصارت (کو)	إِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ		

عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ	ہر چیز پر	قَدِیۡرٌ (20)	خوب قدرت والا ہے۔

یہ ایک دوسری قسم کے منافقوں کی مثال بیان کی گئی ہے۔ پہلی قسم کے منافق تو وہ تھے جن کے دل میں کفر ہی کفر تھا۔ مگر مفاد پرستی کی خاطر مسلمانوں کے سامنے اسلام کا دعویٰ کرتے تھے، اور یہ دوسری قسم ان منافقوں کی ہے جو شک اور تذبذب کا شکار ہیں۔ اس مثال میں زوردار مینہ سے مراد اسلامی احکامات کا نزول ہے جو پے در پے ہو رہے تھے اور جو جملہ انسانیت کے لیے رحمت ہی رحمت تھے اور اس میں تاریکیوں اور کڑک سے مراد وہ مصائب ومشکلات ہیں جو مسلمانوں کو اقامت دین کے سلسلہ میں پیش آ رہی تھیں اور چمک سے مراد وہ کامیابیاں اور کامرانیاں ہیں جو مسلمانوں کو حاصل ہو رہی تھیں۔ اب جب کوئی کڑک کی آواز یا مصیبت مسلمانوں کو درپیش ہوئی تو یہ منافق اپنی جان بچانے کی خاطر مسلمانوں سے الگ ہو کر حفاظتی اقدامات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اس صورت میں بھی ان کو ہلاک کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے اور مسلمانوں کی کامیابی اور ان کی مسلمانوں سے علیحدگی ہی ان کی موت کا باعث بن سکتی تھی۔ پھر جب معاملہ ذرا سہل ہو جاتا ہے اور مصائب چھٹ جاتے ہیں تو یہ لوگ اسلام کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں اور جب کوئی سخت احکام نازل ہوتے ہیں تو وہیں ٹھٹک کر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو پہلی قسم کے منافقوں کی طرح ان کی بصارت اور سماعت کو بھی سلب کر سکتا تھا۔ مگر اللہ کا قانون ہی یہ ہے کہ جو شخص جس حد تک دیکھنا اور سننا چاہتا ہے۔ اسے اس حد تک سننے اور دیکھنے دیا جائے، اگرچہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس آیت میں اس امر کی تنبیہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ اپنی دی ہوئی صلاحیتوں کو سلب کر لے۔ اس لیے انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے گریزاں اور اس کے عذاب اور مواخذے سے کبھی بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اور وہ اپنا عطا کیا ہوا انعام واپس لے سکتا ہے۔ اس لیے انہیں چاہیے کہ ان ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے ہدایت کا راستہ اختیار کریں تاکہ انہیں فلاح نصیب ہو۔

دلائل توحید وربوبیت تین بڑی اقسام میں/قرآن کا چیلنج اوراس کی معجزانہ حیثیت

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ ۪ وَادْعُوْا شُھَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾

چاراہم اورعمدہ مضامین کا تذکرہ

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ	اے لوگو	اعْبُدُوْا	تم عبادت کرو	رَبَّکُمُ	اپنے رب کی
الَّذِیْ	جس نے	خَلَقَکُمْ	پیدا کیا تمہیں	وَالَّذِیْنَ	اور (اُن لوگوں کو بھی) جو
مِنْ قَبْلِکُمْ	تم سے پہلے تھے	لَعَلَّکُمْ	تا کہ تم	تَتَّقُوْنَ (21)	سب بچ جاؤ

اب تیسرا رکوع شروع ہو رہا ہے۔ یہاں سے تمام انسانوں کو خطاب ہے، اس رکوع میں قرآن کریم کے چار اہم اور عمدہ مضامین کا تذکرہ ہے۔ سب سے پہلے توحید کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی

وحدانیت پر ایمان لائے بغیر نجات کا کوئی راستہ نہیں۔لہٰذا اس کے بغیر جنت کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔قرآن پاک کا دوسرا اہم مضمون رسالت ہے۔نبی ﷺ پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص حد کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔تیسرا مضمون خود قرآن کریم اس کی حقانیت اور اس کا وحی الٰہی ہونا ہے۔جسے قرآن پاک میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت اور راہنمائی کی ضرورت ہے۔اور اس کا واحد ذریعہ وحی الٰہی ہے۔کیونکہ یہاں پر انسانی عقل وشعور کام نہیں کر سکتے۔انسان ہمیشہ علم کی روشنی میں ترقی کرتا ہے اور ذرائع علم میں سب سے اہم، قطعی اور آخری ذریعہ وحی الٰہی ہے۔اس رکوع میں چوتھے اہم مضمون معاد کا ذکر ہے۔قیامت پر ایمان لانا ضروری ہے۔کیونکہ اچھے اور برے نتیجے کا دارومدار روز قیامت پر ہے اس روز تمام چیزیں اپنی اصلی حالت میں ظاہر ہوں گی۔ نیکی اور بدی میں امتیاز ہوگا۔اور انسان اس کے نتیجے میں ذمہ داری سے دو چار ہوگا۔لہٰذا یہ اہم مضمون بھی یہاں بیان ہوا ہے۔اس سے پہلی آیت تک تو تمہید تھی کہ قرآن جو ہدایت کا اصلی سرچشمہ ہے اسے ماننے اور نہ ماننے کے اعتبار سے لوگ تین قسم کے ہیں، اب آگے براہ راست خطاب کے ساتھ تمام لوگوں کے سامنے وہ اصل بات پیش کی جارہی ہے جو اس کتاب کی دعوت کا حقیقی مقصد ہے، جس کے لیے کتابیں اتاری گئیں اور انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے وہ ہے دعوت توحید یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا اور اس کی عبادت اور دعا میں کسی کو شریک نہ کرنا۔عبادت اُس انتہائی تعظیم کا نام ہے جو بندہ اپنی عبدیت یعنی بندہ ہونے اور معبود کی اُلوہیت یعنی معبود ہونے کے اعتقاد اور اعتراف کے ساتھ بجالائے۔ یہاں عبادت توحید اور اس کے علاوہ اپنی تمام قسموں کو شامل ہے۔کافروں کو عبادت کا حکم اس معنیٰ میں ہے کہ وہ سب سے بنیادی عبادت یعنی ایمان لائیں اور اس کے بعد دیگر اعمال بجالائیں۔لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: تاکہ تمہیں پرہیز گاری ملے۔تقویٰ گناہ سے بچنا بھی ہے اور عذاب سے بچنا بھی، یہاں بھی دونوں مراد لئے گئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ عبادت کا فائدہ عابد ہی کو ملتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اس کو عبادت یا اور کسی چیز سے نفع حاصل ہو۔

توحیداوروجودِ الٰہی پر دلائل

توحید کے لیے پہلی دلیل یہ بیان فرمائی کہ میں تمہارا رب ہوں جو تمہاری پرورش کر رہا ہے اور تمہاری ہر ضرورت پوری کر رہا ہے۔ دوسری دلیل اس کی وہ نعمت ہے جو رب ہونے سے بھی پہلے کی ہے اور وہ ہے تمہیں پیدا کرنا۔ باقی تمام نعمتیں اس کے بعد ہیں، اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں قرآن مجید اس دلیل پر بہت زور دیتا ہے اور اسے بار بار دہراتا ہے۔ اس لیے کہ کفار بھی مانتے تھے کہ خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، فرمایا: وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَهُمۡ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ [الزخرف: "اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔" کسی نے امام شافعی رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ حضرت! وجود الٰہی پر کوئی دلیل لائیں۔ اتفاق کی بات کہ سامنے توت کا درخت تھا۔ امام صاحب فرمانے لگے (1۔ تفسیر ابن کثیر ج 1 ص 58) یہ توت کا درخت خدا تعالیٰ کے وجود پر دلیل ہے۔ دیکھو اس درخت کے پتوں کا ذائقہ، مزہ اور بو یکساں ہے۔ مگر ریشم کا کیڑا اس پتے کو کھا کر ریشم نکالتا ہے۔ شہد کی مکھی اس سے شہد حاصل کرتی ہے۔ بکری کھائے تو مینگنیاں نکالتی ہے۔ اور ہرن کھائے تو کستوری پیدا ہوتی ہے۔ بتاؤ یہ خدا تعالیٰ کا کام نہیں تو اور کس کا کام ہے۔ چار مختلف چیزیں ایک ہی پتا کھاتی ہیں اور ان سے مختلف چیزیں نکلتی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی قدرت تامہ کا شاہکار ہے۔ کہ چاروں چیزوں کو الگ الگ پیدا کرتا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی کسی نے یہی سوال کیا۔ فرمانے لگے (2۔ تفسیر ابن کثیر ج 1 ص 59) کہ انڈہ قلعہ کی مانند ہے۔ اوپر سے سفید اور چکنا اور اندر سے سونے کی طرح زرد ہے۔ یہ اچانک پھٹتا ہے تو اس سے سمیع و بصیر حیوان نکلتا ہے۔ یہ خوبصورت جانور کون نکالتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی قدرت کے سوا اور کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان ہی مصنوعات پر غور کرنے سے اس کی قدرت، حکمت، خالقیت اور ربوبیت کے رموز سمجھ میں آتے ہیں۔ لہٰذا اگر خدا تعالیٰ کی صفت سمجھ میں آ گئی تو پھر عبادت بھی ٹھکانے لگے گی۔ ربوبیت یعنی اللہ تعالیٰ کے خالق، مالک، مدبّر اور کارساز ہونے پر دلائل انسان کے اندر بھی پائے جاتے ہیں اور کائنات میں بھی۔ متعدد نصوص اور اہلِ علم کی تصریحات واضح کرتی ہیں کہ اللہ نے انسان کو اپنی

ربوبیت پہچاننے کے لیے بے شمار نشانیاں عطا کی ہیں۔انسان جب اپنے آپ میں غور کرے تو اسے ربوبیتِ الٰہی کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔کیونکہ نفسِ انسانی ایک عظیم نشانی ہے جو اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ اللہ ہی خالق و رب ہے۔

زمین و آسمان کی تخلیق کے مقاصد

الَّذِیۡ	جس نے	جَعَلَ	بنایا	لَکُمُ	تمہارے لئے
الۡاَرۡضَ	زمین کو	فِرَاشًا	بچھونا	وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً	اور آسمان کو چھت
وَّاَنۡزَلَ	اور اُس نے اتارا	مِنَ السَّمَآءِ	آسمان سے	مَآءً	پانی
فَاَخۡرَجَ	پھر اس نے نکالا	بِهٖ	اُس کے ذریعے	مِنَ الثَّمَرٰتِ	پھلوں سے
رِزۡقًا	رزق	لَّکُمۡ	تمہارے لئے	فَلَا تَجۡعَلُوۡا	پس مت تم بناؤ
لِلّٰهِ	اللہ کیلئے	اَنۡدَادًا	شریک		
وَّاَنۡتُمۡ	حالانکہ تم	تَعۡلَمُوۡنَ(22)	سب جانتے ہو۔		

فرمایا: الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا زمین کو فرش بنانے کا مطلب یہ ہے کہ زمین کو رہائش کے لائق بنایا، اگر زمین دلدلی ہوتی تو انسان کا اس پر قیام دشوار ہو جاتا، جیسا کہ فضاء کے بعض سیاروں کی سطح کے بارے میں بتایا جاتا ہے، ”سماء“ (آسمان) میں فضاء بھی داخل ہے، چھت کا کام حفاظت ہے، اسی طرح فضاء میں مختلف سیاروں اور بالخصوص سورج سے زمین کی طرف آنے والی مہلک اور نقصاندہ آلائشوں کو جذب کر لینے اور تحلیل کر دینے کی صلاحیت ہے، یہ زمینی مخلوقات کی حفاظت کا ایک قدرتی نظام ہے، غالباً اسی پس منظر میں آسمان کو چھت کہا گیا ہے۔عربی زبان میں ’سماء‘ کے معنی بادل کے بھی ہیں اور ابن کثیر کے بہ قول یہاں ’بادل‘ ہی مراد ہے؛ اس لئے آسمان کے بجائے ’بادل‘ سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

یعنی تمہیں اور تمہارے باپ دادا کو پیدا کرنے کے بعد تمہاری ضروریات کے لیے تمہیں کسی دوسری ہستی کے سپرد نہیں کر دیا، بلکہ ہر چیز کا بندوبست خود فرمایا، زمین کو تمہارے لیے بچھونا بنایا،

آسمان کو چھت بنایا، پھر آسمان سے پانی اتار کر تمہاری روزی کے لیے مختلف انواع کے پھل پیدا کیے۔جب تم یہ سب کچھ جانتے ہو تو لازم ہے کہ اللہ کے لیے کسی قسم کے شریک نہ بناؤ، یا پھر اس کی زمین سے نکل جاؤ اور اپنے کسی داتا یا دستگیر کی بنائی ہوئی زمین کے اوپر اور اس کے بنائے ہوئے آسمان کے نیچے رہو اور اسی کا پیدا کیا ہوا رزق کھاؤ۔

ربوبیت کے دلائل تین بڑی اقسام میں ظاہر ہوتے ہیں

قرآن کی تمام تعلیمات کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی توحید ہے، کائنات کی ایک ایک شئ توحید خداوندی کی دلیل ہے اور اس کے خالق کے ایک اور یکتا ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس آیت میں آسمان و زمین کی تخلیق، ستاروں کا منظم نظام اور کائنات کی ہم آہنگی اللہ کی ربوبیت کا قوی ثبوت ہیں۔اور ستاروں کی ترتیب اور نظام 'وجود الخالق وقدرته' پر روشن دلیل ہے۔اسی لئے قرآن مجید نے جا بجا کائنات کی ان نشانیوں سے توحید پر استدلال کیا ہے، جن کو ہر شخص سر کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور دن و رات اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔یہ آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ انسان کا وجود اور اس کے اندر پائی جانے والی پیچیدہ ساخت خود اس بات کی دلیل ہے کہ ایک رب کریم اس کا خالق و مدبّر ہے۔خلاصہ یہ کہ ربوبیت کے دلائل تین بڑی اقسام میں ظاہر ہوتے ہیں: انسان کے اپنے وجود میں موجود نشانات دلالة الأنفس](دلالۃ الأنفس کا معنیٰ اور مفہوم انسان کے اپنے باطن، روح، اور جسمانی ساخت میں پوشیدہ ان نشانیوں (دلائل) سے ہے، جو خالق کائنات (اللہ تعالیٰ) کے وجود، حکمت اور قدرتِ کاملہ کی راہنمائی کرتی ہیں کائنات میں پھیلی ہوئی آیات (دلالۃ الآفاق)۔ عقل وفطرت کی گواہیاں جو مخلوقات کے نظام سے خالق کی ربوبیت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں یہ تمام دلائل اس حقیقت کو مضبوط ترین بنیاد پر ثابت کرتے ہیں کہ اللہ ہی ربّ العالمین ہے۔

قرآنِ کریم کا چیلنج اور اس کی معجزانہ حیثیت

وَإِنۡ	اور اگر	كُنتُمۡ	ہو تم	فِي رَيۡبٍ	کسی شک میں

مِّمَّا	(اُس) سے جو	نَزَّلْنَا	ہم نے اُتارا	عَلٰى عَبْدِنَا	اپنے بندے پر
فَأْتُوا	پس تم لاؤ	بِسُوْرَةٍ	کوئی سورت	مِّنْ مِّثْلِهٖ	اس جیسی
وَادْعُوا	اور تم بلاؤ	شُهَدَآءَكُمْ	اپنے حمایتیوں کو	مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اللہ کے علاوہ
اِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم	صٰدِقِيْنَ(23)	سب سچے		

سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو (لَا رَيْبَ) قرار دیا، اب فرمایا کہ (اس کتاب میں کوئی شک تو نہیں لیکن) اگر تم اس کے بارے میں کسی ادنیٰ سے شک میں بھی مبتلا ہو تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ۔ یہ چیلنج پہلے اس کتاب جیسی ایک کتاب لانے کا کیا گیا۔ [بنی اِسرائیل:88] پھر اس جیسی دس سورتیں لانے کا۔ [ہود:13] پھر مکہ میں اس جیسی ایک سورت لانے کا چیلنج کیا گیا۔ [یونس:38] اب مدینہ میں یہ چیلنج دہرایا جا رہا ہے، کیونکہ سورہ بقرہ مدنی ہے۔ قرآنِ کریم کا چیلنج اور اس کی معجزانہ حیثیت بنیادی طور پر اس کی بے مثال فصاحت، بلاغت، اسلوب اور نظمِ کلام سے واضح ہوتی ہے، جس نے عرب کے فصحا و بلغاء کو بھی عاجز کر دیا۔ قرآن نے خود متعدد مقامات پر انسانوں اور جنّات کو چیلنج دیا کہ اگر وہ اس میں شک رکھتے ہیں تو اس جیسا کلام لے آئیں نصوص میں اس چیلنج کی نوعیت اور قرآن کی معجزانہ بلاغت کو تفصیل سے واضح کیا گیا ہے۔ قرآن کو "اَحسن الحدیث" اس لیے کہا گیا کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوا؛ اس میں ہر لفظ اور ہر حرف اپنی جگہ کامل مناسبت کے ساتھ رکھا گیا ہے، اسی وجہ سے فصاحت و بلاغت کی انتہا پر پہنچا ہوا ہے، حتیٰ کہ عرب کے ماہرین فصاحت بھی اس کے سامنے بے بس ہو گئے اور کہنے لگے کہ «إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ۔ قرآن کا اعجاز اس کے "نظم، صحتِ معانی اور توالی فصاحۃ الألفاظ" میں ہے، اور انسان اپنی فطری کمزوریوں جہل، نسیان، اور اضطراب کے باعث اس درجے کا کلام پیدا نہیں کر سکتا فصحاءِ عرب، جو فصاحت و بلاغت کے امام تھے، اعترافاً عاجز رہے، اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل شدہ اور دائمی معجزہ ہے، مصطفیٰ صادق الرافعی اور دیگر ائمہ نے بھی اس کے اسلوب"، الفاظ کے انتخاب، تراکیب کے حسن، اور آیات کے مقاطع میں کمالِ

تناسق کو اس اعجاز کا بنیادی پہلو قرار دیا ہے ہر زمانے میں جو چیز کمال کو پہنچی ہوئی تھی اس زمانے کے پیغمبر کو ایسا معجزہ دیا گیا جس کے سامنے انسانی کمال عاجز اور بے بس ہو، جیسے فرعون کے جادوگر اور عصائے موسیٰ، اور عیسیٰؑ کے زمانے کے با کمال طبیب اور عیسیٰؑ کا مردوں کو زندہ کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اہل عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت پر فخر تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ایسا معجزہ عطا فرمایا جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال سیکڑوں برس گزرنے کے باوجود نہ کوئی پیش کرسکا نہ کرسکے گا۔ قرآن کا چیلنج ایک کھلا، نا قابل نقض چیلنج ہے کہ کوئی انسان یا جن اس جیسا کلام نہیں لاسکتا۔ اس کا اعجاز زیادہ تر فصاحت، بلاغت، اسلوب، الفاظ کے نظم، معنوی گہرائی، اور اس کے تسلسل میں ہے۔ عرب اہلِ زبان کو معارضہ کی بھرپور دعوت دی گئی، مگر کوئی اس کی مانند نظم پیش نہ کرسکا۔ قرآن ایک ایسا معجزہ ہے جو قیامت تک باقی ہے، اور اس کا چیلنج ہمیشہ جاری رہے گا۔ چنانچہ قرآن کا چیلنج اس کی غیر معمولی اور فوق البشر فصاحت و بلاغت کا ثبوت ہے، جو کسی انسانی طاقت کی پیداوار نہیں ہوسکتی تھی، اور یہی اس کی معجزانہ حیثیت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنے عبادت گزار اور مقبول بندوں میں شامل فرمائے۔ آمین

جہنم کا ایندھن کون سی اشیاء ہوں گی؟ تقویٰ کا لغوی مفہوم مثال کے درست ہونے کی شرط

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ
لِلْكٰفِرِينَ ﴿٢٤﴾ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهٰرُ ۖ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوا هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَأُتُوا بِهِ
مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿٢٥﴾ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ
يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ
رَّبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا ۙ
وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفٰسِقِينَ ﴿٢٦﴾

جہنم کی آگ کی حرارت/ انسان اور پتھر اس کا ایندھن

فَإِنْ لَّمْ	پھر اگر نہ	تَفْعَلُوا	تم کر سکے	وَلَنْ	اور ہرگز نہ						
تَفْعَلُوا	تم کر سکو گے	فَاتَّقُوا	پس تم ڈرو	النَّارَ	آگ سے	الَّتِي	جو				
وَقُودُهَا	اُس کا ایندھن (ہیں)	النَّاسُ	لوگ	وَالْحِجَارَةُ	اور پتھر						

اُعِدَّتۡ	تیار کی گئی ہے	لِلۡكٰفِرِيۡنَ (24)	کافروں کیلئے۔

اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی علم تھا کہ ایسا کلام پیش کرنا انسان کے بس سے باہر ہے اور یہ جو پانچ مرتبہ قرآن میں کفار کو چیلنج کیا گیا ہے تو یہ ان پر اتمام حجت کے لیے ہے کہ اگر ان واضح دلائل کے بعد کوئی کفر پر اڑا رہتا ہے تو اسے اس دوزخ کے عذاب سے ڈر جانا چاہیے۔ جس کا ایندھن انسان ہی نہیں معدنی پتھر (جیسے پتھری کوئلہ، گندھک) وغیرہ بھی ہوں گے جو آگ کی حدت کو بیسیوں گنا تیز کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ اس حدیث سے واضح ہے حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا: "یہ پتھر گندھک کے ہوں گے۔" (طبری) عام آگ انسانی جسم اور پتھروں سے بجھ جاتی ہے یا مدہم ہو جاتی ہے، مگر جہنم کی آگ کی حرارت اس قدر ہے کہ انسان اور پتھر اس کا ایندھن بن کر اسے مزید بھڑکائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تمہاری آگ جہنم کی آگ کے ستر حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔" (بخاری،) بعض علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں حجارۃ سے مراد پتھر کے وہ بت ہیں جن کی پوجا کی جاتی رہی اور اس قول کی تائید اس آیت سے بھی ہو جاتی ہے۔ اِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَؕ اَنۡتُمۡ لَهَا وٰرِدُوۡنَ (انبیاء:98) تم بھی اور اللہ کے سوا جنہیں تم پوجتے ہو سب دوزخ کا ایندھن بنو گے۔ تا کہ کافروں کو اپنے معبودوں کی خدائی کی حقیقت معلوم ہو سکے اور ان کی حسرت میں مزید اضافہ ہو۔

تقویٰ کا معنی: ڈرنا، بچنا اور پرہیز کرنا

تقویٰ کا معنی اپنے اعمال کے انجام سے ڈر جانا ہے۔ اور اس کے مادہ وَ ق یَ میں تین باتیں بنیادی طور پر پائی جاتی ہیں: (1) ڈرنا۔ (2) بچنا۔ (3) پرہیز کرنا۔ گویا تقویٰ کے معنی اپنے نفس کو ہر اس چیز سے بچانا ہے جس سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اور شرعی اصطلاح میں اپنے آپ کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام تقویٰ ہے جو گناہ کا موجب ہو۔ اور جن امور سے شریعت نے منع کیا ہے انہیں چھوڑنے سے یہ بات حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر تقویٰ کا مفہوم محض نواہی کو چھوڑنے تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اوامر کی بجا آوری کو بھی اپنے اندر شامل کر لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے بے حیائی کے کام کرنا

گناہ ہے ویسے ہی نماز یا روزہ وغیرہ ادا نہ کرنا بھی گناہ ہے۔اور تمام تر عبادات کا بنیادی مقصد انسان کے اندر تقویٰ پیدا کرنا ہے یعنی وہ ہر کام کے کرنے سے پہلے اس کا انجام سوچتا ہے اور اس انجام کو ملحوظ رکھ کر اسے اختیار کرتا یا چھوڑتا ہے۔اور چونکہ انجام سے دو چار کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے لہذا تقویٰ کے مفہوم میں گناہوں کے انجام سے ڈرنے اور بچنے کے ساتھ ساتھ اللہ سے ڈرنا اور ہر وقت اس بات کا خیال رکھنا از خود شامل ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ متقی وہ ہے جو اپنے آپ کو گناہ، برائی یا نقصان سے بچانے کے لیے احتیاطی اقدامات اختیار کرے۔

جہنم صرف کافروں کے لیے

اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ اس سے معلوم ہوا کہ جہنم اصل میں کافروں کے لیے بنائی گئی ہے، کوئی مومن اس میں جائے گا تو کفر کے کسی کام کے ارتکاب کی وجہ ہی سے جائے گا، اگرچہ ہمیشہ اس میں نہیں رہے گا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جہنم اس وقت بھی موجود ہے، یہی تمام سلف کا عقیدہ ہے، اس کا انکار صریح آیات واحادیث کا انکار ہے۔

ایمان اور عمل صالح/عمل صالح کے بغیر ایمان ثمر آور نہیں

وَبَشِّرِ	اور خوش خبری دے دو	الَّذِیۡنَ	(اُن لوگوں کو) جو	اٰمَنُوۡا	ایمان لائے			
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اور انہوں نے عمل کئے نیک	اَنَّ	کہ بیشک	لَهُمۡ	اُن کے لئے			
جَنّٰتٍ	باغات (ہیں)	تَجۡرِیۡ	بہتی ہیں	مِنۡ تَحۡتِهَا	اُن کے نیچے سے			
الۡاَنۡهٰرُ	نہریں	كُلَّمَا	جب بھی	رُزِقُوۡا	اُن کو رزق دیا جائے گا			
مِنۡهَا	اُن سے	مِنۡ ثَمَرَةٍ	کوئی پھل	رِّزۡقًا	(بطور) رزق			
قَالُوۡا	وہ کہیں گے	هٰذَا الَّذِیۡ	یہ (تو وہی ہے) جو	رُزِقۡنَا	ہم رزق دیئے گئے			
مِنۡ قَبۡلُ	(اس) سے پہلے	وَاُتُوۡا	اور وہ دیئے جائیں گے					
بِهٖ	اُس سے	مُتَشَابِهًا	ملتا جلتا	وَلَهُمۡ	اور اُن کے لئے	فِيۡهَآ	اُس میں	

اَزْوَاجٌ	بیویاں (ہونگی)	مُّطَهَّرَةٌ	پاک کی ہوئیں	وَّهُمْ	اور وہ سب
فِيْهَا	اُس میں	خٰلِدُوْنَ(25)	ہمیشہ رہنے والے ہیں۔		

قرآن کریم میں آپ اکثر یہ بات ملاحظہ کریں گے کہ جہاں کہیں کفار اور ان کی وعید کا ذکر آتا ہے وہاں ساتھ ہی مومنوں اور ان کی جزا کا ذکر بھی ساتھ ہی کر دیا جاتا ہے اور اس کے برعکس بھی یہی صورت ہوتی ہے، کیونکہ انسان کی ہدایت کے لیے ترغیب اور ترہیب دونوں باتیں ضروری ہیں۔ یعنی قرآن کریم نے ہر جگہ ایمان کے ساتھ عمل صالح کا تذکرہ فرما کر اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ایمان اور عمل صالح ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عمل صالح کے بغیر ایمان ثمر آور نہیں اور ایمان کے بغیر اعمال خیر کی عنداللہ کوئی اہمیت نہیں۔ عمل صالح کیا ہے "عمل صالح" قرآن کی ایک اہم اصطلاح ہے، اس سے ایسا عمل مراد ہے جو اللہ کے حکم سے ہو، اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو اور اس عمل سے خدا ہی کی خوشنودی مقصود ہو، جو عمل اللہ کے حکم کے خلاف ہو، گو بہ ظاہر بہتر نظر آئے؛ لیکن عمل صالح نہیں، جیسے عیدین کے دن روزہ، مکروہ اوقات میں نماز، وغیرہ، کوئی عمل حکم خداوندی کے تحت ہو؛ لیکن سنت نبوی کا خیال نہ رکھا جائے، تو یہ بھی عمل صالح نہیں، آج کل جو بدعات مروج ہیں، وہ اسی قبیل کی ہیں، بہر حال اطاعت الٰہی بھی ہو، سنت نبوی کے مطابق بھی ہو؛ لیکن ریا اور دیکھاوا مقصود ہو تو یہ اللہ کے یہاں مقبول نہیں اور گو صورت کے اعتبار سے نیک عمل ہے؛ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے عمل صالح میں اس کا بھی شمار نہیں خلاف سنت عمل بھی نامقبول اور نمود و نمائش اور ریاکاری کے لئے کیئے گئے عمل بھی مردود و مطرود۔

مُتَشَابِهًا کا مطلب یا تو جنت کے تمام میووں کا آپس میں ہم شکل ہونا ہے، یا دنیا کے میووں کے ہم شکل ہونا۔ تاہم یہ مشابہت صرف شکل یا نام کی حد تک ہی ہوگی یعنی شکل و صورت دیکھ کر وہ یہ تو کہہ دیں گے کہ یہ آم ہے یا انگور یا انار ہے مگر ان کا ذائقہ بالکل الگ اور اعلیٰ درجہ کا ہوگا اور ان کا سائز بھی دنیا کے پھلوں کی نسبت بہت بڑا ہوگا۔

ورنہ جنت کے میووں کے مزے اور ذائقے سے دنیا کے میووں کو کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔

دنیا کی نعمتیں دو میں سے ایک نقص سے خالی نہیں

جنت کی نعمتوں کی بابت حدیث میں ہے: »مَا لا عَينٌ رَأَتْ، وَلا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ « (صحیح بخاری، تفسیر الم السجدۃ) "نہ کسی آنکھ نے انہیں دیکھا، نہ کسی کان نے ان کی بابت سنا (اور دیکھنا سننا تو کجا) کسی انسان کے دل میں ان کا گمان بھی نہیں گزرا۔ آگے فرمایا: اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ جنتی لوگ سب کے سب خواہ مرد ہوں یا عورتیں، بول و براز اور رینٹ وغیرہ نیز اخلاق رذیلہ سے پاک صاف ہوں گے اور ان کی بیویاں یعنی حیض ونفاس اور دیگر آلائشوں سے نجاستوں سے بھی پاک وصاف ہوں گی۔ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ خُلُوْدٌ کے معنی ہمیشگی کے ہیں۔ اہل جنت ہمیشہ ہمیش کے لئے جنت میں رہیں گے اور خوش رہیں گے اور اہل دوزخ ہمیشہ ہمیش کے لئے جہنم میں رہیں گے اور مبتلائے عذاب رہیں گے۔ دنیا کی نعمتیں دو میں سے ایک نقص سے خالی نہیں، یا تو انسان زندہ رہتا ہے اور نعمت اس سے چھن جاتی ہے، یا نعمت باقی رہتی ہے اور خود انسان دنیا سے اُٹھالیا جاتا ہے، غرض فنا کی بیماری انسان کے ساتھ بھی لگی ہوئی ہے اور ان نعمتوں کے ساتھ بھی؛ لیکن آخرت میں انسان کی زندگی بھی ابدی ہوگی اور جنت کی نعمتیں بھی لازوال۔ حدیث میں ہے۔ جنت اور جہنم میں جانے کے بعد ایک فرشتہ اعلان کرے گا" اے جہنمیو! اب موت نہیں ہے اور اے جنتیو! اب موت نہیں ہے۔ جو فریق جس حالت میں ہے، اسی حالت میں ہمیشہ رہے گا۔" (صحیح بخاري)

کفار کا دوسرے طریقے سے معارضہ

اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ	لَا يَسْتَحْيٖٓ	نہیں وہ شرماتا	اَنْ يَّضْرِبَ	کہ وہ بیان کرے
مَثَلًا	مثال	مَّا بَعُوْضَةً	کسی مچھر کی	فَمَا	پھر (اُس کی) جو
فَوْقَهَا	اس کے اوپر	فَاَمَّا	پس رہے	الَّذِيْنَ	(وہ لوگ) جو
اٰمَنُوْا	ایمان لائے	فَيَعْلَمُوْنَ	پس وہ جانتے ہیں		
اَنَّهُ الْحَقُّ	کہ بیشک وہ ہی حق ہے	مِنْ رَّبِّهِمْ	اُن کے رب (کی طرف) سے		

وَاَمَّا	اور رہے	الَّذِيْنَ	(وہ لوگ) جنہوں نے	كَفَرُوْا	کفر کیا
فَيَقُوْلُوْنَ	پس وہ کہتے ہیں	مَاذَآ	کیا	اَرَادَ اللّٰهُ	ارادہ کیا اللہ نے
بِهٰذَا مَثَلًا	اس مثال سے	يُضِلُّ	وہ گمراہ کرتا ہے	بِهٖ	اس سے
كَثِيْرًا	اکثر کو	وَّيَهْدِيْ	اور وہ ہدایت دیتا ہے	بِهٖ	اس سے
كَثِيْرًا	اکثر کو	وَمَا	اور نہیں	يُضِلُّ	وہ گمراہ کرتا ہے
بِهٖٓ	اس سے	اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ(26)	مگر نافرمانوں کو۔		

جب اللہ تعالیٰ نے دلائل قاطعہ سے قرآن کا معجزہ ہونا ثابت کر دیا تو کفار نے ایک دوسرے طریقے سے معارضہ کر دیا (یہ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا بنیادی مطلب مقابلہ کرنا، ٹکراؤ، یا مخالفت کرنا ہے) اور وہ یہ کہ اگر یہ کلام الٰہی ہوتا تو اتنی عظیم ذات کے نازل کردہ کلام میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثالیں نہ ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ بات کی توضیح اور کسی حکمت بالغہ کے پیش نظر تمثیلات کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس لئے اس میں حیا و حجاب بھی نہیں۔ فَوْقَهَا جو مچھر کے اوپر ہو یعنی پر یا بازو، مراد اس مچھر سے بھی حقیر تر چیز۔ یافَوْقُ کے معنی، اس سے بڑھ کر بھی ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں معنی (مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز) کے ہوں گے۔ لفظ فَوْقَهَا میں دونوں مفہوم کی گنجائش ہے، واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکھی کی مثال اور مکڑی کی مثال کافروں کے معبودان باطل کی کمزوری کو واضح کرنے کے لیے دی تھی) اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات میں کوئی باک نہیں کہ وہ مکھی اور مکڑی تو درکنار، مچھر یا اس سے بھی کسی حقیر تر چیز کی مثال بیان کرے۔ کیونکہ اس کی مخلوق ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ دیکھنا تو یہ چاہیے کہ آیا مثال اور مُمَثَّل لہ میں مطابقت پائی جاتی ہے؟ اگر مطابقت پائی جائے تو یہ مثال بالکل درست ہوگی۔ کفار کے معبود بھی تو حقیر چیزیں ہیں اور مکھی اور مکڑی بھی لہذا تمثیل درست ہوئی۔ مثال دینے والا خواہ بڑا یا چھوٹا اس سے کوئی بحث نہیں کی جاتی، اور کفار نے جو اعتراض کیا تھا۔ وہ بالکل خلاف عقل تھا جو حماقت اور عناد پر مبنی تھا۔

یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا "اللہ تعالیٰ اسی مثال کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ ایسی بات بعض لوگوں کے ذہن میں فٹ نہیں بیٹھتی۔جس کی وجہ سے وہ طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں۔حالانکہ نہ تو وہ حکمت کے اصولوں سے واقف ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں کلام کی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔لہٰذا فضول اعتراض پیش کرتے ہیں اور گمراہ ہو جاتے ہیں۔فرمایا ایسی مثالیں صرف گمراہ ہی نہیں کرتیں بلکہ" وَّ یَهۡدِیۡ بِهٖ کَثِیۡرًا " اللہ تعالیٰ انہیں مثالوں کے ذریعے ہدایت بھی دیتا ہے۔جو لوگ مثال کے ذریعے بات کو آسانی سے سمجھ جاتے ہیں، وہ حقیقت کو پا لیتے ہیں۔ لہٰذا ہدایت یافتہ ہو جاتے ہیں۔

فسق کے تین درجے

فرمایا تاہم" وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ: اور وہ اس کے ذریعے صرف نافرمانوں ہی کو گمراہ کرتا ہے۔شریعت میں ''فاسق'' اس نافرمان کو کہتے ہیں جو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو۔فسق کے تین درجے ہیں ایک تَغَابِی وہ یہ کہ آدمی اتفاقیہ کسی کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو جائے اور اس کو برا ہی جانتا رہا۔دوسرا اِنۡہِمَاکی کہ کبیرہ گناہوں کا عادی ہو گیا اور اس سے بچنے کی پروا نہیں کرتا۔تیسرا جُحُوۡدی کہ حرام کو اچھا جان کر ارتکاب کرے اس درجہ والا ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔پہلے دو درجوں میں جب تک سب سے بڑے کبیرہ گناہ یعنی کفر و شرک کا ارتکاب نہ کرے وہ مومن و مسلمان ہے۔مذکورہ آیت میں فاسقین سے وہی نافرمان مراد ہیں جو ایمان سے خارج ہو گئے۔

صلہ رحمی کی تاکید اور اقرباء سے حسن سلوک/ زندگی اور موت کے چار مراحل

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ
وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٢٧﴾ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ
اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٨﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ
لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ
وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٩﴾

فاسقوں کی تین صفات کا تذکرہ

الَّذِيْنَ	(وہ لوگ) جو	يَنْقُضُوْنَ	وہ توڑتے ہیں	عَهْدَ اللّٰهِ	اللہ کا عہد
مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ	اُس کی مضبوطی کے بعد	وَيَقْطَعُوْنَ	اور وہ کاٹتے ہیں	مَآ	جو
اَمَرَ اللّٰهُ	حکم دیا اللہ نے	بِهٖٓ	اُس کے ساتھ	اَنْ يُّوْصَلَ	کہ وہ جوڑا جائے
وَيُفْسِدُوْنَ	اور وہ فساد پھیلاتے ہیں	فِي الْاَرْضِ	زمین میں		

ہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔	هُمُ الْخٰسِرُوْنَ(27)	وہ (لوگ)	اُولٰٓئِكَ

اللہ کی کتاب سے ہدایت پانے کے بجائے گمراہ ہونے والے فاسقوں کی تین صفات ذکر کی گئی ہیں، اللہ کے عہد کو توڑنا، رشتہ داری اور دوسرے باہمی تعلقات قطع کرنا اور زمین میں فساد کرنا، جیسا کہ مشرکین نے اس عہد کو توڑا جو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے ساتھ ان سے لیا گیا تھا۔ [الأعراف : 172] یہود و نصاریٰ نے وہ عہد توڑا جو ان سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے لیے لیا گیا تھا، کفار قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں سے رشتہ داری کو قطع کیا اور منافقین نے زمین میں فساد پھیلایا اور یہ تینوں صفات کفار کے تمام گروہوں میں پائی جاتی ہیں۔ مفسرین نے عَهْدٌ کے مختلف مفہوم بیان کیے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی وہ وصیت جو اس نے اپنے اوامر بجالانے اور نواہی سے باز رکھنے کے لئے انبیاء (علیہم السلام) کے ذریعے سے مخلوق کو کی۔ وہ عہد جو اہل کتاب سے تورات میں لیا گیا کہ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آجانے کے بعد تمہارے لئے ان کی تصدیق کرنا اور ان کی نبوت پر ایمان لانا ضروری ہوگا۔ وہ عہد الست جو صلب آدم سے نکالنے کے بعد تمام ذریت آدم سے لیا گیا، جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے: وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ (الأعراف:172) نقض عہد کا مطلب عہد کی پروانہ کرنا ہے (ابن کثیر)

تعلقات کو جوڑنے، قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا

اسلامی اخلاقیات کے باب میں واضح کیا گیا ہے کہ اچھا برتاؤ، محبت، تعاون، شفقت اور رحم دلی وہ صفات ہیں جن سے معاشرے میں قربت، اتحاد اور اعتماد پیدا ہوتا ہے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک انہی صفات کا لازمی حصہ ہے۔ صلۂ رحمی کے ذریعے خاندانوں میں محبت اور دلوں میں قربت بڑھتی ہے۔ رشتہ داروں کی مدد، خبرگیری، مالی تعاون، اچھے اخلاق اور نرمی سے پیش آنا اسلامی اخلاق کا بنیادی تقاضا ہے۔ ان حقوق کا ادا کرنا اللہ کی رضا، معاشرتی سکون اور افراد کے باہمی تعلقات کو مضبوط بناتا ہے۔ بہرحال خدا نے جن تعلقات کو جوڑنے، قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا ہے، جیسے خدا اور بندہ کا تعلق، انبیاء اور اُمتوں کا تعلق اور ایک انسان سے دوسرے انسان کا تعلق،

ان کو یہ توڑنے کے مرتکب ہیں اور اس کی دلیل وہ سلوک ہے جو یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ روا رکھتے تھے اس میں پہلی قسم میں بندے اور اللہ کے درمیان تعلق کا ذکر ہے اور دوسری قسم میں بندے اور بندے کے درمیان تعلق کا۔

فساد فی الارض کیا ہے؟

اگر ان دونوں قسم کے تعلقات کا لحاظ نہ رکھا جائے تو یہیں سے فساد کی جملہ اقسام پیدا ہو جاتی ہیں ۔قرابت داری توڑنا کتنا بڑا گناہ ہے ۔اور فساد سے اسلام کی مخالفت، مسلمانوں سے عداوت اور ظلم و ناانصافی مراد ہے ۔امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ کفر، شرک اور شرائع کو خراب کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا فساد فی الارض ہے ۔زمین و آسمان کی اصلاح اطاعت سے ہوتی ہے ۔کفر شرک اور معاصی کی وجہ سے اس میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے ۔دوسری بات یہ ہے کہ تمام قسم کی قبیح رسوم بھی فساد فی الارض کے قبیل سے ہی ہیں، شرک ، بدعت ، ناچ گانا، عریانی اور فحاشی یہ سب قبیح رسوم ہیں ۔قبروں پر عرس منانا، قبر پرستی کو رواج دینا یہ بھی انہیں رسوم میں سے ہے ۔اور فساد فی الارض ہے ۔تیسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ منافق لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی بجائے اس کے غضب کو دعوت دیتے ہیں ۔ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کی ہر خواہش پوری ہو جائے ۔ان کے کسی فعل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اور وہ اپنی من مانی کرتے رہیں ۔الغرض عہد شکنی، قطع رحمی اور فساد فی الارض یہ تین بری خصلتیں ہیں ۔جو فاسقوں یا منافقوں میں پائی جاتی ہیں اور جن سے اجتناب کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ۔الغرض! جن چیزوں کے ملانے کا حکم دیا گیا وہ یہ ہیں: (۱) رشتے داروں سے تعلقات جوڑنا، (۲) مسلمانوں کے ساتھ دوستی و محبت کرنا، (۳) تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ماننا، (۴) تمام کتابوں کی تصدیق کرنا اور حق پر جمع ہونا۔ ان کو قطع کرنے کا معنیٰ ہے رشتے داروں سے تعلق توڑنا، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو نہ ماننا اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں کی تصدیق نہ کرنا۔

انسان پر وارد ہونے والی چار کیفیات

کَیْفَ	کیسے	تَکْفُرُوْنَ	تم انکار کرتے ہو	بِاللّٰہِ	اللہ کا
وَ کُنْتُمْ	حالانکہ تم تھے	اَمْوَاتًا	بے جان (مُردہ)		
فَاَحْیَاکُمْ	تو اُس نے زندگی دی تمہیں	ثُمَّ	پھر		
یُمِیْتُکُمْ	وہ موت دے گا تمہیں	ثُمَّ	پھر	یُحْیِیْکُمْ	وہ زندہ کرے گا تمہیں
ثُمَّ	پھر	اِلَیْہِ	اُسی کی طرف	تُرْجَعُوْنَ(28)	تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت میں انسان پر وارد ہونے والی چار کیفیات کا ذکر ہے۔ پہلے موت، پھر زندگی، پھر موت، پھر زندگی۔ روح اور جسم کے اتصال کا نام زندگی اور ان کے انفصال کا نام موت ہے۔ پہلی حالت موت ہے یعنی جملہ انسانوں کی ارواح تو پیدا ہو چکی تھیں لیکن جسم اپنے اپنے وقت پر عطا ہوئے، اسی عرصہ میں عہد الست لیا گیا تھا۔ دوسری حالت انسان کی پیدائش سے لے کر اس کے مرنے تک ہے، جس میں وہ اچھے یا برے اعمال کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ تیسری حالت موت سے لے کر حشر تک اور چوتھی اور آخری حالت دوبارہ جی اٹھنے (حشر) کے بعد لامتناہی زندگی ہے۔ یعنی توحید و نبوت کے دلائل اور کفر و ایمان کی جزا و سزا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص و عام نعمتوں کا اور قدرت کی عجیب نشانیوں کا ذکر فرمایا اور کفر کی خرابی اور برائی کو کافروں کے دلوں میں بٹھانے کیلئے انہیں خطاب کیا کہ تم کس طرح خدا کے منکر ہوتے ہو حالانکہ تمہارا اپنا حال اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ تم بدن میں روح ڈالے جانے سے پہلے تمام مراحل میں مردہ تھے یعنی کچھ نہ تھے یا بے جان جسم تھے پھر اس نے تم میں روح ڈال کر تمہیں زندگی دی یعنی تم نطفۂ بے جان، پھر خون، پھر گوشت کا ٹکڑا تھے اور اسی سے اللہ نے ایک بولتا، دیکھتا، سنتا، چلتا، پھرتا انسان بنا دیا۔ پھر زندگی کی مدت پوری ہونے پر تمہیں موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا یعنی قیامت کے دن دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے۔ اس سے یا تو قبر کی زندگی مراد ہے جو سوال کے لیے ہو گی یا قیامت کی، پھر تم حساب کتاب اور جزا کے لیے اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو اپنے اس حال کو جان کر تمہارا

کفر کرنا نہایت عجیب ہے ۔ایمان عمل کی جڑ ہے، ایمان ہی سے عمل کی شاخیں پھوٹتی ہیں اور عقیدۂ آخرت ایمان و عمل صالح کا محرک ہے، اگر آخرت کا شوق اور خوف نہ ہو تو نہ کسی نیک کام کی رغبت ہو اور نہ کسی برائی سے بچنے کی توفیق؛ اسی لئے قرآن عام طور پر جہاں ایمان و عمل کی ترغیب دیتا ہے یا کفر اور گناہ سے روکتا ہے، اپنی بات کو آخرت کے تذکرہ پر ختم کرتا ہے ۔اس آیت میں غور کریں تو ہم مسلمانوں کیلئے بھی نصیحت ہے کہ ہم بھی کچھ نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں زندگی عطا کی اور زندگی گزارنے کے لوازمات اور نعمتوں سے نوازا تو اس کی عطاؤں سے فائدہ اٹھا کر اس کی یاد سے غافل ہونا اور ناشکری اور غفلت کی زندگی گزارنا کسی طرح ہمارے شایانِ شان نہیں ہے ۔

زمین کی تمام چیزیں انسانیت کے فائدے کیلئے

هُوَ الَّذِیْ	وہ (ذات) جس نے	خَلَقَ	پیدا کیا	لَكُمْ	تمہارے لئے	
مَّا فِی الْاَرْضِ	جو زمین میں ہے	جَمِیْعًا	سب کچھ	ثُمَّ	پھر	
اسْتَوٰۤى	قصد کیا	اِلَى السَّمَآءِ	آسمان کی طرف			
فَسَوّٰىهُنَّ	پھر درست کر کے بنا دیا انہیں	سَبْعَ سَمٰوٰتٍ	سات آسمان	وَهُوَ	اور وہ	
بِكُلِّ شَیْءٍ	ہر چیز کو	عَلِیْمٌ (29)	خوب جاننے والا ہے۔			

انسان کی موت وحیات کا تذکرہ کرنے کے بعد دیگر انعامات کا اجمالی خاکہ پیش کیا هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا " اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا ہے ۔وہ سب تمہارے فائدے کے لیے ہے ۔غذا، لباس، پانی، ہوا، نباتات، خوشبو، آلات، نیک بختی اور کمال حاصل کرنے کے ذرائع سب انسانی مفاد کے واسطے ہیں ۔بعض چیزیں براہ راست انسانی مفاد میں ہیں ۔اور بعض بالواسطہ ۔حتیٰ کہ موذی جانور بھی تمہارے فائدے کے لیے ہیں ۔بعض اوقات زہریلے جانوروں کا زہر بھی تریاق کا کام دیتا ہے ۔کسی موسم میں انسان مکھیوں سے تنگ آجاتا ہے ۔مگر یہ بھی فائدے سے خالی نہیں ۔ یہ غلاظت کے ڈھیر جو بیماری کا باعث بنتے ہیں انہیں مکھیاں ہی چاٹ جاتی ہیں یہ تو انسان پر احسان کرتی ہیں ۔کہ غلاظت کے خاتمے کا سبب بنتی

ہیں ۔غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی ہے۔ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا " یعنی زمین کی تمام چیزیں تمہارے لیے پیدا کیں ۔اصلاً تمام چیزیں مباح یعنی جائز ہیں ۔البتہ جس چیز کے متعلق حرمت کی دلیل آئے گی صرف وہی حرام ہوگی ۔ باقی سب جائز سمجھی جائے گی ۔ ہر قسم کے جانور اور ہر قسم کے پھل انسان کے لیے مباح ہیں ۔مگر جہاں حکم آگیا کہ خنزیر حرام ہے ۔مردار حرام ہے ۔ یا فلاں قسم کا جانور حرام ہے تو وہ حرمت کے زمرہ میں آگیا۔ باقی سب جائز ٹھہرے ۔اللہ تعالیٰ نے ان کی وضع ہی ایسی رکھی ہے ۔کہ انہیں انسان کے فائدے کے لیے بنایا ہے ۔البتہ جس چیز کو حرام قرار دیا ہے ۔اس میں ضرور کوئی روحانی یا جسمانی قباحت ہوگی ۔جس کی وجہ سے اسے ناجائز قرار دیا گیا ہے ۔ورنہ سب چیزیں مباح ہیں ۔زمین کی تمام اشیاء کی تخلیق کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اے انسان! میں نے تمہارے لیے صرف زمین کی چیزیں ہی پیدا نہیں کیں ۔بلکہ " ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ " پھر اللہ تعالیٰ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا " فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ " پس برابر کر دیا ان کو سات آسمان ۔یعنی تہ در تہ سات آسمان پیدا فرمائے ۔

زمین سے آسمان تک کی مسافت

اور زمین سے آسمان تک اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت ہے ۔اللہ تعالیٰ نے اتنے دبیز آسمان پیدا کیے ہیں ۔ یونانی فلکیات کے ماہرین آسمانوں کی تعداد نو بتاتے ہیں اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں ۔سات آسمانوں کے ساتھ عرش اور کرسی کو شامل کر لیں ۔تو نو بن جاتے ہیں کیونکہ عرش الگ ہے ۔اور کرسی الگ ہے ۔وہ آسمانوں سے بھی وسیع تر ہیں اور ذات خداوندی ان تمام چیزوں سے وراء الوراء ہے ۔فرمایا " وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ " یعنی وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۔اس کے علاوہ ہر چیز کو جاننے والا اور کوئی نہیں ۔لہٰذا عبادت بھی اسی کی کرنی چاہئے ۔جو علیم کل اور قادر مطلق ہے " إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ " جو قادر ہے ۔جو خالق اور رب ہے ۔اس کے علاوہ الٰہ بھی کوئی اور نہیں ہو سکتا ۔غرضیکہ ذرے ذرے کو جاننے والا وہی

ہے اور محیط علم صرف خدا تعالیٰ کا ہے نہ جبرائیل (علیہ السلام) اور دیگر فرشتوں کا۔ نہ نبیوں کا نہ ولیوں کا۔اس لیے معبود برحق بھی صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔اللہ تعالیٰ کی پہچان کی یہ صفات جس طرح قرآن پاک میں بیان ہوئی ہیں۔اسی طرح توراۃ اور انجیل میں بیان ہوئی ہیں۔مگر لوگوں نے دین کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ نافع اور ضار بھی وہی ذات ہے۔خدا تعالیٰ کے سوا غائبانہ طور پر نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔اور نہ نقصان۔نہ کوئی فریاد سن سکتا ہے اور نہ کوئی بگڑی بنا سکتا ہے نہ کسی کو تفصیل سے علم ہے کہ کسی کو کیا تکلیف یا پریشانی ہے کیونکہ علیم کل صرف ذات خداوندی ہے۔اس میں کوئی اس کا شریک نہیں۔الغرض فرمایا "**وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ**" ہر چیز کا جاننے والا خدا تعالیٰ ہے لہٰذا عبادت بھی اسی کی ہونی چاہئے۔اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے عبادت گزار بندوں میں شامل فرمائے۔آمین

تخلیق آدم پرفرشتوں کا اعتراض/تسبیح وتقدیس کا فرق

اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

حضرت آدم (علیہ السلام) کی تخلیق اور خلافت ارضی

وَاِذْ قَالَ	اور جب کہا	رَبُّكَ	تیرے رب نے	لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ	فرشتوں سے

اِنِّیْ	بیشک میں	جَاعِلٌ	بنانے والا ہوں
فِی الْاَرْضِ	زمین میں	خَلِیْفَةً	خلیفہ

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے ان روحانی اور نفسانی نعمتوں کا ذکر کیا ہے جو اس نے انسان کو عطا فرمائیں۔ چنانچہ اس مقام پر حضرت آدم (علیہ السلام) کی تخلیق اور خلافت ارضی کو بیان فرمایا گیا۔ تخلیق آدم ایک بنیادی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت آدم (علیہ السلام) کو عطاء کی اور پھر یہ خلافت بنی نوع انسان میں ودیعت کر کے خلافت ارضی کے مسئلہ کو واضح کر دیا۔ گویا اس رکوع کا موضوع خلافت ارضی ہے۔ اس آیت میں تخلیق انسانی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے "وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ملائکۃ (فرشتے) اللہ کی نوری مخلوق ہیں، جن کا مسکن آسمان ہے، جو اوامر الٰہی کے بجالانے اور اس کی تحمید وتقدیس میں مصروف رہتے ہیں اور اس کے کسی حکم

سے سرتابی نہیں کرتے۔" یعنی اس بات پر غور کرو کہ جب تیرے پروردگار نے فرشتوں کے سامنے فرمایا۔کہ تحقیق میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں گویا آدم کی تخلیق اس واسطے ہوئی کہ اسے دنیا میں خلیفہ مقرر کیا جانا ہے۔لہٰذا آدم کی تخلیق مستقل تخلیق نہیں بلکہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہاں خلافت کا ایک اہم ترین مسئلہ بھی سمجھا دیا۔

قرآن پاک میں خلیفہ کے دو معانی

قرآن پاک میں خلیفہ دو معانی میں آتا ہے۔ پہلا معنی وہی ہے جو آدم (علیہ السلام) کے متعلق فرمایا کہ میں آپ کو اپنا خلیفہ یعنی نائب بنانے والا ہوں۔" خلف یخلف " دوسرے کے پیچھے آنے والے یعنی نیابت کرنے والے کو کہتے ہیں۔انسان کی حیثیت بطور مخلوقِ خدا زمین پر آباد کاری، اصلاح اور ذمہ داری نبھانے والے جانشین کی ہے۔خلائف" اور "خلفاء" دونوں "خلیفہ" کی جمع ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر آنے والی نسل پچھلی نسل کی جگہ لے کر زمین میں آباد ہوتی ہے اس طرح "خلیفہ" اپنی اصل میں "جانشین، قائم مقام، ذمہ دار اور نائب" کے معنی رکھتا ہے، چاہے وہ اللہ کے احکام کے تحت انسان ہو یا کسی ریاست کا حکمران۔قرآن پاک میں یہ بھی آتا ہے" هُوَ الَّذِیۡ جَعَلَكُمۡ خَلٰٓئِفَ الۡاَرۡضِ "یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ذات ہے۔جس نے تمہیں ایک دوسرے کا جانشین یا خلیفہ بنایا۔جس طرح بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوتا ہے۔خلیفہ کا دوسرا معنی جو اس مقام پر واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو اپنا خلیفہ یعنی نیابت انجام دینے والا پیدا کیا انسان کے علاوہ باقی بیشمار مخلوقات بھی اس زمین پر پیدا کی گئی ہیں۔مگر خلافت کا حق اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت انسان کو دیا ہے۔اور اس سے بھی مراد یہ ہے کہ زمین اور ساری کائنات کی اصل بادشاہت تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔آدم (علیہ السلام) کو صرف نیابت تفویض ہوئی ہے گویا انسان دنیا میں خلافت اپنی مرضی سے انجام نہیں دے گا۔بلکہ حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہوگا اور انسان اس حکم کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے جس خلافت کا وعدہ فرمایا اور جس کو پورا فرمایا وہ یہی خلافت ہے۔" وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ

فِي الْاَرْضِ "۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور نیک اعمال کی شرط پر غلبہ، اقتدار، اور امن کا قطعی وعدہ فرمایا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ نظام، نظام خلافت ہے۔ دین میں ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ کی کوئی حیثیت نہیں۔ انسان تو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا نظام نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ کہ جس قسم کے احکام چاہے نافذ کرے بلکہ اسے احکام اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل کرنا ہوں گے۔

خلیفہ اور اہل السنت والجماعت کا نظریہ

مسلمانوں کے تمام فرقے اس بات پر متفق ہیں کہ خلیفہ ہونا چاہئے۔ صرف ایک خارجی فرقہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ حکومت صرف اللہ ہی کی ہے۔ کوئی اس کا خلیفہ نہیں ہے جو خلافت کو تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ہی بطور خلیفہ کے کی ہے۔ اس معاملہ میں شیعہ مذہب بھی باطل ہے۔ کہ اس کے پیروکار خلیفہ یا حاکم (امام) کو معصوم اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر شدہ مانتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ خلیفہ کو منتخب کرنے والے عام لوگ ہیں اور وہی اسے معزول بھی کر سکتے ہیں۔ اس مسئلہ میں اہل السنت والجماعت کا نظریہ بالکل واضح ہے۔ کہ خلیفہ کا انتخاب واجب ہے اس کو منصوص اور مقرر نہیں کیا گیا۔ بلکہ جماعت المسلمین پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ اپنے میں سے بہتر شخص کو اس منصب پر فائز کر لیں۔ خلیفہ کے بغیر نظام ارضی کا چلانا درست نہیں ہے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی وفات پر مسئلہ خلافت آپ کے دفن سے پہلے طے کر لیا گیا۔ ترمذی شریف کی روایت میں (1۔ شمائل ترمذی ص 601) آتا ہے۔ کہ اگر مسئلہ خلافت طے نہ کیا جاتا تو امت کے اختلافات کا ختم ہونا ممکن نہ تھا۔ تاہم یہ واضح ہے کہ قرآن پاک یا حضور نبی کریم (علیہ السلام) نے کسی کا نام لے کر خلافت کا فیصلہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ کام جماعت المسلمین پر چھوڑا کہ جس کو مناسب سمجھیں، خلیفہ مقرر کر لیں۔ البتہ نبی (علیہ السلام) نے اشارتاً یہ بات سمجھا دی "وَيَأْبَى اللّٰهُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَّا أَبَا بَكْرٍ" یعنی میرے بعد اللہ تعالیٰ بھی انکار کرے گا اور مومن بھی انکار کریں گے کہ خلیفہ ابو بکرؓ کے سوا کوئی نہیں ہونا چاہئے۔ انتخاب خلیفہ کا ایک طریقہ تو یہ ہو گیا کہ عامۃ المسلمین جس کو چاہیں اپنے میں سے

خلیفہ منتخب کرلیں جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب ہوا۔اس کے علاوہ بعض دوسرے ذرائع بھی ہیں۔جوامت میں ملتے ہیں۔مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آخری ایام میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب بطور خلیفہ خود کر دیا تھا(4۔البدایہ والنہایہ ج 7 ص 18) آپ نے ایک خط لکھ دیا تھا کہ لوگوں کے سامنے پڑھ دینا۔یہ گویا خلافت کا پروانہ تھا۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ امت میں بہترین آدمی تھے۔ان کا انتخاب اس طرح عمل میں آیا۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بعد خلافت کا فیصلہ کرنے کے لیے چھ آدمیوں کی شوریٰ قائم کی اور فرمایا کہ میرے بعد خلافت کا فیصلہ یہ لوگ کریں گے۔یہ چھ آدمی وہ تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے رخصت ہوتے وقت ان سے بڑے راضی تھے۔چناچہ ان حضرات نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا۔خلافت پر فائز ہونے کی ایک چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص خود بخود غلبہ پا کر حکومت حاصل کرے۔کہتے ہیں کہ ایسا شخص بھی قابل اطاعت ہے ہاں اگر وہ شریعت کے احکام جاری کرنے میں کوتاہی کرے۔تو اسکی اطاعت نہیں کی جائے گی۔اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو زمین پر اسکے احکام نافذ کرنے کے لیے خلیفہ بنایا۔اور پھر یہ خلافت آپ کی نسل میں باقی رکھی۔کہ خلافت کا حق بنی نوع انسان کو حاصل ہے۔یہ حق کسی اور مخلوق کو نہیں پہنچتا۔

اطاعت شعار مخلوق کے ہوتے ہوئے انسانی تخلیق کیوں؟

قَالُوْٓا	انہوں نے کہا	اَتَجْعَلُ	کیا تو بنائے گا	فِيْهَا	اُس میں			
مَنْ يُّفْسِدُ	جو وہ فساد پھیلائے گا	فِيْهَا	اُس میں					
وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ	اور وہ بہائے گا خون	وَنَحْنُ	حالانکہ ہم					
نُسَبِّحُ	ہم تسبیح بیان کرتے ہیں	بِحَمْدِكَ	تیری تعریف کے ساتھ					
وَنُقَدِّسُ	اور ہم پاکی بیان کرتے ہیں	لَكَ	تیرے لئے	قَالَ	فرمایا			
اِنِّىْٓ اَعْلَمُ	بیشک میں جانتا ہوں	مَا لَا	جو نہیں	تَعْلَمُوْنَ(30)	تم جانتے۔			

جب اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو اپنا نائب مقرر کرنے کا ارادہ فرمایا۔تو "قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ

فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَ یَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ”یعنی فرشتوں نے کہا اے مولا کریم تو دنیا میں ایسی ہستی کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہتا ہے۔جو زمین میں فساد کریں گے۔اور خون بہائیں گے فرشتوں کا یہ کہنا کچھ اعتراض کے طور پر نہ تھا؛ بلکہ کمالِ نیاز مندی کے ساتھ محض عرضِ مدعا تھا،کہ حمد وثناء اور تسبیح وتقدیس میں تو ہم لوگ ہمہ دم مصروف ہیں ہی،اور جو اُمور ہمارے حوالہ کئے جاتے ہیں،ان کو بجالانے میں بھی کوئی کسر نہیں رکھی جاتی،زمین میں انسان سے پہلے جنات کے قیام کا تجربہ ہمیں بھی ہے اور اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ نئی زمینی مخلوق بھی سب کی سب نیکو کار نہ ہوگی،اس میں فساد مچانے اور خونریزی کرنے والے لوگ بھی ہوں گے،تو صد فی صد فرمانبردار اور اطاعت شعار مخلوق کے ہوتے ہوئے ایسی مخلوق کا وجود میں لانا مفید نظر نہیں آتا،جن میں اچھے لوگ بھی ہوں اور مفسدین واشرار بھی۔یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اس کو کسی سے مشورہ کی حاجت ہو،البتہ یہاں خلیفہ بنانے کی خبر فرشتوں کو ظاہری طور پر مشورے کے انداز میں دی گئی۔

استخارہ واستشارہ کا حکم

اس سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اہم کام کرنے سے پہلے اپنے ماتحت افراد سے مشورہ کرلیا جائے تاکہ اس کام سے متعلق ان کے ذہن میں کوئی خلش ہو تو اس کا ازالہ ہوجائے یا کوئی ایسی مفید رائے مل جائے جس سے وہ کام مزید بہتر انداز سے ہوجائے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ کو بھی صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡهُم سے مشورہ کرنے کا حکم دیا،جیسا کہ سورۂ آل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:” وَ شَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ “اور کاموں میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔(اٰل عمران: ۱۵۹)اور انصار صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡهُم کا وصف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ”وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ“اور ان کا کام ان کے باہمی مشورے سے (ہوتا) ہے۔(شوریٰ: ۳۸)حضرت انس بن مالک رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡهُ سے روایت ہے،نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا:”جس نے استخارہ کیا وہ نامراد نہیں ہوگا اور جس نے مشورہ کیا وہ نادم نہیں ہوگا اور جس نے میانہ روی کی وہ کنگال نہیں ہوگا۔

انسان کی زندگی مختلف ادوار سے گزرتی ہے اور اس دوران انسان کو بہت سے اہم فیصلے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ ان فیصلوں سے قبل انسان؛ اگرچہ غور و فکر کرتا ہے اور اپنی بساط کے مطابق، بہترین فیصلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان کے بہت سے فیصلوں کے نتائج مثبت نہیں نکلتے۔ مثبت فیصلوں کے زندگی پر نہایت خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں، جب کہ منفی فیصلوں کے نتیجے میں انسان کو کئی مرتبہ نقصان اور پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کتاب و سنت کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان کو زندگی کے کسی بھی موڑ پر اہم فیصلہ کرنے سے قبل مشاورت اور استخارہ ضرور کرنا چاہیے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کسی بھی اہم معاملے میں کوئی قدم اُٹھانے سے قبل مشورہ کیا کرتے تھے، اسی طرح احادیث مبارکہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جس سے مشورہ کیا جائے، اس کو امانت دار ہونا چاہیے۔ بدنیت اور حاسد سے مشاورت کرنے سے اعراض کرنا چاہیے۔ مشورہ کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ سے استخارہ کرنا، یعنی اس سے خیر کو طلب کرنا بھی، انسان کے لیے انتہائی مفید ہے، استخارہ کے حوالے سے اس بات کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ استخارہ حلال وحرام کے تعین یا فرائض کو ساقط کرنے یا کسی گناہ کے کام کے بارے میں فیصلہ کرنے کے حوالے سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ استخارہ ان دنیاوی امور میں ہوتا ہے، جن کا تعلق انسان کی روزمرہ کی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے اور انسان دو راستوں میں سے ایک راستے کو ترجیح دینا چاہتا ہے یا اپنے مستقبل کے حوالے سے رہنمائی کا طلب گار ہوتا ہے۔ حلال وحرام اور ارکان دین کے بارے میں وضاحت یا رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ہمیں استخارہ کی بجائے کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جب کہ روزمرہ زندگی کے معاملات مثلاً کاروبار، شادی بیاہ یا تعلیم کے حوالے سے مشورے اور استخارے کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

استخارہ کرنے کے نتیجے میں انسان کے قلبی رجحانات کو اللہ تعالیٰ خیر کی طرف مائل فرما دیتے ہیں۔ بعض لوگ استخارہ کو خواب کے ساتھ مشروط کرتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں، استخارہ خواب کے ساتھ مشروط نہیں ہے، تاہم؛ اگر استخارہ کرنے والے کو استخارہ کے بعد کوئی واضح خواب آ جائے تو اُس پر عمل کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ مومن و مسلمان کا خواب بھی وحی کا چھیالیسواں حصہ ہوتا ہے اور خواب

میں کسی خیر کا اشارہ مل جانا اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے بعید نہیں ہے۔ انسان اپنی زندگی میں بہت سے معاملات میں گومگوں کا شکار رہتا ہے۔ ان معاملات میں تشویش سے نکلنے کے لیے مشورے اور استخارے کا راستہ بہترین راستہ ہے۔ اگر انسان اس راستے پر عمل پیرا ہو جائے تو اس کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو سکتی ہے اور کتاب وسنت پر عمل پیرا ہونے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔ بعض لوگ اپنی زندگی کے بڑے بڑے فیصلوں میں عجلت اور جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور مشاورت اور استخارہ کیے بغیر کام کر گزرتے ہیں، جس کی وجہ سے بعد از اں کسی بڑے نقصان یا شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کے بڑے فیصلے صبر اور تحمل سے کرنے چاہئیں اور ان فیصلوں کو کرنے سے قبل مشورہ اور استخارہ کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، تا کہ درست نتیجے پر پہنچا جاسکے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو زندگی کے تمام معاملات میں درست فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تَسْبِیح و تَقْدِیس کے معانی

اس گمان کے اظہار کے ساتھ ساتھ فرشتوں نے بارگاہِ رب العزت میں یہ بھی عرض کیا" وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ " مولا کریم! اس فتنہ وفساد برپا کرنے والی مخلوق کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ۔" وَ نُقَدِّسُ لَكَ " اور تیری پاکیزگی بھی بیان کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم اس کام کے لیے کافی ہیں۔ اس آیت میں جو تسبیح وتقدیس کے الفاظ آئے ہیں۔ تسبیح کے معنی سبحان اللہ کہنا یا سبحان اللہ کا ذکر کرنا یا اس ذات کی زبان قال یا زبان حال سے صفت بیان کرنا ہے جو ہر قسم کے عیب، نقص اور کمزوریوں سے پاک ہے۔ گویا یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی خوبیوں کو مثبت انداز میں بیان کرنے اور اس کی حمد یا تعریف بیان کرنے کے لیے آتا ہے اور تقدیس کے معنی ایسی باتوں کی نفی کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں۔ اور قدوس معنی وہ ذات ہے جو دوسروں کی شرکت کی احتیاج اور شرک جیسی دوسری نجاستوں سے پاک ہو یعنی اضداد اور انداد دونوں سے پاک ہو تسبیح سے حمد بیان کرنا مقصود ہوتا ہے اور تقدیس سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ بیان کرنا۔ الغرض! تحمید کا معنی یہ کہ خوبی کی تمام باتیں اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اور تنزیہہ کا مطلب یہ

ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے نقائص اور عیوب سے پاک ہے۔ وہ ہر قسم کی کمزوریوں اور نقص والی چیزوں سے مبرا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ تمام شریکوں سے پاک ہے۔

اے فرشتو! تم اس راز کو نہیں جانتے

فرشتوں کا یہ جواب سن کر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا"قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ" اے فرشتو! تم اس راز کو نہیں جانتے۔ جو میں جانتا ہوں کیونکہ خلیفہ بنانے میں میری حکمتیں تم پر ظاہر نہیں۔ فرشتوں کا یہ کہنا حسد یا اعتراض کے طور پر نہیں تھا، بلکہ اس کی حقیقت اور حکمت معلوم کرنے کی غرض سے تھا کہ اے رب اس مخلوق کے پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے، جب کہ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد پھیلائیں گے اور خون ریزی کریں گے؟ اگر مقصود یہ ہے کہ تیری عبادت ہو تو اس کام کے لئے ہم تو موجود ہیں، ہم سے وہ خطرات بھی نہیں جو نئی مخلوق سے متوقع ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:" میں وہ مصلحت راجحہ جانتا ہوں جس کی بنا پر ان ذکر کردہ مفاسد کے باوجود میں اسے پیدا کر رہا ہوں، جو تم نہیں جانتے۔ بات یہ ہے کہ انہی انسانوں میں انبیاء بھی ہوں گے، اولیاء بھی اور علماء بھی اور یہ حضرات علمی و عملی دونوں فضیلتوں کے جامع ہوں گے۔ کہ میں نے آدم میں کس قدر کمال اور شرف ودیعت کیا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام مفسدین اور بگاڑ پیدا کرنے والوں سے متعلق ہیں، جیسے: شرعی سزائیں، آخرت میں کافروں اور گنہگاروں پر عذاب، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بعض صفات وہ ہیں جن کا ظہور خطا کاروں سے متعلق ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا غفار ہونا، عَفُو ہونا، ستار ہونا، وغیرہ، اگر ایسی مخلوق نہ ہوتی جس میں نیکوں کے ساتھ برے اور فرمانبرداروں کے ساتھ خطا کار بھی ہوں تو نہ یہ احکامِ الٰہی جاری ہو پاتے اور نہ اللہ تعالیٰ کی ان بلند صفات کا اظہار ہو پاتا؛ اس لئے ایسی مخلوق کا وجود ضروری تھا، جو خیر و شر کے سلسلہ میں امتحان لئے جانے کے لائق ہو اور نیکی اور بدی دونوں کی صلاحیت رکھتی ہو، فرشتے برائی و نافرمانی پر قادر ہی نہ تھے اور جنوں میں نیکی کی صلاحیت نہایت مغلوب تھی؛ اس لئے وہ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے کافی نہیں تھے، غالباً اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کے بارے میں فرمایا کہ میں وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

خلافت کے لئے ضروری شرط/علم کے فضائل
سجدہ تعظیمی

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٣١ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ
الْحَكِيْمُ ۝٣٢ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ
لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝٣٣
وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ
الْكٰفِرِيْنَ ۝٣٤

علم خلوتوں اور تنہائیوں کی عبادت سے افضل ہے

وَعَلَّمَ	اور اُس نے سکھا دیئے	اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ	آدم کو نام	كُلَّهَا	وہ سب
ثُمَّ	پھر	عَرَضَهُمْ	پیش کیا اُنہیں	عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ	فرشتوں پر
فَقَالَ	پس اُس نے کہا	اَنْۢبِـُٔوْنِىْ	تم بتاؤ مجھے	بِاَسْمَآءِ	نام

هٰٓؤُلَآءِ	ان (چیزوں کے)	اِنۡ كُنۡتُمۡ	اگر ہو تم	صٰدِقِيۡنَ(31)	سچے۔

انسان کو فرشتوں سے جو زائد چیز ودیعت کی گئی تھی۔ وہ تھی زمین کی اشیاء کے نام، ان کے خواص، ان خواص کا علم ہونے سے آگے نامعلوم باتوں تک پہنچنے (تحقیق یا استنباط) کی قوت و استعداد، زمین میں نظام خلافت کے قیام کے لیے یہ قوت انتہائی ضروری تھی جو فرشتوں میں نہیں تھی۔ عربی زبان میں 'اسم' صرف نام ہی کو نہیں ؛ بلکہ علامہ راغب اصفہانی کے بہ قول اس کو کہتے ہیں جس سے کسی شئ کی ذات کی معرفت حاصل ہو۔'' اس لئے مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو صرف اشیاء کے نام ہی نہیں ؛ بلکہ ان کے حقائق و خواص بھی بتا دیئے گئے تھے ؛ گویا آج تک کائنات کی جن پوشیدہ حقیقتوں سے پردہ اٹھتا جاتا ہے اور ان جانی باتیں علم کی روشنی میں آتی جاتی ہیں وہ اُسی علم کا ظہور ہیں، جو بارگاہِ ربانی سے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا ہوا تھا، ویسے غور کیا جائے تو چیزوں کو نام سے موسوم کرنا بھی انسان ہی کی خصوصیت ہے، دوسری مخلوقات اس سے محروم ہیں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس لئے اس آیت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واسطہ سے بنی آدم ہی کو ناموں کے ذریعہ چیزوں کی شناخت اور تعیین کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے فرشتوں پر افضل ہونے کا سبب ''علم'' ظاہر فرمایا: اس سے معلوم ہوا کہ علم خلوتوں اور تنہائیوں کی عبادت سے افضل ہے۔ حضرت ابو ذر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ فرماتے ہیں: حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے مجھ سے ارشاد فرمایا ''اے ابو ذر! رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ تمہارا اس حال میں صبح کرنا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی کتاب سے ایک آیت سیکھی ہو، یہ تمہارے لئے 100 رکعتیں نفل پڑھنے سے بہتر ہے اور تمہارا اس حال میں صبح کرنا کہ تم نے علم کا ایک باب سیکھا ہو جس پر عمل کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو، تو یہ تمہارے لئے 1000 نوافل پڑھنے سے بہتر ہے۔ (ابن ماجہ، کتاب السنّۃ، باب فی فضل من تعلّم القرآن وعلّمہ، ۱ / ۱۴۲، الحدیث: ۲۱۹) حضرت حذیفہ بن یمان رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد

فرمایا ''علم کی فضیلت عبادت کی فضیلت سے زیادہ ہے اور تمہارے دین کی بھلائی تقویٰ (اختیار کرنے میں) ہے۔(معجم الاوسط من اسمہ علی، ۳ / ۹۲، الحدیث: ۳۹۶۰)''اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ'' کے اصل معنی ہیں: ''اگر تم سچے، لیکن فرشتوں سے جھوٹ کا احتمال نہیں کہ وہ جھوٹ بولنے پر قادر ہی نہیں ہیں؛ اس لئے یہاں مراد یہ ہے کہ ''اگر تمہاری بات صحیح ہے'' کیوں کہ عربی زبان میں ''صدق'' کے معنی صواب اور درست کے بھی آتے ہیں۔

عبادت و بندگی مخلوق کی صفت ہے اور علم خود خالق تعالیٰ کی

قَالُوْا	اُنہوں نے کہا	سُبْحٰنَكَ	پاک ہے تو	لَا عِلْمَ	کوئی علم نہیں
لَنَآ	ہمارے لئے	اِلَّا	مگر	مَا عَلَّمْتَنَا	جوتو نے سکھایا ہمیں
اِنَّكَ	بیشک تو	اَنْتَ الْعَلِیْمُ	تو ہی خوب جاننے والا		
الْحَكِیْمُ (32)	خوب حکمت والا ہے۔				

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کو صرف انہی امور کا علم دیا گیا ہے جن پر وہ مدبرات امر کی حیثیت سے مامور ہیں۔مثلاً بادلوں اور پانی کا فرشتہ، پانی کے متعلق تو جملہ معلومات رکھتا ہے مگر دوسری تمام اشیاء کے افعال و خواص سے بالکل بیخبر ہے۔یہی حال دوسرے فرشتوں کا ہے۔ جبکہ انسان کو تمام اشیاء کا سرسری علم دیا گیا تھا۔پھر وہ تحقیق اور جستجو کے ذریعہ اس میں ازخود اضافہ کرسکتا ہے۔اصل میں فرشتوں کا علم محض تقلیدی ہے، وہ استنباط کی صلاحیت سے محروم ہیں اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے اجتہاد و استنباط کی صلاحیت سے نوازا ہے؛ اس لئے وہ معلومات میں غور کر کے نامعلوم باتوں کو بھی اخذ کرلیتا ہے۔اسی طرح زمین میں احکام الٰہی کو جاری کرنے کے لئے علم وفہم بھی مطلوب ہے، محض صالحیت کافی نہیں؛ بلکہ صلاحیت بھی ضروری ہے، ہم اس حکمت سے واقف نہیں تھے، اس سے عبادت پر علم کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ عبادت میں تو فرشتے بڑھ کر تھے، انسان کو یہ مقام علم ہی کی وجہ سے حاصل ہوا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت و بندگی مخلوق کی صفت ہے اور علم خود خالق تعالیٰ کی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی برتری کا ایک نمایاں مظہر

قَالَ	اللہ نے فرمایا	يٰۤاٰدَمُ	اے آدم	اَنْۢبِئْهُمْ	تو خبر دے اِنہیں
بِاَسْمَآئِهِمْ	اُن کے ناموں کی	فَلَمَّا	پھر جب	اَنْۢبَاَهُمْ	اُس نے خبر دی اُنہیں
بِاَسْمَآئِهِمْ	اُن کے ناموں کی	قَالَ	اللہ نے فرمایا	اَلَمْ	کیا نہیں
اَقُلْ لَّكُمْ	میں نے کہا تھا تم سے	اِنِّیْۤ	بیشک میں	اَعْلَمُ	میں جانتا ہوں
غَيْبَ	چھپی ہوئی باتیں	السَّمٰوٰتِ	آسمانوں کی		
وَالْاَرْضِ	اور زمین کی	وَاَعْلَمُ	اور میں جانتا ہوں	مَا تُبْدُوْنَ	جو تم ظاہر کرتے ہو
وَمَا	اور جو	كُنْتُمْ ہو تم	تَكْتُمُوْنَ(33)	سب چھپاتے۔	

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو، جنہیں اس نے تمام چیزوں کے نام سکھا دیے تھے، حکم دیا کہ وہ فرشتوں کے سامنے ان چیزوں کے نام بیان کریں، تاکہ آدم کی فضیلت اور علم کا وہ پہلو ظاہر ہو جائے جس کا علم فرشتوں کو نہ تھا۔ آدم علیہ السلام نے جب ملائکہ کو ان تمام چیزوں کے نام بتا دیے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ فرمایا کہ اسی علمِ غیب اور حکمت کی بنا پر اس نے آدم کو خلافت کے لیے چن لیا۔ یہ آیت انسان کو اللہ کی عطا کردہ علم کی فضیلت، اور فرشتوں کے مقابلے میں آدم کی برتری کا ایک نمایاں مظہر دکھاتی ہے۔ جب فرشتوں کو آدم کے ہمہ علمی احاطہ کا علم ہو گیا اور انہوں نے اپنے عجز علمی کا اعتراف کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو وہ بات بتا دی جو وہ نہیں جانتے تھے اور وہ یہ تھی کہ انسان میں اگر فتنہ و شر کا پہلو ہے تو صلاح و خیر کا پہلو بھی موجود ہے اور صلاح و خیر کا پہلو غالب ہے۔ اسی لیے اسے خلیفہ بنایا جا رہا ہے اور وہ اپنے علمی کمال کی وجہ سے اس کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔ اس قصہ سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ علم عبادت سے افضل ہے۔ عبادت کا تعلق صرف مخلوق سے ہے۔ جب کہ علم کا تعلق خالق و مخلوق دونوں سے اور سب سے بڑا عالم اور علیم تو خود اللہ تعالیٰ ہے۔ بلاشبہ انسان فرشتوں جیسی اور جتنی عبادت نہیں کر سکتا۔ تاہم علم کی بنا پر فرشتوں سے افضل اور مستحق خلافت قرار پایا۔

سجدہ سے مراد اور اس کے احکام

وَاِذۡ	اور جب	قُلۡنَا	ہم نے کہا	لِلۡمَلٰٓئِكَةِ	فرشتوں سے
اسۡجُدُوۡا	تم سجدہ کرو	لِاٰدَمَ	آدم کو	فَسَجَدُوۡٓا	تو سب نے سجدہ کیا
اِلَّآ	سوائے	اِبۡلِيۡسَ	ابلیس کے	اَبٰى	اُس نے انکار کیا
وَاسۡتَكۡبَرَ	اور تکبر کیا	وَكَانَ	اور وہ ہوگیا		
مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ(34)	کافروں میں سے۔				

سجدہ سے کیا مراد ہے؟ بعض حضرات کی رائے ہے کہ اس سے پیشانی کا زمین پر رکھنا مراد نہیں؛ بلکہ محض حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بڑائی اور جلالت شان کو تسلیم کرنا مراد ہے؛ اس لئے کہ عربی زبان میں ''سجود'' کے معنیٰ ''خضوع وتذلل'' کے بھی آتے ہیں، دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے سجدہ کی مخصوص صورت یعنی پیشانی کا زمین پر رکھنا ہی مراد ہے؛ لیکن یہ سجدہ عبادت و بندگی کے طور پر نہ تھا کہ یہ تمام شریعتوں میں اللہ کے ماسوا کے لئے حرام رہا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ عبادت کا سجدہ نہیں تھا، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت تو شرک ہے، جس کی اجازت کسی بھی امت میں نہیں تھی، پھر اللہ تعالیٰ فرشتوں کو شرک کا حکم کیسے دے سکتا تھا، بلکہ یہ تعظیم کا سجدہ تھا، جو پہلی امتوں میں جائز تھا، ہماری امت میں حرام ہے، جیسا کہ بعض پہلی امتوں میں بہن سے نکاح جائز تھا، اب حرام ہے۔؛ بلکہ احترام و تعظیم کا سجدہ مراد ہے، جو پہلی اُمتوں میں جائز تھا، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ سے ظاہر ہے (یوسف: ۱۰۰) اور شریعت محمدی میں اسے بھی حرام فرما دیا گیا؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ کے ماسوا کو سجدہ کی گنجائش ہوتی تو میں بیویوں کو حکم دیتا کہ شوہروں کو سجدہ کریں، (مشکوٰۃ مع المرقاۃ: ۶/ ۲۷۲) ایک رائے یہ بھی ہے کہ سجدہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ ہی کو کیا تھا اور حضرت آدم کی حیثیت قبلہ کی تھی۔ (تفسیر آیات الأحکام لمحمد علی السائس: ۱/ ۶۰) ایک صحابی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا۔ کہ حضرت! ہم باہر جا کر دیکھتے ہیں کہ وہاں کے لوگ اپنے بادشاہوں کو سجدہ کرتے ہیں، حالانکہ وہ تو باطل ہیں۔ اور آپ نبی برحق ہیں۔ تو ہم

آپ کے سامنے کیوں سجدہ نہ کریں۔حضور ﷺ نے منع فرمادیا اور کہا کہ دیکھو بھائی! جب میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا تو کیا تم میری قبر پر سجدہ کروگے۔تو اس شخص نے کہا۔حضور! ہم ایسا نہیں کریں گے۔آپ ﷺ نے فرمایا جس طرح میری قبر پر سجدہ حرام ہے۔اسی طرح میرے سامنے سجدہ کرنا آج بھی حرام ہے خواہ تعظیمی ہی کیوں نہ ہو۔مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ بیان القرآن فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے قبر کو سجدہ کیا تو اس کو کفر اور شرک تو نہیں کہیں گے مگر اس کے حرام ہونے میں سب کا اتفاق ہے۔اور اگر اس سجدہ سے مراد وہی سجدہ ہے جو بندے اپنے رب کے سامنے کرتے ہیں۔تو ایسا کرنے والا کافر اور مرتد ہو جائے گا۔اور اگر محض تعظیم کے لیے قبر۔بادشاہ یا استاد کے سامنے کیا ہے۔تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آئمہ دین، علمائے کرام اور سلف صالحین کا متفقہ فتویٰ ہے کہ اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں۔اگرچہ کفر کے درجے تک نہیں پہنچتا۔یہاں پر ایک اور مسئلہ بھی سمجھ لیں۔آپ کے مشاہدہ میں بھی شاید آیا ہو کہ آج کل کے بعض مرید اپنے پیروں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں۔بلاشبہ یہ مشرکانہ فعل ہے۔اگر نیت عبادت کی تھی۔تو سجدہ کرنے والا کافر ہو گیا۔اور اگر عبادت کی نیت نہ بھی تھی۔محض تعظیم مقصود تھی تو اس کے حرام ہونے میں کسی عالم کو، کسی بزرگ کو اختلاف نہیں۔بعض فرماتے ہیں کہ یہ بھی شرک ہے۔اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔اور جو ایسا کرتا ہے اس کو روکنا چاہیے۔

حسد اولین گناہ

حسد اولین گناہ ہے: مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں (1۔تفسیر عزیزی فارسی پارہ 1 ص 175) کہ ابن منذر (رح) نے عبادۃ بن ابی امیہ سے ایک روایت بیان کی ہے۔کہ اس کائنات میں سب سے پہلا گناہ حسد تھا۔جو ابلیس نے آدم (علیہ السلام) پر کیا۔اور کہا "اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ" میں اس سے بہتر ہوں "وَخَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔لہٰذا میں اس سے افضل ہوں۔میں کیوں اس کو سجدہ کروں۔یہی ابلیس کی بھول تھی کہ اس نے اپنی شخصیت کی طرف دیکھا۔اللہ تعالیٰ کے حکم پر نگاہ نہ ڈالی۔لہٰذا مردود ٹھہرا۔اس سے ثابت ہوا

کہ جو کوئی بھی خدا تعالیٰ کے حکم کا انکار کرے گا۔ وہ ابلیس کی طرح کافر ہو جائے گا۔ابلیس نے حسد کی وجہ سے آدم (علیہ السلام) کو سجدہ نہ کیا۔ "وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ" اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ کفر کرنے والا تھا۔ كَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ کا ترجمہ دونوں طریقہ سے کیا گیا ہے: 'شیطان کافروں میں سے ہو گیا' اور 'شیطان کافروں میں سے تھا' یعنی وہ بہ باطن کفر کو چھپائے ہوئے تھا اور یہ بات پہلے ہی سے خدائے علیم وخبیر کے علم میں تھی، دوسرا ترجمہ الفاظِ قرآن سے زیادہ قریب ہے۔

سجدے کی دو قسمیں

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ (1)......سجدے کی دو قسمیں ہیں: (۱) عبادت کا سجدہ (۲) تعظیم کا سجدہ۔ "عبادت کا سجدہ" کسی کو معبود سمجھ کر کیا جاتا ہے اور "تعظیم کا سجدہ" وہ ہوتا ہے جس سے مسجود (یعنی جسے سجدہ کیا جائے اس) کی تعظیم مقصود ہوتی ہے۔(2)......یہ قطعی عقیدہ ہے کہ "سجدۂ عبادت" اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے کسی اور کے لیے نہیں ہوسکتا اور نہ کسی شریعت میں کبھی جائز ہوا۔(3)...... فرشتوں نے حضرت آدم عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کو تعظیمی سجدہ کیا تھا اور وہ باقاعدہ پیشانی زمین پر رکھنے کی صورت میں تھا، صرف سر جھکانا نہ تھا۔(4)...... تعظیمی سجدہ پہلی شریعتوں میں جائز تھا ہماری شریعت میں منسوخ کر دیا گیا اب کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔لہٰذا کسی پیر یا ولی یا مزار کو تعظیمی سجدہ کرنا حرام ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ہر قسم کے مشرکانہ فعل سے ہماری حفاظت فرمائے، آمین۔

شجر ممنوعہ/حضرت آدم (علیہ السلام) کی توبہ/توبہ کا مفہوم اور اس کے ارکان

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا
هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝٣٥ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا
فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى
حِيْنٍ ۝٣٦ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝٣٧ قُلْنَا
اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝٣٨ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰۤئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۝٣٩

خطائے اجتہادی گناہ نہیں ہوتی

وَقُلْنَا	اور ہم نے کہا	يٰۤاٰدَمُ	اے آدم	اسْكُنْ	تو رہ
اَنْتَ وَزَوْجُكَ	تو اور تیری بیوی	الْجَنَّةَ	جنت میں	وَكُلَا	اور تم دونوں کھاؤ
مِنْهَا	اُس سے	رَغَدًا	اطمینان سے	حَيْثُ	جہاں سے

شِئۡتُمَا	تم دونوں چاہو	وَلَا	اور مت	تَقۡرَبَا	تم دونوں قریب جاؤ
هٰذِهِ الشَّجَرَةَ		اِس درخت کے		فَتَكُوۡنَا	(ورنہ) پھر تم ہو جاؤ گے
مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ(35)			ظالموں میں سے۔		

حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے شیطان مردود ہوا تھا لہٰذا وہ حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو نقصان پہنچانے کی تاک میں رہا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اور حضرت حوا رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہا سے فرمایا کہ جنت میں رہو اور جہاں دل کرے بے روک ٹوک کھاؤ البتہ اِس درخت کے قریب نہ جانا۔ شیطان نے انہیں وسوسہ ڈالا اور کہنے لگا کہ تمہیں تمہارے رب عَزَّ وَجَلَّ نے اس درخت سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تم ہمیشہ زندہ رہنے والے نہ بن جاؤ اور اس کے ساتھ شیطان نے قسم کھا کر کہا کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔ اس پر انہیں خیال ہوا کہ اللہ پاک کی جھوٹی قسم کون کھا سکتا ہے، اس خیال سے حضرت حوا رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہا نے اس میں سے کچھ کھایا پھر حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو دیا تو انہوں نے بھی کھالیا اور یہ خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی ممانعت تحریمی نہ تھی بلکہ تنزیہی تھی یعنی حرام قرار دینے کیلئے نہ تھی بلکہ ایک ناپسندیدگی کا اظہار تھا۔ یہاں حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے اجتہاد میں خطا ہوئی اور خطائے اجتہادی گناہ نہیں ہوتی۔ چنانچہ شیطان کے دھوکے کی وجہ سے انہوں نے اس ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا اور پھل کھاتے ہی ان کے پردے کے مقام بے پردہ ہو گئے اور وہ اسے چھپانے کیلئے ان پر پتے ڈالنے لگے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا؟ اور میں نے تم سے یہ نہ فرمایا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟ اس کے بعد حکمِ الٰہی ہوا کہ تم زمین پر اتر جاؤ۔ اب تمہاری اولاد آپس میں ایک دوسرے کی دشمن ہو گی اور تم ایک خاص وقت تک زمین میں رہو گے۔ زمین پر تشریف آوری کے بعد حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام ایک عرصے تک اپنی لغزش کی معافی مانگتے رہے حتّٰی کہ آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے چند کلمات سکھائے گئے، پھر جب آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے ان کلمات

کے ساتھ توبہ ومعافی کی درخواست کی تو وہ قبول ہوئی۔

شریعت میں سدِ ذرائع کا بنیادی مفہوم

وَلَا تَقْرَبَا اس درخت کے کھانے سے بچنے کے لیے اس کے قریب جانے سے بھی منع فرما دیا۔اس سے شریعت کا قاعدہ سد ذرائع ثابت ہوتا ہے، یہ اصول فقہ کی ایک اصطلاح ''سدّ ذرائع'' کہلاتی ہے،لغوی معنی: 'سد کے معنی روکنے یا بند کرنے کے ہیں، اور 'ذرائع جمع ہے 'ذریعہ کی، جس کا مطلب ہے وسیلہ یا راستہ، اصطلاحی مفہوم: ایسے تمام راستوں، ذرائع اور وسیلوں کی روک تھام کرنا جو بظاہر جائز یا بے ضرر ہوں، لیکن ان کا انجام لوگوں کو برائی، گناہ یا کسی شرعی نقصان تک پہنچا دے، یعنی ایسا جائز کام جو بذات خود برا نہ ہو لیکن اس کا جواز کسی حرام یا مُفسِد کا سبب بنتا ہو۔مطلب یہ ہے کہ جو چیز حرام کا ذریعہ بنتی ہے اس سے بچنا بھی ضروری ہے۔مثلاً 1 زنا سے بچنے کے لیے اس کے قریب جانے سے بھی منع فرما دیا(وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى)[بنی اِسرائیل:32]''اور زنا کے قریب مت جاؤ۔''حرام سے بچنے کے لیے مشتبہات یعنی شبہ والی چیزوں سے بچنے کا حکم دیا۔) یاد رہے کہ انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو ظالم کہنا گستاخی اور توہین ہے اور جو انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو ظالم کہے وہ کافر ہے۔اللہ تعالیٰ مالک اور مولیٰ ہے، وہ اپنے مقبول بندوں کے بارے میں جو چاہے فرمائے، کسی دوسرے کی کیا مجال کہ وہ انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے متعلق کوئی خلافِ ادب کلمہ زبان پر لائے اور اللہ تعالیٰ کے اس طرح کے خطابات کو اپنی جرأت و بیباکی کی دلیل بنائے۔اس بات کو یوں سمجھیں کہ بادشاہ کے ماں باپ بادشاہ کو ڈانٹیں اور یہ دیکھ کر شاہی محل کا جمعدار بھی بادشاہ کو انہی الفاظ میں ڈانٹنے لگے تو اس احمق کا کیا انجام ہوگا؟ ہمیں تو انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اور محبوبانِ خدا کی تعظیم وتوقیر اور ادب واطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور ہم پر یہی لازم ہے۔اس آیت سے یہ باتیں معلوم ہوئی کہ: 1 معلوم ہوا کہ کھانا پینا اور ازدواجی تعلق تقویٰ و بزرگی اور دینی کمالات کے منافی نہیں ہے۔2 اس درخت کا نام نہ قرآن میں مذکور ہے نہ صحیح حدیثوں میں، عوام میں جو گیہوں مشہور ہوگیا ہے، اس کی کوئی معتبر دلیل نہیں ہے۔4 ظلمٌ کا لفظ قرآن مجید میں

متعدد جگہ گناہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، گناہ پیغمبر کے شایانِ شان نہیں؛ اسی لئے 'خطا کار' کے لفظ سے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں ظلم سے مراد اللہ رب العزت کی نافرمانی بھی ہے اور اپنے نفس پر زیادتی بھی جس کی وجہ سے جنت سے نکلنا پڑا۔

انبیاء معصوم ہوتے ہیں، یہی علماء اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے

فَاَزَلَّهُمَا	پس ورغلایا اُن دونوں کو	الشَّيْطٰنُ	شیطان نے		
عَنْهَا	اُس سے	فَاَخْرَجَهُمَا	پس نکلوا دیا اُن دونوں کو	مِمَّا	(اُس) سے جو
كَانَا	وہ دونوں تھے	فِيْهِ	اُس میں	وَقُلْنَا	اور ہم نے کہا
اهْبِطُوْا	تم اُتر جاؤ	بَعْضُكُمْ	تمہارا بعض	لِبَعْضٍ	بعض کیلئے
عَدُوٌّ	دشمن ہے	وَلَكُمْ	اور تمہارے لئے	فِي الْاَرْضِ	زمین میں
مُسْتَقَرٌّ	ٹھکانا	وَّمَتَاعٌ	اور فائدہ اٹھانا ہے	اِلٰى حِيْنٍ (36)	ایک وقت تک۔

یعنی شیطان نے انہیں بہکا کر اس درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کر دیا اور بہانہ یہ بنایا کہ یوں تو یہ درخت بڑا مفید ہے کیونکہ اس کو کھانے سے ابدی زندگی حاصل ہو جاتی ہے؛ لیکن شروع میں آپ کو اس لئے منع کیا گیا تھا کہ آپ کی جسمانی کیفیت اس کو برداشت نہ کر سکتی تھی اب چونکہ آپ جنت کے ماحول کے عادی ہو گئے ہیں اور آپ کے قوی مضبوط ہو چکے ہیں اس لئے اب وہ ممانعت باقی نہیں رہی 'عَنْهَا'، کے دو معنی کئے گئے ہیں اور دونوں کی گنجائش ہے: اول یہ کہ اس سے 'جنت' مراد لی جائے، دوسرے اس سے وہی ممنوع درخت مراد لیا جائے، آیت میں اس سے پہلے دونوں ہی کا ذکر آیا ہے، ہندوستان کے اہل علم میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمہ اللہ نے پہلا معنی مراد لیا ہے اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے دوسرا۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام معصوم ہوتے ہیں، کبیرہ گناہ اور ایسا صغیرہ گناہ جو مروت و شرافت کے خلاف سمجھا جاتا ہو، کا صدور بالاتفاق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے نہیں ہو سکتا، البتہ لغزشوں اور خلافِ اولیٰ باتوں کا صدور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بھی ہو سکتا ہے، یہی اکثر علماء اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ

والسلام سے ان کے صدور کی حکمت یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے انسان اور بشر ہونے کا پہلو اُمت کے ذہن میں باقی رہے اور وہ ان کی شان کے بارے میں افراط اور مبالغہ سے کام نہ لیں، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اس درخت کے پھل سے کھانا، حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قبل از وقت نینویٰ سے ہجرت کر جانا، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بلا ارادہ ایک قبطی کو قتل کر دینا اور آپ ﷺ کا ایک موقع پر ''انشاء اللہ'' کہنا بھول جانا اسی قبیل سے ہے، اُمت کی تو ایسی لغزشیں بارگاہِ خداوندی میں یوں ہی معاف ہیں، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان اور ان کے مقام کے لحاظ سے اتنی معمولی بھول چوک پر بھی گرفت ہو جاتی ہے، بہر حال شیطان کی وسوسہ اندازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وسوسہ اندازی نے'' فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ''ان دونوں کو اسی جگہ یعنی جنت سے نکال دیا جس کے اندر وہ تھے۔'' وَقُلْنَا اهْبِطُوْا ''اور'' ہم ''نے کہا اتر جاؤ''بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ'' بعض تمہارے بعض کے دشمن ہیں۔ شیطان تمہارا دشمن ہے اور تم اس کے دشمن ہو۔''وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ'' اور زمین میں تمہارے لیے ٹھکانا ہے۔ اب تمہاری رہائش زمین پر ہوگی۔ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ'' اور ایک مدت تک فائدہ اٹھانا ہے۔ یعنی تمہاری اصل رہائش گاہ زمین ہی ہوگی۔ البتہ اگر زمین کو چھوڑ کر کہیں فضاؤں یا سمندروں میں جاؤ گے تو وہ عارضی قیام گاہ ہوگا۔ مستقل قیام زمین پر ہی کرو گے۔ دوسری جگہ فرمایا'' مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ''اے انسان! ہم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا۔ اسی میں لوٹائیں گے۔ اور پھر قیامت کو دوسری مرتبہ اسی سے نکالیں گے۔ اسی لیے یہاں پر فرمایا، کہ اے آدم اور حوا تم یہاں سے زمین پر اتر جاؤ ایک خاص مدت تک وہی تمہارا ٹھکانا ہوگی۔

میت کی تدفین کے بعد ایک مستحب عمل

یہاں ایک بات یاد رہے کہ جب کسی مسلمان کو انتقال کے بعد دفن کر دیا جائے اور اس کی قبر پر تختے لگانے کے بعد مٹی دی جائے تو اس وقت مستحب یہ ہے کہ اس کے سرہانے کی طرف دونوں ہاتھوں سے تین بار مٹی ڈالیں۔ پہلی بار کہیں'' مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ '' دوسری بار '' وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ ''

اور تیسری بار " وَ مِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰی " کہیں۔(عالمگیری، کتاب الصلاۃ، الباب الحادی والعشرون فی الجنائز، الفصل السادس، ۱/۱۶۶)

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو توبہ کے کلمات بھی سکھا دیئے

فَتَلَقّٰۤی	پھر خوب سیکھ لئے	اٰدَمُ	آدم نے	مِنۡ رَّبِّهٖ	اپنے رب سے
كَلِمٰتٍ	چند کلمات	فَتَابَ	پس متوجہ ہوا	عَلَيۡهِ	اُس پر
اِنَّهٗ هُوَ	بیشک وہ	التَّوَّابُ	وہی توبہ قبول کرنے والا	الرَّحِيۡمُ	بڑا مہربان ہے۔

یعنی یہ پہلی توبہ تھی، جو کسی انسان کو اپنے رب کریم سے طلب کرنی تھی؛ اس لئے خداوند کریم ہی نے حضرت آدم کو توبہ کے کلمات بھی سکھا دیئے، حضرت آدم عَلَيۡهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے اپنی دعا میں وہ کلمات عرض کئے جو سورہ اعراف میں ہیں: رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ "اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو نے ہماری مغفرت نہ فرمائی اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ضرور ہم نقصان والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

اس کے علاوہ حدیث میں ان دعائیہ کلمات کا ذکر ہے جن کے ذریعے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی نتیجہ یہ ہوا کہ " فَتَابَ عَلَيۡهِ " اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا۔ آدم (علیہ السلام) کی طرف مہربانی کے ساتھ" تاب" کا معنی رجوع کرنا ہے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے رجوع کیا، گویا توبہ کی صفت کا تعلق خالق اور مخلوق دونوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں "تُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گناہوں کو چھوڑ دو اور عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ اس سے معافی مانگو۔ "اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ "۔ بیشک وہ رجوع کرنے والا بڑا مہربان ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی لغزش کو معاف کر دیا۔

خوف اور حزن سے مراد

قُلۡنَا	ہم نے کہا	اهۡبِطُوۡا	تم اُتر جاؤ	مِنۡهَا	اُس سے	جَمِيۡعًا	سب کے سب

فَاِمَّا	پھر جب	يَاْتِيَنَّكُمْ	وہ ضرور آئے تمہارے پاس				
مِّنِّيْ	میری طرف سے	هُدًى	ہدایت	فَمَنْ	تو جس نے		
تَبِعَ	پیروی کی	هُدَايَ	میری ہدایت کی	فَلَا	پس نہ	خَوْفٌ	کوئی خوف ہوگا
عَلَيْهِمْ	اُن پر	وَلَا هُمْ	اور نہ وہ	يَحْزَنُوْنَ(38)	سب غمگین ہونگے۔		

گویا توبہ قبول ہونے کے بعد بھی انسان کے لئے زمین میں قیام پذیر ہونے کا حکم باقی رہا کیوں کہ اس کے بغیر انسان کو زمین کی خلافت سونپنے کا مقصد حاصل نہ ہوسکتا تھا۔کسی تکلیف دہ بات کے پیش آنے سے پہلے جو گھبراہٹ اور اندیشہ ہوتا ہے، اس کو 'خوف' اور پیش آنے کے بعد جو دکھ اور صدمہ ہوتا ہے، اسے 'حزن' کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ راہِ حق کی پیروی کرنے والوں کو نہ مستقبل کا کوئی خوف ہونا چاہئے اور نہ گذرے ہوئے حالات پر کوئی رنج۔

اللہ کی نازل کردہ نشانیوں کو جھٹلانے کا انجام

وَالَّذِيْنَ	اور جنہوں نے	كَفَرُوْا	کفر کیا	وَكَذَّبُوْا	اور اُنہوں نے جھٹلایا
بِاٰيٰتِنَآ	ہماری آیات کو	اُولٰۗىِٕكَ	وہ (لوگ)	اَصْحٰبُ النَّارِ	دوزخ والے
هُمْ	وہ سب	فِيْهَا	اس میں	خٰلِدُوْنَ(39)	ہمیشہ رہنے والے ہیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے سے انکار کرنے (کفر) اور اللہ کی نازل کردہ نشانیوں کو جھٹلانے کا انجام بیان فرمایا ہے۔ان کا ٹھکانہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ ہے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

'آیات' کے معنی احکام الٰہی کے بھی ہوسکتے ہیں اور اللہ کی اُن نشانیوں کے بھی، جو کائنات میں بکھری پڑی ہیں اور اپنی زبانِ حال سے ہر لمحہ اور ہر آن خدا کے وجود اور اس کی توحید کی گواہی دے رہی ہیں۔معلوم ہوا کہ جیسے اہل جنت ہمیشہ کے لئے جنت میں رہیں گے، اسی طرح دوزخی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، یہی اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے۔

بنی اسرائیل پر انعامات/ بنی اسرائیل کا کتاب اللہ سے سلوک/تلبیس اور کتمان حق

أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ
وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝۴۰ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠
وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝۴۱ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ
وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴۲

بنی اسرائیل کو خصوصی خطاب

يٰبَنِيْٓ	اے اولادِ	اِسْرَآءِيْلَ	اسرائیل	اذْكُرُوْا	تم یاد کرو
نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ	میری نعمت جو	اَنْعَمْتُ	میں نے انعام کی	عَلَيْكُمْ	تم پر
وَاَوْفُوْا	اور تم پورا کرو	بِعَهْدِيْٓ	میرے عہد کو		
اُوْفِ	اور میں پورا کروں گا	بِعَهْدِكُمْ	تمہارے عہد کو		
وَاِيَّايَ	اور صرف مجھ ہی سے	فَارْهَبُوْنِ (40)	پس تم سب ڈرو۔		

اس سے پہلے "یٰاَیُّهَا النَّاسُ" کے ساتھ تمام لوگوں کو دعوت تھی، اب بنی اسرائیل کو خصوصی خطاب ہے، کیونکہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان کا زیادہ حق ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائیں۔ یہ خطاب کبھی انعامات یاد دلا رہے جو ان پر کیے گئے، کبھی ان کی بداعمالیوں پر ڈانٹ کے ساتھ ہے اور کبھی ان سزاؤں کے ذکر کے ساتھ ہے جو ان کی نافرمانیوں پر انہیں دی گئیں۔ یہاں سے لے کر آیت ایک سو سینتالیس تک ان پر دس انعامات، ان کی دس بداعمالیوں اور انہیں دی جانے والی دس سزاؤں کا ذکر رہے۔ (التسہیل) یعنی آیت نمبر 40 سے لے کر آیت نمبر 147 تک کی اکثر آیات میں بنی اسرائیل کے عروج و زوال، عزت و ذلت، اِقبال و اِدبار، جزا و سزا اور قومی و اجتماعی اچھے برے کردار کا تذکرہ ہے۔ پھر اسی بیان کو قرآن پاک میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس بار بار کے تکرار میں ایک بڑی حکمت قوموں کے عروج و زوال اور عزت و ذلت کا فلسفہ سمجھانا اور مسلمانوں کو اس سے عبرت دلانا ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل پیغمبروں کی اولاد ہونے، جلیل القدر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی امت ہونے اور تورات جیسی کتاب پر ایمان رکھنے کے باوجود اپنے اعتقاد و عمل کے بگاڑ پر ذلیل و رسوا اور مغلوب و مقہور ہوئی جبکہ توبہ و رجوع اور نبی و کتاب کی تعلیمات پر عمل کرنے کی صورت میں معزز و غالب ہوئی اسی طرح امت مِسلمہ بھی اپنے عروج و زوال کے اسباب کو اِسی آئینے میں دیکھ سکتی ہے۔

مسلمان مغلوبیت، ذلت اور پستی کا شکار کیوں ہیں؟

آج سب پوچھتے ہیں کہ مسلمان مغلوبیت، ذلت اور پستی کا شکار کیوں ہیں؟ قرآن میں بیان کردہ بنی اسرائیل کا قومی اور اجتماعی کردار اور موجودہ دور کے مسلمانوں کا قومی اور اجتماعی کردار سامنے رکھ کر موازنہ کرلیں۔ خود ہی سمجھ آجائے گا کہ اگر بنی اسرائیل کو کانٹے بونے پر کانٹے ملتے تھے تو ہمیں کانٹے بونے کے بدلے آم کیوں ملیں گے؟ یہود مدینہ میں بکثرت آباد تھے۔ چونکہ سیدنا اسحاق (علیہ السلام) سے لے کر ان میں تقریباً چار ہزار نبی آچکے تھے۔ اس لیے تمام عرب پر ان کے علم و فضل کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے بیشمار انعامات کیئے تھے۔ مگر کچھ مدت

گزرنے پر ان میں بہت سے عیوب پیدا ہو گئے تھے اپنے اس علمی تفوق کی بنا پر اور اس حسد کی بنا پر کہ آنے والا نبی اسحاق کی اولاد سے نہیں، انہوں نے دعوت اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسرائیل کا معنی عبداللہ ہے اور یہ یعقوب (علیہ السلام) کا لقب تھا اور بنو اسرائیل سے مراد ان کی اولاد یا یہودی قوم ہے۔ جن کے لیے تورات نازل ہوئی۔

بنی اسرائیل کے اعمال بد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے بنی اسرائیل کو یہ چیزیں یاد دلائی گئیں، حالانکہ یہ سب کچھ پہلے بنی اسرائیل پر گزرا تھا، کیونکہ ان کے بزرگوں پر انعام ان پر بھی انعام تھا اور وہ اب بھی اپنے بزرگوں کی بدعادتوں میں ان کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ گزشتہ بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ آپ کے زمانے میں موجود بنی اسرائیل کے اعمال بد کا بھی ذکر فرمایا، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچاننے کے باوجود کفر، کتاب اللہ کی تحریف، جبریل علیہ السلام سے عداوت، جادو کرنا، ایک دوسرے کو قتل کرنا وغیرہ۔ بنی اسرائیل کے احوال اتنی تفصیل سے ذکر فرمانے سے یہ بھی مقصود ہے کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان بداعمالیوں سے بچے اور ان کے نتائج سے ڈرتی رہے۔

نِعۡمَتِيَ) اگرچہ یہ لفظ واحد ہے، مگر جنس مراد ہے، جس میں تمام نعمتیں شامل ہیں۔ (**وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِيۡۤ**) یہاں اس عہد کی تفصیل بیان نہیں فرمائی، سورہ مائدہ (12) میں اس عہد کی تفصیل موجود ہے۔ اس کے مطابق ان کا اللہ تعالیٰ سے عہد یہ تھا کہ تم نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ دو گے اور میرے رسولوں پر (جن میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شامل ہیں) ایمان لاؤ گے، ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھا قرض دو گے اور اللہ کا ان سے عہد یہ تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کروں گا اور تمہیں جنتوں میں داخل کروں گا۔ تورات میں یہود سے ہمیشہ احکام خداوندی پر کاربند رہنے کا عہد لیا گیا تھا اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ تھا کہ تم کو تمام قوموں میں ایک خصوصی مقام دیا جائے گا، اسی دوطرفہ عہد کا غالباً یہاں ذکر فرمایا گیا ہے۔ یعنی وہ عہد یہ تھا کہ تم تورات کے احکام کے پابند رہو گے اور میں جو پیغمبر بھیجوں اس پر ایمان لا کر اس کا ساتھ دو گے اور اللہ کا عہد یہ

تھا کہ ملک شام تمہارے قبضہ میں رہے گا۔ بنی اسرائیل نے اس اقرار کو قبول تو کرلیا مگر بعد میں اس پر قائم نہ رہے، بدنیتی کی، رشوت لے کر غلط مسئلے بتائے، حق کو چھپایا۔ آنے والے نبیوں کی اطاعت کے بجائے ان میں سے بعض کو قتل ہی کر ڈالا اور اپنی ریاست جمائی اور تورات میں جہاں کہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی توصیف تھی اسے بھی بدل ڈالا۔

فَارْهَبُوْنِ کا معنیٰ

(وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ) کا معنیٰ "خاص مجھ سے" ہے۔ "فَارْهَبُوْنِ" اصل میں "فَارْهَبُوْنِيْ" تھا۔ "یاء" حذف ہوگئی، اس کا معنیٰ بھی مجھ سے ڈرو ہے۔ "مجھ سے ڈرو" کی وجہ سے "خاص مجھ ہی سے ڈرو۔" ترجمہ کیا گیا ہے، ورنہ خاص کے بعد "مجھ" کا لفظ کافی تھا، مجھی یا مجھ ہی کی ضرورت نہ تھی۔

قرآن پاک کو بحیثیت کلام الٰہی تسلیم کرلو

وَاٰمِنُوْا	اور تم ایمان لاؤ	بِمَآ	اس پر جو	اَنْزَلْتُ	میں نے نازل کیا
مُصَدِّقًا	تصدیق کرنے والا	لِّمَا	(اس) کی جو	مَعَكُمْ	تمہارے پاس ہے
وَلَا تَكُوْنُوْٓا	اور مت تم ہو جاؤ	اَوَّلَ كَافِرٍ	پہلے انکار کرنے والا	بِهٖ	اس کے
وَلَا تَشْتَرُوْا	اور مت تم بیچو	بِاٰيٰتِيْ	میری آیتوں کو		
ثَمَنًا قَلِيْلًا	تھوڑی قیمت میں	وَاِيَّايَ	اور صرف مجھ سے ہی		
فَاتَّقُوْنِ (41)	پس تم ڈرو۔				

بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے مزید فرمایا "وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ" اور جو چیز میں نے نازل کی ہے۔ اس پر ایمان لاؤ۔ اور یہ چیز "مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ" اس چیز کی تصدیق کرتی ہے۔ جو تمہارے پاس موجود ہے یعنی توراۃ اور دیگر سابقہ کتب یہاں پر یہ نکتہ یاد رہے۔ کہ قرآن پاک سابقہ کتب کی ہر چھوٹی بڑی چیز کی تصدیق نہیں کرتا۔ بلکہ اصولی طور پر بعض اہم باتوں کی تصدیق کرتا ہے۔ جس طرح ہر نبی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ سابقہ نبی کی تصدیق کرے مگر

اس کی شریعت اور احکام کی من وعن تصدیق نہیں کرتا کیونکہ بسا اوقات دوسرا نبی پہلے نبی کی بعض چیزیں منسوخ کر دیتا ہے۔اسی طرح قرآن پاک بھی سابقہ کتب کی تصدیق کرتا ہے۔لہٰذا تم اس قرآن پاک کو بحیثیت کلام الٰہی تسلیم کرلو۔اور اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔" وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ اور تم لوگ قرآن پاک کے اولین منکرین نہ بن جاؤ۔بِهٖ" کی ضمیر قرآن کی طرف، یا حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف ہے۔دونوں ہی قول صحیح ہیں کیونکہ دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔جس نے قرآن کے ساتھ کفر کیا، اس نے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کفر کیا اور جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کفر کیا، اس نے قرآن کے ساتھ کفر کیا (ابن کثیر) "پہلے کافر نہ بنو" کا مطلب ہے کہ ایک تو تمہیں جو علم ہے دوسرے اس سے محروم ہیں، اس لئے تمہاری ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ دوسرے، مدینہ میں یہود کو سب سے پہلے دعوت ایمان دی گئی، ورنہ ہجرت سے پہلے بہت سے لوگ قبول اسلام کر چکے تھے۔اس لئے انہیں تنبیہ کی جارہی ہے کہ یہودیوں میں تم اولین کافر مت بنو۔اگر ایسا کرو گے تو تمام یہودیوں کے کفر وجحود کا وبال تم پر پڑے گا۔

تھوڑی قیمت سے مراد دنیا کی حقیر مال ہے

فرمایا" وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا " اور مت خریدو میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت۔تھوڑی قیمت سے مراد دنیا کی حقیر مال ہے۔جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ دنیا کی چار چیزیں ایسی ہیں جن کے پیچھے لوگ مرتے ہیں۔یعنی کھانا، پینا، پہننا اور نکاح کرنا۔مگر حقیقت یہ ہے کہ کھانے کا انجام گندگی اور پینے کا انجام بول ہے۔اچھے سے اچھا لباس بھی کچھ عرصہ بعد پھٹ جاتا ہے۔اور اسے پھینک دیا جاتا ہے رہا نکاح تو اس کی وجہ سے انسان طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہوتا اور اذیتیں برداشت کرتا ہے یہ چاروں چیزیں عقیدے کو فاسد اور دین کو بگاڑنے والی ہیں۔مگر لوگ ان حقیر اشیاء کے حصول کے لیے قیمتی اور اعلیٰ چیز یعنی ایمان کو خراب کر لیتے ہیں۔" تھوڑی قیمت پر فروخت نہ کرو" کا یہ مطلب نہیں کہ زیادہ معاوضہ مل جائے تو احکام الٰہی کا سودا کرلو۔بلکہ مطلب یہ ہے کہ احکام الٰہی کے مقابلے میں دنیاوی مفادات کو اہمیت نہ دو۔احکام

الٰہی تو اتنے قیمتی ہیں کہ ساری دنیا کا مال و متاع بھی ان کے مقابلے میں ہیچ اور ثمن قلیل ہے۔آیت میں اصل مخاطب اگرچہ بنی اسرائیل ہیں،لیکن یہ حکم قیامت تک آنے والوں کے لئے ہے،جو بھی ابطال حق یا اثبات باطل یا کتمان علم کا ارتکاب اور احقاق حق سے محض طلب دنیا کے لئے،گریز کرے گا وہ اس وعید میں شامل ہوگا۔(فتح القدیر)

فرمایا"وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ"اور مجھ ہی سے ڈرو۔آخرت کی خبرلو۔دنیا کے پیچھے مت پڑو آخرت میں میرے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔حساب و کتاب ہوگا۔اور پھر تمہیں اپنے کیئے کی جزا یا سزا بھگتنا ہوگی۔لہٰذا مجھ سے ڈرتے رہو۔"فَاتَّقُوْن"کے معنیٰ مجھ سے یعنی میرے غضب سے ڈرو"کے بھی کئے گئے ہیں اور"میرے غضب سے بچو"کے بھی،دونوں کی گنجائش ہے۔

حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو

وَلَا تَلْبِسُوا	اور مت تم ملاؤ	الْحَقَّ	حق کو	بِالْبَاطِلِ	باطل کے ساتھ
وَتَكْتُمُوا	اور تم (نہ) چھپاؤ	الْحَقَّ	حق کو	وَاَنْتُمْ	حالانکہ تم
تَعْلَمُوْنَ(42)			سب جانتے ہو۔		

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ"اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو۔(خلط ملط کا بنیادی مطلب کسی چیز کا گڈمڈ،ملا جلا یا درہم برہم ہونا ہے۔یہ دو مختلف الفاظ کا مجموعہ ہے،خلط:(عربی لفظ)جس کا مطلب ملانا یا آمیزش کرنا ہے،ملط:(فارسی/ہندی الاصل)جس کا مطلب بھی گڈمڈ کرنا یا گھلنا ملنا ہے۔)

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ"اور نہ ہی حق کو چھپاؤ"یہ بنی اسرائیل کی عام عادت تھی۔کہ وہ اپنی کتاب میں موجود سچی بات چھپا لیتے تھے۔آگے آئے گا۔کہ یہ لوگ قرآن پاک اور نبی آخر الزمان ﷺ کو اسی طرح پہچانتے تھے۔جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے تھے۔مگر پھر بھی انکار کر دیتے تھے۔یہ لوگ واضح علامات کو بگاڑ کر پیش کرتے تھے۔اور ان میں تحریف کے مرتکب ہوتے تھے۔یہ عیسائی اور یہودی تحریف میں بڑے ماہر ہیں۔خود عیسائیوں کے بڑے بڑے پادریوں نے تسلیم

کیا ہے کہ انجیل میں تین ہزار تحریفیں ہو چکی ہیں (1 ۔تقریر دلپذیر) ظاہر ہے کہ جہاں اس قدر تحریف کا عمل آزمایا گیا ہو۔وہاں کس قدر بگاڑ پیدا ہو گا۔اور جس کتاب کے ساتھ یہ سلوک ہوا ہو۔ اس کا کیا سے کیا بن گیا ہو گا۔

آج کل دین کے ساتھ ہمارا سلوک کیا ہے؟

آجکل دین کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔نہ کسی کو فرائض کی پروا ہے۔اور نہ واجبات کی۔ معمولی معمولی باتوں کو نشانہ بنا کر ان کی تشہیر ہو رہی ہے۔پراپیگنڈا جاری ہے۔تفرقہ بازی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔اور پھر گالی گلوچ تک نوبت پہنچتی ہے۔یہ سب کیا ہے۔بنی اسرائیل کے شیوہ کو اپنایا جا رہا ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا جو بیماریاں۔بنی اسرائیل میں پائی جاتی تھیں۔اے میری امت تم میں بھی وہی بیماریاں عود کر آئیں گی" جس طرح ایک جوتا دوسرے کے مطابق ہوتا ہے۔اسی طرح میری امت کی خرابیاں بنی اسرائیل کی خرابیوں کے مشابہ ہوں گی۔فرمایا حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ۔" وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" اور تم جانتے ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔غرضیکہ اس مقام پر بنی اسرائیل کی خرابیوں کا اجمالاً بیان ہوا ہے اگلے رکوعات میں تفصیل کے ساتھ ایک ایک خرابی کی نشان دہی ہو گی۔آج بھی یہ خطاب موجودہ دور کے بنی اسرائیل کے لیے موجود ہے۔ان کے بڑوں کی خرابیوں کو ان کے سامنے رکھا جا رہا ہے۔اور جو خرابیاں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ان کی نشاندہی بھی ہو رہی ہے۔گویا یہ دعوت الی القرآن ہے کہ " وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ "جس چیز کو میں نے نازل کیا ہے۔یعنی قرآن پاک آؤ آج بھی اس پر ایمان لے آؤ تو فلاح پا جاؤ گے۔قرآن پاک پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے۔اور آخرت نوشتہ اور صحیفہ ہے اس پر ایمان لائے بغیر اور اس کے پیش کردہ پروگرام پر عمل کیے بغیر فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔

باجماعت نماز ادا کرنے کی اہمیت اور فضائل/ پریشانیوں اور مصائب کا علاج

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّكٰوۃَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ
وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ
وَالصَّلٰوۃِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ
وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

نماز اور زکوٰۃ، ہر زمانہ میں دین اسلام کے اہم ارکان

وَاَقِیْمُوا	اور تم قائم کرو	الصَّلٰوۃَ	نماز	وَاٰتُوا	اور تم ادا کرو	الزَّكٰوۃَ	زکوٰۃ
وَارْكَعُوْا	اور تم رکوع کرو	مَعَ الرّٰكِعِیْنَ (43)	رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔				

اس سے پہلی آیات میں یہودیوں کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا، پھر انہیں حق کو باطل کے ساتھ ملانے اور نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی نبوت کے دلائل چھپانے سے منع کیا گیا، اب ان کے سامنے وہ شرعی احکام بیان کئے جارہے ہیں جو ایمان قبول کرنے کے بعد ان پر لازم ہیں، چنانچہ فرمایا گیا کہ اے یہودیو! تم ایمان قبول کر کے مسلمانوں کی طرح پانچ نمازیں ان کے

حقوق اور شرائط کے ساتھ ادا کرو اور جس طرح مسلمان اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اسی طرح تم بھی اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو اور میرے حبیب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اور ان کے صحابہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرو۔ نماز اور زکوٰۃ، ہر زمانہ میں دین اسلام کے اہم ارکان رہے ہیں۔ لیکن یہود میں نماز باجماعت کا اہتمام نہیں تھا اور ان کی نماز میں رکوع بھی نہیں تھا۔ یہود نے نماز ادا کرنا بالکل چھوڑ ہی دیا تھا اور زکوٰۃ ادا کرنے کے بجائے سود کھانا شروع کر دیا تھا۔ اس آیت میں انہیں تنبیہ کی جا رہی ہے۔ کہ اب تمام امور میں نبی آخر الزمان صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی اتباع کرو۔ اس آیت اور اس سے اگلی تین آیات میں خطاب یہود اور مسلمانوں میں مشترک ہے۔ ہماری شریعت میں بھی نماز باجماعت ادا کرنا بہت فضیلت رکھتا ہے اور بلا عذر ترک جماعت کبیرہ گناہ ہے۔ جیسا کہ احادیث سے واضح ہوتا ہے۔ اس آیت میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی ترغیب بھی ہے اور احادیث میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے کثیر فضائل بیان کئے گئے ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے روایت ہے، نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ''جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تنہا پڑھنے سے ستائیس درجہ زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ (بخاری، کتاب الاذان، باب فضل صلاۃ الجماعۃ، ۱ / ۲۳۲، الحدیث: ۶۴۵)

بزرگانِ دین کے نزدیک باجماعت نماز اداء کرنے کی اہمیت

بزرگانِ دین کے نزدیک باجماعت نماز اداء کرنے کی اہمیت کس قدر تھی اس کا اندازہ ان دو حکایات سے لگایا جا سکتا ہے: (1)......حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا فرماتے ہیں کہ ''حضرت عمر فاروق رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ اپنے ایک باغ کی طرف تشریف لے گئے، جب واپس ہوئے تو لوگ نمازِ عصر ادا کر چکے تھے، یہ دیکھ کر آپ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ پڑھا اور ارشاد فرمایا: ''میری عصر کی جماعت فوت ہوگئی ہے، لہٰذا میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میرا باغ مساکین پر صدقہ ہے تاکہ یہ اس کام کا کفارہ ہو جائے۔ (الزواجر عن اقتراف الکبائر، باب صلاۃ الجماعۃ، الکبیرۃ الخامسۃ والثمانون، ۱ / ۳۱۱) (2)......حضرت حاتم

اَصم رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں: ’’ایک مرتبہ میری باجماعت نماز فوت ہوگئی تو حضرت ابو اسحاق بخاری رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ کے علاوہ کسی نے میری تعزیت نہ کی اور اگر میرا بچہ فوت ہو جاتا تو دس ہزار سے زیادہ افراد مجھ سے تعزیت کرتے کیونکہ لوگوں کے نزدیک دینی نقصان دنیوی نقصان سے کم تر ہے۔(احیاء علوم الدین،)

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی بیان القرآن میں فرماتے ہیں کہ یہود کو حب مال اور حب جاہ کی دو ایسی بیماریاں لاحق تھیں۔ جن کی وجہ سے وہ ایمان لانے سے گریز کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی اکثر لوگ انہی دو بیماریوں میں مبتلا ہو کر خیر سے محروم ہو جاتے ہیں۔ حب مال کی بیماری کی شدت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ" مال کی محبت انسان میں فطرۃً بڑی شدید ہے۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ بیشک انسان مال کی محبت اور اس کی طلب میں تو بہت مضبوط اور طاقتور ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور اس کی نعمتوں کا شکرادا کرنے کیلئے کمزور ہے، غافل انسان مال کی محبت کی وجہ سے سخت دل ہے کیونکہ مال کی محبت سختیِ دل کا باعث ہے، جیسے حضور صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کی محبت نرمیِ دل کا سبب ہے دیکھو یزید، فرعون، شداد، جانوروں سے زیادہ سخت دل تھے، محض محبت مال سے یا غافل انسان مال کی محبت میں سخت دل ہے، دین میں نرم (یعنی دین میں سختی برداشت نہیں کرتے)، اسی لئے عام طور پر لوگ دنیا کے لئے وہ مشقتیں جھیل لیتے ہیں جو دین کے لئے نہیں جھیلتے۔

مال سے محبت کی چار صورتیں

خیال رہے کہ محبتِ مال چار طرح کی ہے: (1) حُبّ ایمانی جیسے حج وغیرہ کے لئے مال کی چاہت، (2) حُبّ نفسانی جیسے اپنے آرام و راحت کے لئے مال سے رغبت، (3) حُبّ طُغیانی جیسے محض جمع کرنے اور چھوڑ جانے کے لئے مال سے محبت، (4) حُبّ شیطانی یعنی گناہ و سرکشی کے لئے مال کی محبت۔ یہاں آخری دو محبتیں مراد ہیں، پہلی قسم کی محبت عبادت ہے، حضرت سلیمان عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے فرمایا تھا: ’’اِنِّیْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ‘‘ حضور صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کو

جہاد کے گھوڑوں سے بڑی محبت تھی، چونکہ مال بہت خیر کا ذریعہ ہے، اسی لئے اسے خیر فرمایا گیا۔ صوفیاء کے نزدیک نعمت سے ایسی محبت بری ہے جو دل کو بھر دے کہ مُنعِم کی محبت کی جگہ نہ رہے، وہی یہاں مراد ہے، اندرونِ دل صرف یار کی محبت ہو، وہاں اَغیار نہ ہوں، باقی محبتیں دل کے باہر رہیں، کشتی پانی میں رہے سلامت ہے، اگر پانی کشتی میں آجائے تو ڈوب جائے گی۔

حبّ مال جملہ اَمراض کی جڑ اور بنیاد ہے

دوسری جگہ فرمایا" وَ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا تم جی بھر کر مال سے محبت کرتے ہو۔ جس کی وجہ سے بہت سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ اور یہ حقیقت میں بقیہ جملہ اَمراض کی جڑ اور بنیاد ہے اور وہ ہے مال اور دنیا کی محبت۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ تم مال سے بہت زیادہ محبت کرتے ہو کہ اس کو خرچ کرنا ہی نہیں چاہتے، الغرض فساد کی جڑ یعنی مال کی محبت کی وجہ سے ہر طرح کا بگاڑ پیدا کرتے ہو۔ مال کی محبت انتہائی تباہ کُن ہے: مال کی محبت نہایت تباہ کن ہے، اسی لئے قرآن وحدیث میں اس کی بکثرت مذمت بیان کی گئی ہے۔ اس قسم کی چیزیں بنی اسرائیل کے قبول حق میں مانع تھیں۔ ان بیماریوں کا علاج: ان دو بیماریوں کا علاج اللہ تعالیٰ نے یہ تجویز کیا" وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ " نماز قائم کرو، چنانچہ فرمایا گیا کہ اے یہودیو! تم ایمان قبول کر کے مسلمانوں کی طرح پانچ نمازیں ان کے حقوق اور شرائط کے ساتھ ادا کرو۔ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ " اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اور جس طرح مسلمان اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اسی طرح تم بھی اپنے مالوں کی زکوٰۃ دو یعنی حب جاہ اور حب مال کی بیماری کے لیے نماز اور زکوٰۃ شافی علاج ہے۔ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے غرور، تکبر اور بڑائی کا علاج رکھا ہے۔ جو شخص نماز قائم کرے گا، اس کا مطلب سمجھے گا۔ وہ حب جاہ کی بیماری سے شفایاب ہو جائے گا۔ اسی طرح حب مال کی بیماری کا علاج ادائیگی زکوٰۃ میں ہے۔ اور اس میں بہت سی حکمتیں ہیں منجملہ ان کے بخل دور کرنا بھی ہے۔ چناچہ جب کوئی شخص ہر سال مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ تو وہ بخل کی لعنت سے پاک ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ صرف مقررہ مقدار میں زکوٰۃ ادا کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ فرمایا"

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ " یعنی تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو یہی وہ جذبہ ہے۔ اس آیت میں بھلائی سے مراد تقویٰ اور فرمانبرداری ہے اور خرچ کرنے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنۡہُمَا نے فرمایا کہ "یہاں خرچ کرنے میں واجب اور نفلی تمام صدقات داخل ہیں۔ امام حسن بصری رَحۡمَۃُ اللّٰہِ تعالیٰ عَلَیۡہِ نے فرمایا: جو مال مسلمانوں کو محبوب ہو اسے رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرنے والا اس آیت کی فضیلت میں داخل ہے خواہ وہ ایک کھجور ہی ہو۔ جو مال کی محبت کو کم کر کے بخل سے نجات دلاتا ہے۔ گویا نماز اور زکوٰۃ حب جاہ اور حب مال کی بیماری کا علاج ہے۔

وعظ و نصیحت کرنے والوں کو تنبیہ

اَتَاۡمُرُوۡنَ	کیا تم حکم دیتے ہو	النَّاسَ	لوگوں کو	بِالۡبِرِّ	نیکی کا
وَتَنۡسَوۡنَ	اور تم بھول جاتے ہو	اَنۡفُسَكُمۡ	اپنے آپ کو	وَاَنۡتُمۡ	حالانکہ تم
تَتۡلُوۡنَ	تلاوت کرتے ہو	الۡكِتٰبَ	کتاب	اَفَلَا	کیا پس نہیں
تَعۡقِلُوۡنَ(44)	تم سب عقل کرتے۔				

یعنی لوگوں کو تورات پر عمل کرنے کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو کہ اس میں نبی ﷺ پر ایمان لانے کا حکم بھی موجود ہے۔ (ابن ابی حاتم عن ابن عباس:) حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: "بنی اسرائیل لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نیکی کا حکم دیتے اور خود عمل نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں عار دلائی۔" اب مسلمانوں کا حال بھی بنی اسرائیل جیسا ہو گیا، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جو شخص خود عمل نہ کرے وہ دوسروں کو بھی نیکی کا حکم نہ دے، کیونکہ یہود کو اس بات پر عار دلائی ہے کہ وہ عمل نہیں کرتے، اس پر نہیں کہ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور جو شخص دعوت دے کر خود عمل نہ کرے اسے دوسروں سے زیادہ سزا ملے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا، اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور اس کی انتڑیاں آگ میں نکل کر ڈھیر ہو جائیں گی، وہ ان کے گرد ایسے گھومے گا جیسے گدھا اپنی چکی کے گرد

گھومتا ہے۔آگ والے اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے،اے فلاں !تیرا کیا معاملہ ہے؟ کیا تو ہمیں نیکی کا حکم نہیں دیتا تھا اور ہمیں برائی سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا،میں تمہیں نیکی کا حکم دیتا تھا اور خود وہ کام نہیں کرتا تھا اور تمہیں برائی سے منع کرتا تھا اور خود اس کا ارتکاب کرتا تھا۔" (بخاری) یاد رہے کہ اس آیت کی مراد وعظ ونصیحت کرنے والوں کو تقویٰ و پرہیز گاری پر ابھارنا ہے، بے عمل کو وعظ سے منع کرنا مقصود نہیں ،یعنی یہ فرمایا ہے کہ جب دوسروں کو وعظ ونصیحت کرتے ہو تو خود بھی عمل کرو، یہ نہیں فرمایا کہ جب عمل نہیں کرتے تو وعظ ونصیحت کیوں کرتے ہو؟ کیونکہ عمل کرنا ایک واجب ہے اور دوسروں کو برائی سے روکنا دوسرا واجب ہے۔اگر ایک واجب پر عمل نہیں تو دوسرے سے کیوں رُکا جائے۔(بیضاوی ،البقرۃ،تحت الآیۃ:۴۴، ۱/ ۳۱۶)

نماز،تعلق مع اللہ کا عنوان

وَاسۡتَعِیۡنُوۡا	اور تم مدد طلب کرو	بِالصَّبۡرِ	صبر کے ساتھ
وَالصَّلٰوۃِ	اور نماز کے (ذریعے)	وَاِنَّهَا	اور بیشک وہ
لَکَبِیۡرَۃٌ	البتہ بڑی (بوجھل) ہے	اِلَّا	سوائے
عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ(45)	عاجزی کرنے والوں پر۔		

مصیبت اور پریشانی کی حالت میں صبر اور نماز کو اپنا شعار بنانے کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی یاد میں جس قدر طبیعت مصروف ہو اسی قدر دوسری پریشانیاں خود بخود کم ہو جاتی ہیں۔بعض لوگوں نے یہاں صبر سے روزہ بھی مراد لیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ جب آپ ﷺ کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو خود بھی نماز میں مشغول ہوتے اور اپنے اہل بیت کو بھی اس کی دعوت دیتے تھے۔ "وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ" میں نماز کے ساتھ توسل پکڑنے کا اس لیے حکم دیا ہے کہ نماز تمام عبادات کی جامع ہے۔نماز میں روحانی،نفسانی اور جسمانی ہر قسم کی عبادات جمع ہیں۔مثلاً نماز طہارت پر موقوف ہے اور طہارت اسلام میں ایک بہت بڑا اصول ہے۔انبیاء (علیھم السلام) کی تعلیمات کا حصہ ہے اسی طرح ستر کا ڈھانپنا نماز کے لیے شرط ہے۔ستر پوشی تو ہر حالت میں لازم ہے مگر

نماز کے دوران تو اور زیادہ مؤکدہ ہے۔انسان برہنگی کی حالت میں نماز ادا نہیں کر سکتا۔عبادت کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ مال بھی صرف کرنا پڑتا ہے۔تو گویا نماز میں انفاق جیسی عبادت بھی شامل ہے۔پھر نماز کے لیے قبلہ شریف کی طرف رخ کرنا بھی ضروری ہے۔نماز کی حالت میں انسان معتکف ہوتا ہے۔اور اعتکاف ایک مستقل عبادت ہے لہٰذا نماز میں اعتکاف بھی شامل ہے نماز کے دوران انسان کے اعضا اور جوارع خشوع کا اظہار کرتے ہیں۔دل سے نیت اور اخلاص بھی ضروری ہے۔اگر نیت اور خلوص نہ ہو تو نماز نہیں ہوتی اسی طرح نماز میں شیطان کے ساتھ مجاہدہ بھی شامل ہے۔نماز میں انسان رب العزت کے سامنے مناجات کرتا ہے۔اور قرآن کریم کی تلاوت جیسی بہترین عبادت سے فیضیاب ہوتا ہے۔نماز میں انسان شہادتین کا تکلم کرتا ہے اور کہتا ہے " اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ "یہ بہت بڑی حقیقت ہے۔جس کی انسان گواہی دیتا ہے۔نماز میں انسان کھانے پینے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔کیونکہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔الغرض امام بیضاوی فرماتے ہیں،کہ نماز ایک ایسی اعلیٰ درجے کی عبادت ہے۔کہ اس میں بہت سی دوسری عبادات بھی شامل ہیں۔نماز تعلق مع اللہ کا عنوان ہے،مومن کے لئے یہی تعلق سب سے بڑا ہتھیار اور فتح و نصرت کی کلید ہے؛اسی لئے پیغمبر اسلام ﷺ نے مختلف انسانی ضروریات سے متعلق نمازیں رکھی ہیں،بارش کے لئے استسقاء،سورج و چاند گرہن کے موقع پر کسوف وخسوف کی نماز،استغفار کے لئے نماز جنازہ،گناہ ہو جائے تو نمازِ توبہ،کسی معاملہ میں مفید اور غیر مفید پہلوؤں کی بابت تردد ہو تو نمازِ استخارہ اور کوئی بھی حاجت درپیش ہو تو نمازِ حاجت،صبر کے معنی برداشت کرنے کے ہیں،جب آدمی بے برداشت ہو جاتا ہے اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی بجائے مشتعل جذبات کے ساتھ کسی مسئلہ پر غور کرتا ہے تو بے تدبیری اور بدتدبیری کا شکار ہو جاتا ہے،پس صبر،ہوش گوش کے ساتھ تدبیر کے مطابق کام کرنے کا نام ہے،اللہ کی طرف توجہ اور دنیا میں سنجیدہ تدبیر یہی کامیابی کی کلید ہے؛اسی لئے ان دونوں کو خدا کی مدد حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

آخرت میں مؤمنین کیلئے دیدار الٰہی کی نعمت

اَلَّذِیۡنَ	جو	یَظُنُّوۡنَ	وہ یقین رکھتے ہیں	اَنَّہُمۡ	کہ بیشک وہ
مُّلٰقُوۡا	ملنے والے ہیں	رَبِّہِمۡ	اپنے رب کو	وَاَنَّہُمۡ	اور کہ بیشک وہ
اِلَیۡہِ	اُسی کی طرف	رٰجِعُوۡنَ(46)	لوٹنے والے ہیں		

یعنی جولوگ مرنے کے بعد اپنے پروردگار سے ملنے اوراس کے حضور جواب دہی کا یقین رکھتے ہیں۔ان کے لیے نماز کی ادائیگی کبھی مشکل نہیں ہوا کرتی بلکہ اگرکوئی نماز چھوٹ جائے یا نماز میں تاخیر ہوجائے تو ان کی طبیعت گراں بار ہوجاتی ہے اور جب تک وہ نماز ادا نہ کرلیں انہیں چین نہیں آتا اور جولوگ روز آخرت پر پورا یقین نہیں رکھتے،ان کے لیے نماز ایک مصیبت اور مفت کی بیگار ہوتی ہے۔اس آیت میں بشارت ہے کہ آخرت میں مؤمنین کو دیدار الٰہی کی نعمت نصیب ہوگی،نیز اللہ تعالیٰ سے ملاقات اوراس کی طرف رجوع میں ترغیب وترہیب دونوں ہیں اوران دونوں کو پیشِ نظر رکھنا نماز میں خشوع پیدا ہونے کا ذریعہ ہے،گویا نماز میں خشوع وخضوع قائم رکھنے کا حکم بھی دیااوراس کے حصول کا طریقہ بھی بتادیا۔اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو باجماعت نماز ادا کرنے کی اہتمام اورتوفیق عطافرمائے،(آمین)

سفارش پر تکیہ کرنا نری بے وقوفی ہے/ فرعون کی بنی اسرائیل کو تعذیب کی وجہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ
اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ۴۷ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا
تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ
یُنْصَرُوْنَ ۴۸ وَاِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ
اَبْنَآءَكُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ۴۹

اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد کرنے کا حکم

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ	اے اولادِ اسرائیل	اذْكُرُوْا	تم یاد کرو		
نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ	میری نعمت جو	اَنْعَمْتُ	میں نے انعام کی	عَلَیْكُمْ	تم پر
وَاَنِّیْ	اور بیشک میں	فَضَّلْتُكُمْ	میں نے فضیلت دی تم کو		
عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (47)	جہان والوں پر۔				

یہاں سے ایک بار پھر بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے احسانات یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حبیب صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی اطاعت ترک کرنے سے ڈریں اور ان پر حجت

پوری ہوجائے۔ یاد رہے کہ ان آیات میں بنی اسرائیل کے ان لوگوں سے خطاب کیا جارہا ہے جو سید المرسلین صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے مقدس زمانے میں موجود تھے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں یاد کرنے کا حکم دیا جارہا ہے وہ یہ ہیں: (1)......تمام اہلِ زمانہ پر فضیلت و برتری، (2)......دریا میں راستہ بن جانا، (3)......فرعون سے نجات، (4)......تورات کا عطا ہونا، (5)......بچھڑے کی پوجا پر معافی مل جانا، (6)......ایک گروہ کا مرنے کے بعد زندہ کیا جانا، (7)......بادلوں سے سایہ ملنا، (8)......مَن وسَلویٰ نازل ہونا، (9)......پانی کے بارہ چشمے جاری ہوجانا، (10)......زمینی اناج عطا کیا جانا وغیرہ، یہ تمام نعمتیں ان کے آباؤ اجداد کو عطا کی گئی تھیں اور چونکہ جو نعمت آباؤ اجداد کو ملی ہو وہ ان کی اولاد کے حق میں بھی نعمت ہوتی ہے اس لئے ان سے فرمایا جارہا ہے کہ اے یعقوب کی اولاد! میرا وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور میرے حبیب صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی پیروی کرکے اور ان کے دین میں داخل ہوکر میری ان نعمتوں کا شکر ادا کرو۔'' بنی اسرائیل کی نعمتوں کو سامنے رکھ کر امت محمدیہ پر ہونے والے انعامات کو شمار کریں تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ شکر گزاری کا تقاضا ہم سے کس قدر مطلوب ہے۔ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ: میں نے تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرمائی۔ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ سے پہلے زمانوں کے لوگ ہیں، کیونکہ آپ ﷺ کے تشریف لانے پر یہ فضیلت (كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ)[آل عمران:110] فرما کر اس امت کو عطا کر دی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (خَیْرُ النَّاسِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ) ''سب سے بہتر میرے زمانہ کے لوگ ہیں، پھر وہ لوگ جو ان سے ملیں گے، پھر وہ جو ان سے ملیں گے۔'' (بخاری)

بہر حال یہاں پر بنی اسرائیل کی جہان والوں پر فضیلت سے یہ مراد نہیں ہے کہ انہیں حضور اکرم ﷺ کی امت پر بھی فضیلت حاصل ہے قرآن پاک میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو سب سے زیادہ فضیلت بخشی ہے۔ اور اس فضیلت کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور آخرت سے بھی گویا دونوں جہانوں میں امت محمدیہ کی فضیلت مسلم ہے۔ بنی اسرائیل کی فضیلت سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنے دور میں دینی اور دنیوی ہر دو لحاظ سے باقی اقوام عالم پر برتری حاصل

تھی۔اس زمانے میں اس قوم میں صلاحیت بھی پائی جاتی تھی۔اوران کی علمی حیثیت بھی مستند تھی۔ ایک خاص چیز جو بنی اسرائیل میں پائی جاتی ہے۔وہ یہ ہے کہ اس قوم نے اپنی تاریخ کو محفوظ رکھا ہے۔چناچہ بائیبل کاایک بڑاحصہ تاریخ بنی اسرائیل پر مشتمل ہے۔برخلاف اس کے ہندوقوم ہزاروں برس تک برسر اقتدار رہی ہے۔مگر سوائے چھوٹے موٹے قصے کہانیوں کے ہندوؤں کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔اپنی یہ خامی خود ہندو بھی تسلیم کرتے ہیں۔گویا بنی اسرائیل کے دور میں جو دوسری اقوام موجود تھیں ان میں سے کسی کی تاریخ بھی محفوظ نہیں ہے۔بنی اسرائیل ہی ایک واحد قوم ہے جس کی تاریخ ملتی ہے۔

اسلامی تاریخ کی حفاظت

البتہ جب حضور خاتم النبین ﷺ کی امت کا زمانہ آیا تو انہیں علمی لحاظ سے بھی برتری حاصل ہوئی اورانہوں نے اپنی تاریخ کو بھی محفوظ کرلیا۔انہیں زمانے میں بڑا عروج حاصل ہوا۔مگر جب یہ امت بھی زوال پذیر ہوئی تو اس کی حیثیت بھی دنیا کی دیگر زوال پذیر اقوام سے مختلف نہ رہی۔ موجودہ دور کے مسلمان کو اپنی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں۔وہ نہ اپنی تاریخ کی حفاظت کی کوشش کرتا ہے۔اورنہ اپنی کتاب کی تشریح اور تفسیر معلوم کرنے کی سعی کرتا ہے۔مسلمانوں کے زمانہ عروج کی تاریخ تو آج بھی موجود ہے۔اسلام نے بڑے بڑے مؤرخ پیدا کئے۔جنہوں نے اپنے زریں دور کے ایک ایک لمحے کو اپنی کتابوں کے اوراق میں محفوظ کرلیا۔ان مؤرخین میں علامہ طبری (رحمہ اللہ) تیسری صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ابن خلدون (رحمہ اللہ) اورابن کثیر رحمہ اللہ، آٹھویں صدی کے مؤرخ ہیں۔ابن اثیر (رحمہ اللہ) جنہوں نے تاریخ اور دیگر علوم کو محفوظ کیا۔جو مفسر بھی ہیں اورتاریخ دان بھی۔مگر آج ہم ہیں جو اپنے اکابر کے جمع کردہ علمی ذخیرہ سے بھی خاطر خواہ مستفید نہیں ہوپاتے۔جب سے انگریز کی جدت پیدا ہوئی ہے۔اس نے مسلمانوں کو ان کی اپنی تاریخ سے بے بہرہ کردیا ہے آج مسلمان اپنی تاریخ کو فراموش کرچکا ہے۔اسے اب یورپ کے افراد پر فخر ہے۔ان کی تاریخ کو حفظ کرتے ہیں۔اپنی تاریخ سے نہ تو واقفیت پیدا کی جاتی ہے۔اورنہ اسے محفوظ

کرنے کی تگ و دو ہوتی ہے۔

اُمت محمدیہ خیر اُمت

الغرض! اسلام سے پہلے ایک طویل عہد تک جب کہ دنیا میں ہر طرف شرک اور بت پرستی چھائی ہوئی تھی، صرف بنی اسرائیل ہی توحید کے علمبردار تھے اور ان کے درمیان یکے بعد دیگرے انبیاء کی بعثت کا سلسلہ جاری تھا، توحید کے حامل ہونے اور انبیاء پر ایمان لانے کی وجہ سے وہ یقیناً اس وقت تمام عالَم پر فضیلت رکھتے تھے؛ لیکن یہ فضیلت ایمان و عمل کی بنیاد پر تھی، نہ کہ رنگ و نسب کی وجہ سے؛ اسی لئے جب خاتم النبیین محمد رسول ﷺ سرزمین عرب میں مبعوث ہوئے اور بنی اسرائیل نے ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا، تو فضیلت کا یہ تاج ان کے سر سے اُتار کر اُمت محمدیہ کے سر پر رکھ دیا گیا، اب بنو اسرائیل 'مَغْضُوب عَلَيهِم' اور 'ضَالین' ٹھہرے اور اُمت محمدیہ 'خیر اُمت' کے لقب سے سرفراز کی گئی۔ (آلِ عمران: ۱۱۰) مستند احادیث میں نبی کریم ﷺ نے مَغضُوب علیھم سے مراد یہودیوں کی قوم کو لیا ہے، کیونکہ انہیں اللہ کی طرف سے شریعت اور علم دیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ یعنی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق اور سچائی کا علم رکھنے کے باوجود اسے قبول نہ کریں، جان بوجھ کر نافرمانی کریں یا اسے پسِ پشت ڈال دیں۔ علماء کرام کے نزدیک یہ اصطلاح ہر اس شخص یا گروہ پر صادق آتی ہے جو حق جاننے کے باوجود ضد، عناد یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے غلط راستے پر گامزن رہے۔

شفاعت کن لوگوں کے حق میں مقبول ہوگی

وَاتَّقُوْا	اور تم ڈرو	یَوْمًا	اس دن سے	لَّا تَجْزِیْ	نہ کام آئے گی
نَفْسٌ	کوئی جان	عَنْ نَّفْسٍ	کسی جان کے	شَیْـًٔا	کچھ بھی
وَلَا یُقْبَلُ	اور نہ قبول کی جائے گی	مِنْهَا	اس سے	شَفَاعَةٌ	کوئی سفارش
وَّلَا یُؤْخَذُ	اور نہ لیا جائے گا	مِنْهَا	اس سے	عَدْلٌ	کوئی معاوضہ
وَّلَا هُمْ	اور نہ وہ	یُنْصَرُوْنَ (48)	مدد کئے جائیں گے۔		

نعمت یاد دلانے کے بعد انھیں قیامت کے عذاب سے ڈرایا۔بنی اسرائیل میں فساد کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے انبیاء اور علماء پر ناز کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کتنے ہی گناہ کرلیں ہمارے بزرگ اور آباء واجداد ہمیں بخشوالیں گے، ان کے اسی باطل گمان کی تردید کی گئی ہے۔کسی گرفتار شخص کو چھڑانے کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں،کسی کی سفارش کام آجائے، یا فدیہ دے کر چھڑا لیا جائے، یا زبردستی حملہ کرکے چھڑا لیا جائے، قیامت کے دن ان میں سے کوئی بھی ممکن نہیں۔فرمایا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ اور نہ اس نفس سے سفارش قبول کی جائیگی،قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی نفی کی ہے کہ روز قیامت کفار اور نافرمانوں کے حق میں کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ یہاں ان لوگوں کا رد کیا گیا ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ دنیا میں کسی بھی قسم کے عقائد یا گناہوں میں ملوث رہیں، لیکن آخرت میں ان کے بزرگ یا سفارشی انہیں بچالیں گے۔مختلف تفاسیر کے مطابق، ایسی شفاعت (سفارش) صرف ان کے لیے مسترد کی جائے گی جو ایمان سے محروم ہوں گے۔شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مطلق سفارش کی نفی کی گئی ہے، حالانکہ سفارش برحق ہے۔قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے کہ سفارش ہوگی اس مقام پر جس سفارش کی نفی کی گئی ہے۔اس سے مراد یہ ہے کہ کسی کافر کے حق میں سفارش مفید نہیں ہوگی۔کسی کافر سے سفارش قبول نہیں کی جائیگی۔حضور ﷺ نے فرمایا میری سفارش برحق ہے۔اور یہ میری امت کے ہر اس شخص کو پہنچے گی، "مَنْ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا" جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا۔یہ توحید کی بنیاد اور مغفرت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔نبی اکرم ﷺ کی احادیث مبارکہ میں اس عقیدے کے حاملین کے لیے دنیا اور آخرت میں بہت بڑی بشارتیں دی گئی ہیں، مگر کافر کے حق میں یہ بالکل قبول نہیں ہوگی البتہ اگر کسی کی فطرت پاک ہوگی۔عقیدہ صحیح ہوگا۔مشرک اور کافر نہیں ہوگا تو سفارش مفید ہوگی۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن کافر کو نہ کوئی کافر نفع پہنچا سکے گا اور نہ کوئی مسلمان، اس دن شفاعت صرف مسلمان کیلئے ہوگی جیسا کہ دیگر آیات میں بیان ہوا البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ شفاعت کی امید پر گناہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے اچھے ڈاکٹر کے مل جانے کی امید پر کوئی زہر کھالے یا ہڈیوں کے ماہر ڈاکٹر کے ملنے کی امید پر گاڑی کے نیچے آکر سارے

بدن کی ہڈیاں تڑوالے۔یعنی دنیا میں مدد کے جتنے طریقے ہیں، وہ سب کام نہ آئیں گے،یہود سمجھتے تھے کہ اپنے بزرگوں کی سفارش سے ان کا کام چل جائے گا اور عیسائیوں کا خیال تھا کہ ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح کی قربانی ان کے لئے فدیۂ نجات کا کام کرے گی، ان سب کی تردید ہوگئی، مسلمان بھی ضرور رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے قائل ہیں؛ لیکن یہ شفاعت بھی صرف انھیں کے حق میں مقبول ہوگی، جن کے لئے خود اللہ تعالیٰ اجازت دیں (البقرۃ:۲۵۵) اور یہ اجازت ایمان اور عمل صالح کی بنا پر ہوگی۔

'آلِ فرعون' سے مراد/'فرعون'، نام نہیں بلکہ لقب تھا

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ	اور جب ہم نے نجات دی تمہیں	مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ	آلِ فرعون سے		
يَسُوْمُوْنَكُمْ	وہ پہنچاتے تھے تمہیں	سُوْٓءَ الْعَذَابِ	بُرا عذاب		
يُذَبِّحُوْنَ	وہ ذبح کرتے تھے	اَبْنَآءَكُمْ	تمہارے بیٹوں کو		
وَيَسْتَحْيُوْنَ	اور وہ زندہ چھوڑ دیتے تھے	نِسَآءَكُمْ	تمہاری عورتوں کو		
وَفِيْ ذٰلِكُمْ	اور اس میں	بَلَآءٌ	آزمائش (تھی)		
مِّنْ رَّبِّكُمْ	تمہارے رب کی طرف سے	عَظِيْمٌ (49)	بہت بڑی۔		

'آلِ فرعون'' سے صرف فرعون کی اولاد مراد نہیں ہے؛ بلکہ اس کی پیروی کرنے والے بھی مراد ہیں، ''فرعون'' نام نہیں؛ بلکہ مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا، کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے عہد میں بنی اسرائیل جن شاہانِ مصر کے زیرِ عتاب آئے، وہ یکے بعد دیگرے دو فرمانروا تھے۔ جس طرح فارس کے بادشاہ کا لقب کسریٰ، روم کے بادشاہ کا قیصر اور حبشہ کے بادشاہ کا لقب نجاشی تھا اسی طرح قِبطِی اور عَمالِقہ قوم سے تعلق رکھنے والے، مصر کے بادشاہوں کا لقب فرعون ہوتا تھا۔حضرت موسیٰ عَلَیہِ الصَّلوٰۃُ وَالسَّلاَم کے زمانہ کے فرعون کا نام ولید بن مُصْعَب بن ریان تھا اور اس آیت میں اُسی کا ذکر ہے۔اس کی عمر چار سو سال سے زیادہ ہوئی، نیز اس آیت میں آلِ فرعون سے اس کے پیروکار مراد ہیں۔ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ: وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے۔

فرعون نے خواب دیکھا کہ بیت المقدس کی طرف سے ایک آگ آئی اور اس نے مصر کو گھیر کر تمام قبطیوں کو جلا ڈالا جبکہ بنی اسرائیل کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔اس خواب سے اسے بڑی وحشت ہوئی، اس کے کاہنوں نے تعبیر دی تھی کہ ایک اسرائیلی لڑکا فرعونیوں کی سلطنت اور مذہب کو نیست و نابود کردے گا،اس خبر پر فرعون نے عام حکم جاری کردیا تھا کہ بنی اسرائیل کے یہاں جو لڑکا پیدا ہو، اسے قتل کردیا جائے اور لڑکیوں کو رہنے دیا جائے،کہ ایک تو ان سے یہ خطرہ نہیں تھا، دوسرے ان سے خدمت لینے اور اپنے حرم میں لانے کا فائدہ بھی متعلق تھا، بائبل میں بھی اس واقعہ کا ذکر ہے یوں ہزاروں کی تعداد میں بچے قتل کئے گئے۔قدرتِ الٰہی سے اس قوم کے بوڑھے جلد مرنے لگے تو قبطی سرداروں نے گھبرا کر فرعون سے شکایت کی کہ ایک طرف بنی اسرائیل میں موت کی کثرت ہوگئی ہے اور دوسری طرف ان کے بچے بھی قتل کئے جارہے ہیں، اگر یہی صورت حال رہی تو ہمیں خدمتگار کہاں سے ملیں گے؟ اس پر فرعون نے حکم دیا کہ ایک سال بچے قتل کئے جائیں اور ایک سال چھوڑ دیئے جائیں تو جو سال چھوڑنے کا تھا اس میں حضرت ہارون عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام پیدا ہوئے اور قتل کے سال حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی ولادت ہوئی۔ یہ واقعہ سورۂ قصص کے پہلے رکوع میں کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ **وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ**: اور اس میں آزمائش تھی۔ ''بلا'' امتحان و آزمائش کو کہتے ہیں اور آزمائش نعمت سے بھی ہوتی ہے اور شدت و محنت سے بھی۔ نعمت سے بندے کی شکرگزاری اور محنت و مشقت سے اس کے صبر کا حال ظاہر ہوتا ہے۔ اس آیت میں اگر ''ذٰلِكُمْ'' کا اشارہ فرعون کے مظالم کی طرف ہو تو ''بلا'' سے محنت و مصیبت مراد ہوگی اور اگر ان مظالم سے نجات دینے کی طرف اشارہ ہو تو ''بلا'' سے نعمت مراد ہوگی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اپنی نعمتوں کی قدردانی نصیب فرمائے۔ (آمین)

گؤ سالہ پرستوں کا قتل عام/ مرتد کی سزا قتل کیوں ہے؟

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا
مُوْسٰٓی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا
عَنْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ
لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ بِاتِّخَاذِکُمُ
الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰی بَارِئِکُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ عِنْدَ بَارِئِکُمْ ؕ فَتَابَ
عَلَیْکُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۴﴾

جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا

وَاِذْ	اور جب	فَرَقْنَا	ہم نے پھاڑا	بِکُمُ	تمہاری وجہ سے
الْبَحْرَ	سمندر (کو)	فَاَنْجَیْنٰکُمْ	پس ہم نے نجات دی تمہیں		
وَاَغْرَقْنَآ	اور ہم نے غرق کر دیا	اٰلَ فِرْعَوْنَ	آلِ فرعون (کو)		
وَاَنْتُمْ	اس حال میں کہ	تَنْظُرُوْنَ(50)	تم دیکھ رہے تھے۔		

وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ: اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا۔ یہ دوسری نعمت کا

بیان ہے جو بنی اسرائیل پر فرمائی کہ انہیں فرعونیوں کے ظلم وستم سے نجات دی اور فرعون کو اس کی قوم سمیت ان کے سامنے غرق کر دیا جس کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام حکمِ الٰہی پر رات کے وقت بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے۔ صبح کو فرعون ان کی جستجو میں ایک بھاری لشکر لے کر نکلا اور انہیں دریا کے کنارے پر پالیا، بنی اسرائیل نے فرعون کے لشکر کو دیکھ کر حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے فریاد کی، آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سمندر پر اپنا عصا مارا۔ اس کی برکت سے عین دریا میں بارہ خشک راستے پیدا ہو گئے اور پانی دیواروں کی طرح کھڑا ہو گیا اور ان آبی دیواروں میں جالی کی مثل روشدان بن گئے۔ بنی اسرائیل کی ہر جماعت ان راستوں میں ایک دوسری کو دیکھتی اور باہم باتیں کرتی گزر گئی۔ فرعون بھی اپنے لشکر سمیت ان سمندری راستوں میں داخل ہو گیا لیکن جب اس کا تمام لشکر سمندر کے اندر آ گیا تو سمندر اپنی اصلی حالت پر آیا اور تمام فرعونی اس میں غرق ہو گئے اور بنی اسرائیل سمندر کے کنارے فرعونیوں کے غرق کا منظر دیکھ رہے تھے۔ (قرطبی، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۵۱، ۱ / ۳۱۸-۳۱۹، بیضاوی، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۵۱، ۱ / ۳۲۲ ملتقطاً)

فرعونیوں کی غرقابی کا دن

فرعونیوں کا غرق ہونا محرم کی دسویں تاریخ کو ہوا، اور حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے اس دن شکر کا روزہ رکھا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا فرماتے ہیں: جب حضور پر نور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ یہودی عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہیں، آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: یہ کیا ہے؟ یہودیوں نے عرض کی: یہ نیک دن ہے، یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن سے نجات دی تو حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے اس دن روزہ رکھا تھا۔ رسول کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ''تمہاری نسبت موسیٰ سے میرا تعلق زیادہ ہے، چنانچہ آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے اس دن روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم

ارشاد فرمایا۔(بخاری، کتاب الصوم، باب صیام یوم عاشوراء،۱/ ۶۵۶،الحدیث :۲۰۰۴،مسلم، کتاب الصیام، باب صوم یوم عاشوراء، ص ۵۷۲،الحدیث :۱۲۸(۱۱۳۰))

دس محرم کا روزہ میں یہودیوں کی مخالفت

البتہ صرف دس محرم کا روزہ نہ رکھا جائے بلکہ اس کے ساتھ آگے یا پیچھے ایک روزہ ملایا جائے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا سے مروی ہے رسول اللہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: عاشوراء کے دن کا روزہ رکھو اور اس میں یہودیوں کی مخالفت کرو، عاشوراء کے دن سے پہلے یا بعد میں ایک دن کا روزہ رکھو۔(مسند امام احمد، ۱/ ۵۱۸، الحدیث: ۲۱۵۴) بہر حال اسی واقعہ کو یاد دلاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا" وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ "ہم نے تمام فرعونیوں کو غرق کر دیا" وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝۵۰ اور یہ سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ میرے اس احسان کو یاد کرو۔ جب تمہارے لئے سمندر میں راستے بنا دیے جن کے ذریعے تم نے سمندر کو عبور کر لیا اور فرعونیوں سے نجات پالی۔ مگر اس پانی میں فرعون کے سارے لشکر کو تمہارے سامنے غرق کر دیا۔ ان احسانات کو یاد دلانے کا مقصد یہ تھا کہ اب بھی اپنی برائیوں سے باز آجاؤ۔ اور اس دن سے ڈر جاؤ۔ جس دن نہ کوئی سفارش کام آئیگی اور نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔ اور جو کچھ میں نے تمہارے اوپر نازل کیا ہے اس پر ایمان لاؤ۔

طورِ سینین اور وادیِ مقدس

وَاِذْ	اور جب	وٰعَدْنَا	ہم نے وعدہ کیا	مُوْسٰی	موسیٰ سے
اَرْبَعِیْنَ	چالیس	لَیْلَۃً	راتوں کا	ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ	پھر تم نے پکڑا
الْعِجْلَ	بچھڑا	مِنْۢ بَعْدِہٖ	اس کے بعد	وَاَنْتُمْ	حالانکہ تم
ظٰلِمُوْنَ(51)			ظلم کرنے والے تھے۔		

مصریوں سے نجات پانے کے بعد بنی اسرائیل کو شریعت خداوندی کی ضرورت پڑی، توحید پر وہ پہلے ہی سے قائم تھے، اب حلال وحرام کے احکام کی ضرورت تھی، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے

حضرت موسیٰ کو 'طور' نامی پہاڑ کی چوٹی پر طلب فرمایا کہ یہاں چالیس روز معتکف ہوں، کوہِ طور مصر کے جزیرہ نما سینا میں واقع وہ تاریخی اور مقدس پہاڑ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا اور انہیں آسمانی کتاب (تورات) عطا کی۔ عربی اور سریانی زبان میں طور کا مطلب پہاڑ ہے۔ کوہِ طور کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید میں متعدد بار اس کا ذکر آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑ کی قسم بھی کھائی ہے (مثلاً سورۃ الطور اور سورۃ التین میں)۔ قرآن میں اسے 'طورِ سینین اور وادیِ مقدس طویٰ کے ناموں سے بھی پکارا گیا ہے، بہرحال اسی درمیان بنی اسرائیل نے مصریوں یا کنعانیوں کی گوسالہ پرستی سے متاثر ہو کر سونے کا ایک بچھڑا بنالیا اور اس کی پوجا شروع کر دی، جب موسیٰ (علیہ السلام) چالیس روز کے لیے کوہ طور پر معتکف ہو گئے فرمایا " ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ " تم نے موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا۔ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۵۱ " اور تم بڑے ظلم کرنے والے تھے۔ تم نے کچھ خیال نہ کیا۔ تمہارے پاس ایک پیغمبر بھی موجود تھے۔ مگر اس کے باوجود تم گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ شرک میں ملوث ہو گئے۔ حالانکہ " اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا " وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ " کفر کرنے والے بہت بڑے ظالم ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ اس کی صفات میں شرک کرتے ہیں۔ یا اس کی عبادت میں شریک ٹھہراتے ہیں۔ سورہ طٰہٰ میں آتا ہے کہ حضرت ہارون (علیہ السلام) بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے منع کرتے رہے۔ انہوں نے ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس قوم نے کوئی بات نہ مانی۔ انسان کتنا ظاہر پرست ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھنے کے باوجود اور نبیوں (حضرت ہارون و موسیٰ علیہما السلام) کی موجودگی کے باوجود بچھڑے کو اپنا (معبود) سمجھ لیا۔ آج کا مسلمان بھی شرکیہ عقائد و اعمال میں بری طرح مبتلا ہے، لیکن وہ سمجھتا یہ ہے کہ مسلمان مشرک کس طرح ہو سکتا ہے؟ ان مشرک مسلمانوں نے شرک کو پتھر کی مورتیوں کے پجاریوں کے لئے خاص کر دیا ہے کہ صرف وہی مشرک ہیں۔ جب کہ یہ نام نہاد مسلمان بھی قبروں پر قبوں کے ساتھ وہی کچھ کرتے ہیں جو پتھر کے پجاری اپنی مورتیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ

بچھڑے کی عبادت جیسا سنگین گناہ

ثُمَّ	پھر	عَفَوْنَا	ہم نے درگزر کردیا	عَنْكُمْ	تم سے
مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ	اس کے بعد	لَعَلَّكُمْ		تاکہ تم	
تَشْكُرُوْنَ(52)		شکرگزار بن جاؤ۔			

یہ آیت بنی اسرائیل کے اس واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے گئے، اوران کی غیر موجودگی میں بنی اسرائیل نے سونے کے بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا۔ یہ ایک بہت بڑا گناہ تھا لیکن جب انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم فضل اور کرم سے انہیں معاف فرمادیا۔یعنی جب موسیٰ (علیہ السلام) نے قوم کو خوب ڈانٹا تو وہ پشیمان ہوگئے۔انہیں احساس ہوگیا کہ انہوں نے غلط کام کیا ہے۔اوراپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔تو عرض کیا کہ ہمارے اس جرم کاازالہ کس طرح ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا"ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کی تفسیر میں مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ بنی اسرائیل نے جب بچھڑے کی عبادت جیسا سنگین گناہ کیا، تو اللہ نے سخت سزا کے باوجود ان کی توبہ قبول کی اوران کے گناہ مٹادیے۔لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ کا معنی ہے کہ اللہ نے تمہیں یہ معافی اس لیے دی کہ تم اس کی نعمت کا شکرادا کرواورآگے بڑھ کر اطاعت کرو۔

فرقان سے مراد اور 'فرقان' کے معنی

وَاِذْ	اور جب	اٰتَيْنَا	ہم نے دی	مُوْسَى	موسیٰ کو	الْكِتٰبَ	کتاب
وَالْفُرْقَانَ	اور معجزے	لَعَلَّكُمْ	تاکہ تم	تَهْتَدُوْنَ(53)	سب ہدایت پالو۔		

'فرقان' کے معنی اس چیز کے ہیں جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرتی ہو،اب یا تو یہ 'کتاب' یعنی 'تورات' ہی کی تفسیر ہے،یا تورات کے احکام وقوانین مراد ہیں، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل کی وہ مدد غیبی جوان کو فتح منداوران کے دشمنوں کو مغلوب کرتی جاتی تھی یا حضرت موسیٰ کو عطا ہونے والے خصوصی معجزات مراد ہیں، جیسے عصااور ید بیضا کا معجزہ،الغرض اَلْفُرْقَانَ: فرق

کرنا۔فرقان کے کئی معانی کئے گئے ہیں : (1) فرقان سے مراد بھی تورات ہی ہے ۔(2) کفر وایمان میں فرق کرنے والے معجزات جیسے عصا اور ید بیضاء وغیرہ ۔(3) حلال وحرام میں فرق کرنے والی شریعت مراد ہے ۔لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ اس جملے کا جامع مفہوم یہ بنتا ہے:" تاکہ تم سیدھا راستہ پالو، ہدایت یافتہ ہو جاؤ، اور مقصودِ حق تک پہنچ سکو۔"

شریعت موسوی میں شرک اور ارتداد کی سزا

وَاِذۡ قَالَ	اور جب کہا	مُوۡسٰی	موسیٰ نے	لِقَوۡمِہٖ	اپنی قوم سے
یٰقَوۡمِ	اے میری قوم	اِنَّکُمۡ	بیشک تم	ظَلَمۡتُمۡ	تم نے ظلم کیا
اَنۡفُسَکُمۡ	اپنے نفسوں پر	بِاتِّخَاذِکُمُ	تمہارے معبود پکڑنے کے سبب		
الۡعِجۡلَ	بچھڑے کو	فَتُوۡبُوۡۤا	تم رجوع کرو	اِلٰی بَارِئِکُمۡ	اپنے پروردگار کی طرف
فَاقۡتُلُوۡۤا	پس تم قتل کرو	اَنۡفُسَکُمۡ	اپنی جانوں کو		
ذٰلِکُمۡ	یہی	خَیۡرٌ لَّکُمۡ	بہتر ہے تمہارے لئے		
عِنۡدَ بَارِئِکُمۡ	تمہارے پروردگار کے نزدیک	فَتَابَ	تو اس نے رجوع کیا		
عَلَیۡکُمۡ	تم پر	اِنَّہٗ	بیشک وہ	ھُوَ التَّوَّابُ	ہی بہت توبہ قبول کرنے والا
الرَّحِیۡمُ (54)	بڑا مہربان ہے ۔				

شریعت موسوی میں شرک اور ارتداد کی سزا قتل تھی ؛ اس لئے حکم ہوا کہ جو لوگ بچھڑے کی پوجا کرنے کے گناہ سے بچے رہے، وہ اپنے ان قریبی لوگوں کو قتل کر دیں، جو شرک اور گوسالہ پرستی کے مرتکب ہوئے ہیں، فرمایا: فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ : کہ تم اپنے لوگوں کو قتل کرو ۔بنی اسرائیل کو بچھڑا پوجنے کے گناہ سے یوں معافی ملی کہ حضرت موسیٰ عَلَیۡہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے قوم سے فرمایا: تمہاری توبہ کی صورت یہ ہے کہ جنہوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی ہے وہ پوجا کرنے والوں کو قتل کریں اور مجرم راضی خوشی سکون کے ساتھ قتل ہو جائیں ۔وہ لوگ اس پر راضی ہو گئے اور صبح سے شام تک ستر ہزار قتل ہو گئے، تب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون عَلَیۡہِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے گڑگڑاتے

ہوئے بارگاہِ حق میں ان کی معافی کی التجاء کی۔اس پر وحی آئی کہ جو قتل ہو چکے وہ شہید ہوئے اور باقی بخش دیئے گئے، قاتل و مقتول سب جنتی ہیں ۔(تفسیر عزیزی (مترجم)، البقرۃ،تحت الآیۃ: ۵۴، ۱/ ۴۳۹-۴۴۲، ملخصاً) اس آیت سے معلوم ہوا کہ شرک کرنے سے مسلمان مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے بغاوت کر رہا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کا باغی ہو اسے قتل کر دینا ہی حکمت اور مصلحت کے عین مطابق ہے ۔دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں یہ قانون نافذ ہے کہ جو اس ملک کے بادشاہ سے بغاوت کرے اسے قتل کر دیا جائے ۔اس قانون کو انسانیت کے تمام علمبردار تسلیم کرتے ہیں اور اس کے خلاف کسی طرح کی کوئی آواز بلند نہیں کرتے ، جب دنیوی بادشاہ کے باغی کو قتل کر دینا انسانیت پر ظلم نہیں تو جو سب بادشاہوں کے بادشاہ اللہ تعالیٰ کا باغی ہو جائے اسے قتل کر دیا جانا کس طرح ظلم ہو سکتا ہے ۔اور یہ ظلم آلِ فرعون کے مظالم سے بھی زیادہ شدید ہیں کیونکہ یہ افعال ان سے بعد ِ ایمان سرزد ہوئے، اس وجہ سے وہ مستحق تو اس کے تھے کہ عذابِ الٰہی انہیں مہلت نہ دے اور فی الفور ہلاک کر کے کفر پر ان کا خاتمہ کر دے لیکن حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون عَلَیْہِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے طفیل انہیں توبہ کا موقع دیا گیا، یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے اور یہ قتل ان کے لیے کفارہ تھا۔

بنی اسرائیل کے کئی جرم

بہر حال بچھڑا بنا کر پوجنے میں بنی اسرائیل کے کئی جرم تھے: (1)......مجسمہ سازی جو حرام ہے ۔(2)......حضرت ہارون عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی نافرمانی ۔(3)......بچھڑے کی پوجا کر کے مشرک ہو جانا۔ «اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أُشْرِكَ بِكَ وَأَنَا أَعْلَمُ، وَأَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا أَعْلَمُ». اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ میں جان بوجھ کر شرک کروں اور تجھ سے معافی مانگتا ہوں اس شرک سے جسے میں انجانے میں کروں ۔(رواه البخاري في الادب المفرد 739 وصححه الالبانی)

منتخب ستر آدمیوں کی موت اور دوبارہ زندگی/ بنی اسرائیل کا جہاد سے انکار

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَاَنْتُمْ
تَنْظُرُوْنَ ۵۵ ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۵۶ وَظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ
الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی ؕ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ ؕ وَمَا
ظَلَمُوْنَا وَلٰکِنْ کَانُوْٓا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ ۵۷ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا ھٰذِہِ الْقَرْیَۃَ فَکُلُوْا مِنْھَا
حَیْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّۃٌ نَّغْفِرْ لَکُمْ خَطٰیٰکُمْ ؕ
وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ ۵۸ فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَھُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَی
الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ۵۹

بقائمی ہوش وحواس کلام الٰہی سننے کی فرمائش

وَاِذْ	اور جب	قُلْتُمْ	تم نے کہا	یٰمُوْسٰی	اے موسیٰ	لَنْ	ہرگز نہیں
نُّؤْمِنَ	ہم ایمان لائیں گے	لَکَ	تجھ پر	حَتّٰی	یہاں تک کہ		
نَرَی اللّٰہَ	ہم دیکھ لیں اللہ کو	جَھْرَۃً	ظاہراً	فَاَخَذَتْکُمُ	تو پکڑ لیا تمہیں		

الصّٰعِقَةُ	بجلی نے	وَاَنْتُمْ	اور تم	تَنْظُرُوْنَ(55)	تم سب دیکھ رہے تھے۔

جب موسیٰ (علیہ السلام) تورات لے کر کوہ طور سے واپس لوٹے اور قوم کے سامنے کتاب پیش کی تو کہنے لگے۔ ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ کتاب واقعی منزل من اللہ ہے اور اللہ تعالیٰ فی الواقع آپ سے ہم کلام ہوا تھا۔ اس صورت حال سے موسیٰ (علیہ السلام) سخت پریشان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ ستر آدمیوں کو بھی اپنے ساتھ طور پہاڑ پر لے آؤ۔ چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب کئے اور انہیں اپنے ہمراہ طور پر لے گئے کہ وہ خود بقائمی ہوش وحواس کلام الٰہی کو سن لیں۔ پھر جب انہوں نے کلام الٰہی سن لیا تو کہنے لگے: موسیٰ (علیہ السلام) پردے میں سننے کا ہمیں کچھ اعتبار نہیں اور ہم تو جب تک اللہ کو صاف صاف دیکھ نہ لیں، تمہاری بات پر اعتبار نہیں کریں گے۔

تفسیری روایات اور بائیبل کی ہدایات کے مطابق جب ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام بالمشافہ سننے کے بعد بھی توراۃ کو کتاب الٰہی تسلیم نہ کیا "فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ " تو انہیں بجلی نے پکڑ لیا۔ ان کی سرکشی کی یہ سزا دی گئی کہ یکدم بجلی چمکی اور سب کو فنا کر گئی اور جوان لوگوں کی تباہی کا باعث بنی۔ بنی اسرائیل کو یاد دلایا گیا۔ کہ یہ سارا واقعہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ "وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝۵۵ " کیونکہ اس جہاں میں کسی شخص کے پاس یہ صلاحیت موجود نہیں ہے۔ جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کر سکے اس مادی جہان کے بعد جب اگلے جہان میں پہنچیں گے تو وہاں پر یہی نگاہیں اتنی طاقتور ہو جائیں گی کہ ان میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی حضور ﷺ کا فرمان ہے" تم مرے بغیر اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ قیامت کے بعد جنت میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کی رویت تمام محدثین اور فقہاء کے نزدیک بالاتفاق ثابت ہے۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ قرآن پاک میں موجود ہے" وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ " کئی چہرے ان دن تروتازہ ہوں گے۔ اور اپنے رب کا دیدار کرنے والے ہوں گے۔ اس سے مراد مومنین کے چہروں کی وہ بے مثال خوبصورتی، تروتازگی اور نورانیت ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت، بخشش اور انعامات کو دیکھ کر ان پر طاری ہوگی، مگر یہ سب اگلے جہان کی بات ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ آخرت میں

مومنین کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، یہی اہلِ سنت کا عقیدہ ہے اور اس پر قرآن وحدیث اور اِجماع کے کثیر دلائل قائم ہیں اور یہ دیدار کسی کَیفِیَّت اور جہت کے بغیر ہوگا۔صحیح بخاری ومسلم کی متفقہ احادیث میں بھی اس بات کی تصدیق کی گئی ہے کہ مؤمنین روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کا دیدار بالکل ایسے ہی واضح طور پر کریں گے جیسے چودھویں کا چاند یا بے بادل سورج دیکھا جاتا ہے۔

موت کی بعد کی زندگی اس پر اشکال

ثُمَّ	پھر	بَعَثْنٰكُمْ	ہم نے زندہ کیا تمہیں
مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ	تمہاری موت کے بعد	لَعَلَّكُمْ	تا کہ تم
تَشْكُرُوْنَ(56)	تم شکر گزار بن جاؤ۔		

جب بنی اسرائیل نے یہ بے ادبی کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھے بغیر اس کتاب پر ایمان نہیں لائیں گے۔تو اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوا۔بجلی پڑی اور ستر کے ستر آدمی ہلاک ہو گئے۔اب موسیٰ (علیہ السلام) کو ایک اور پریشانی لاحق ہوگئی جیسا کہ سورہ اعراف میں آیا ہے۔موسیٰ (علیہ السلام) نے نہایت عاجزی کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں دعا کی۔مولا کریم! اگر تو چاہتا تو مجھے بھی ہلاک کر دیتا۔تو ان اسرائیلیوں کو اس سے پہلے بھی ہلاک کر سکتا تھا۔یہ بیوقوف ہیں۔ان کی وجہ سے میری ذات پر کوئی حرف نہ آئے اگر میں واپس قوم میں اکیلا جاؤں گا تو وہ کہیں گے کہ ہمارے آدمی لے جا کر مروا دیے۔اے مولا کریم! مہربانی فرما! نتیجہ یہ ہوا۔کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔اور فرمایا"

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ " پھر ہم نے تمہاری موت کے بعد تمہیں اٹھایا۔صریح الفاظ موجود ہیں۔وہ لوگ مر چکے تھے۔موت کے بعد انہیں زندہ کیا۔بعض توجیہ کرتے ہیں۔کہ مرے نہیں تھے۔بلکہ سکتہ پڑ گیا تھا۔پھر ہوش میں آگئے۔یہ بات درست نہیں۔مَوْتِكُمْ " سے واضح ہے کہ ان لوگوں کی موت واقع ہوگئی تھی۔اور پھر تفسیری روایتوں میں یہ بھی آتا ہے(1۔تفسیر ابن کثیر ج 1 ص 93) کہ ان کی زندگی سر کی طرف سے شروع ہوئی وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے

جسم کا باقی حصہ راکھ ہو چکا ہے۔ پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اور پھر وہ پورے کے پورے زندہ ہو گئے۔ یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ فرمایا یہ اس واسطے کیا" لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٦﴾ تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔ الغرض! ان ستر آدمیوں کو اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد دوبارہ زندگی دی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ ان لوگوں نے دوبارہ زندہ ہو کر اقرار کیا۔ کہ ہم ہی غلطی پر تھے۔ ہمیں ایسی گستاخی نہیں کرنی چاہئے تھی کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ کرتے اس کے بعد انہوں نے قوم میں آکر گواہی دی۔ کہ بیشک ہم نے خدا تعالیٰ کا کلام سنا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب عطا کی ہے۔ اے بنی اسرائیل! اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

من وسلویٰ کی حقیقت

وَظَلَّلْنَا	اور ہم نے سایہ کیا	عَلَيْكُمُ	تم پر	الْغَمَامَ	بادل کا
وَاَنْزَلْنَا	اور ہم نے نازل کیا	عَلَيْكُمُ	تم پر	الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى	من اور سلویٰ
كُلُوْا	تم سب کھاؤ	مِنْ طَيِّبٰتِ	پاکیزہ چیزوں سے		
مَا رَزَقْنٰكُمْ	جو ہم نے عطا کی ہیں تمہیں	وَمَا	اور نہیں		
ظَلَمُوْنَا	اُنہوں نے ظلم کیا ہم پر	وَلٰكِنْ	اور لیکن	كَانُوْٓا	وہ سب تھے
اَنْفُسَهُمْ	اپنے آپ پر	يَظْلِمُوْنَ (57)	وہ ظلم کرتے		

یہ واقعہ تفصیل سے سورہ مائدہ میں آئے گا۔ مختصر یہ کہ موسیٰ (علیہ السلام) جب بنی اسرائیل کو لے کر وادی سینا میں پہنچے تو اس وقت یہ قوم لاکھوں کی تعداد میں تھی۔ مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت کا منشاء یہ تھا کہ وہ بیت المقدس کو جو اُن کا قبلہ تھا مشرک قوموں سے پاک کریں اور اس کو پھر سے توحید کا مرکز بنائیں، لیکن جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر بیت المقدس کے پاس پہنچے اور انھوں نے قومِ عمالقہ (جو اس وقت بیت المقدس پر قابض تھے) کا ڈیل ڈول دیکھا تو جہاد سے صاف انکار کر دیا، اس کی سزا ان کو یوں ملی کہ ان کے چالیس برس ایک صحرائی میدان میں اس طرح

گذرے کہ صبح سے شام تک پھرتے رہتے اور منزلِ مقصود تک پہنچنے سے محروم رہتے، اس صحرا میں نہ کوئی مکان تھا، نہ ہرا بھرا درخت، نہ کوئی کھانے کی چیز ہی میسر تھی، خدائے کریم نے اس سرکش قوم پر اُس وقت بھی رحم کھایا، دھوپ سے بچاؤ کا یہ سامان فرمایا کہ ان پر مستقل بادلوں کا سایہ کر دیا، بائبل میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اسی طرح جہاد سے انکار کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ملک شام کی فتح چالیس سال تک کے لئے موخر کر دی۔ تاکہ اس عرصہ میں یہ بزدل نسل مرکھپ جائے اور آئندہ جو نسل اس بیابان اور آزادانہ فضا میں پیدا ہو۔ اس میں کچھ ہمت اور جرأت پیدا ہو اور جہاد کے قابل بن جائیں۔ اب سوال یہ تھا کہ اس بیابان میں نہ کوئی مکان تھے اور نہ سامان خورد و نوش اور لوگ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ اور خوراک کا یہ انتظام فرمایا کہ کثیر تعداد میں من وسلویٰ نازل فرمایا۔ من ایک میٹھی چیز تھی جو دھنیے کے بیج جیسی تھی اور رات کو اوس کی شکل میں نازل ہوتی تھی اور سلویٰ بٹیر کی قسم کے پرندے تھے جنہیں یہ لوگ بھون کر اور کباب بنا کر کھاتے تھے اور یہ غذائیں بلا مشقت انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کثیر مقدار میں اس طویل عرصہ میں ملتی رہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قوم پر خاص انعامات تھے۔ ورنہ جو مایوس کن جواب انہوں نے موسیٰ (علیہ السلام) کو دیا تھا۔ اگر اللہ چاہتا تو اس کی پاداش میں انہیں ہلاک کر دیتا اور پھر اس جزیرہ میں اس طرح زندگی بسر کرنا بھی ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہوا تھا۔ اسی جنگل میں سیدنا ہارون (علیہ السلام) کی وفات ہوئی۔ پھر ایک سال بعد سیدنا موسیٰ (علیہ السلام) کی بھی وفات ہوئی تھی۔

تحریف کلامِ الٰہی کی سزا

<table>
<tr><td>وَاِذْ</td><td>اور جب</td><td>قُلْنَا</td><td>ہم نے کہا</td><td>ادْخُلُوْا</td><td>داخل ہو جاؤ</td></tr>
<tr><td>هٰذِهِ الْقَرْيَةَ</td><td>اس بستی میں</td><td>فَكُلُوْا</td><td>پھر تم کھاؤ</td><td>مِنْهَا</td><td>اس سے</td></tr>
<tr><td>حَيْثُ</td><td>جہاں سے</td><td>شِئْتُمْ</td><td>تم چاہو</td><td>رَغَدًا</td><td>اطمینان سے</td></tr>
<tr><td>وَّادْخُلُوا</td><td>اور تم داخل ہو جاؤ</td><td colspan="2">الْبَابَ</td><td colspan="2">دروازے (میں)</td></tr>
<tr><td>سُجَّدًا</td><td>سجدہ کرتے ہوئے</td><td>وَّقُوْلُوْا</td><td>اور تم کہو</td><td>حِطَّةٌ</td><td>بخشش مانگنا</td></tr>
</table>

نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ	ہم معاف کردیں گے تم سے	خَطٰيٰكُمۡ	تمہاری خطائیں
وَسَنَزِيۡدُ	اور عنقریب ہم زیادہ دیں گے	الۡمُحۡسِنِيۡنَ(58)	نیکی کرنے والوں کو۔

اس آیت میں تحریف کلام الٰہی کی سزا کا ذکر کیا گیا ہے اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ جب حضرت یوشع (علیہ السلام) کا زمانہ آیا تب بنی اسرائیل نے اریحا شہر کو فتح کیا، مگر بتائے ہوئے لفظ کو بدل کر اور غرور و نخوت سے شہر میں داخل ہوئے۔ حکم ہوا تھا کہ شہر میں داخلہ کے وقت "حِطَّةٌ" یعنی استغفار کہنا مگر بنی اسرائیل نے اس کو "حِنۡطَةٌ" کہنا شروع کر دیا مزید نافرمانی یہ کی کہ بجائے عاجزی و انکساری کے اکڑتے ہوئے نخوت و غرور کا اظہار کرتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے اس صریح نافرمانی کی بدولت ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا، طاعون کی بیماری پھوٹ پڑی اور ستر ہزار اسرائیلی اس عذاب کا شکار ہو گئے۔ اس سے سبق یہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سیدھی راہ اختیار کرنی چاہیے نہ کہ نافرمانی اور غرور کا مظاہرہ کریں تو ایسی صورت میں عذاب الٰہی ضروری ہو جاتا ہے جو لوگ تکبر کرتے ہیں۔ اللہ انہیں پسند نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ بڑا غفور الرحیم ہے بنی اسرائیل کے قصہ سے صاف عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کو سبق سکھا رہا ہے کہ وہ کس قدر کرم نواز ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ بدکار، نافرمان اور ظالم انسانوں کو سزا ہی نہ دے۔ بار بار معاف کرنا اور سزا دے کر سمجھانا یہ شان کریمی نہیں تو اور کیا ہے، نخوت غرور بے راہ روی اور نافرمانی یقیناً قوموں کے زوال کا باعث بنتی ہے۔ استغفار کرتے رہنا چاہیے اور دعا مانگتے رہنا چاہیے انسان کی بھلائی اسی میں ہے کیونکہ گناہ اندھیرا ہے اور توبہ روشنی اور گناہوں پر نادم ہونا ان کو مٹا دیتا ہے۔ یعنی گناہ انسان کے دل و روح پر تاریکی اور بوجھ پیدا کرتا ہے، جبکہ توبہ اس تاریکی کو مٹا کر روشنی، سکون اور پاکیزگی بحال کرتی ہے۔ یہ روحانی اور اخلاقی اندھیرے سے اجالے کی طرف لوٹنے کا وہ خوبصورت عمل ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ معافی عطا فرماتا ہے۔

احکام الٰہی سے تمسخر اور مذاق

فَبَدَّلَ	پھر بدل ڈالا	الَّذِيۡنَ	جنہوں نے	ظَلَمُوۡا	ظلم کیا

قَوْلًا	بات کو	غَيْرَ الَّذِي	علاوہ جو	قِيلَ لَهُمْ	کہی گئی اُن سے
فَأَنْزَلْنَا	تو ہم نے نازل کیا	عَلَى الَّذِينَ	(اُن) پر جن		
ظَلَمُوا	سب نے ظلم کیا	رِجْزًا	عذاب	مِّنَ السَّمَآءِ	آسمان سے
بِمَا	اس وجہ سے جو	كَانُوا	وہ تھے	يَفْسُقُونَ(59)	وہ سب نافرمانی کرتے۔

اس کی وضاحت ایک حدیث میں آتی ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں ہے نبی ﷺ نے فرمایاان کوحکم دیا گیا کہ سجدہ کئے ہوئے داخل ہوں، لیکن وہ سروں کو زمین میں گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے اورحکم بجالانے کی بجائے ان سے ان کی سرتابی وسرکشی کا جوان کے اندر پیدا ہوگئی تھی اور احکام الہی سے تمسخراور مذاق جس کاارتکاب انہوں نے کیااندازہ کیاجاسکتا ہے۔واقعہ یہ ہے جب کوئی قوم کردار کے لحاظ سے زوال پذیر ہوجائے تواس کا معاملہ پھراحکام الٰہی کے ساتھ اسے طرح کا ہوجاتا ہے،یہ آسمانی عذاب کیا تھا؟ بعض نے کہا غضب الٰہی،بعض نے کہا کہ،طاعون۔اس کی آخری معنی کی تائید حدیث سے ہوتی ہے۔نبی ﷺ نے فرمایایہ طاعون اسی رجزاور عذاب کا حصہ ہے جوتم سے پہلے بعض لوگوں پر نازل ہوا۔تمہاری موجودگی میں کسی جگہ یہ طاعون پھیل جائے تو وہاں سے مت نکلو اور اگرکسی اور علاقے کی بابت تمہیں معلوم ہوکہ وہاں طاعون ہے تو وہاں مت جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بڑے انعام کئے۔ان کی نافرمانی اورمعصیت کی وجہ سےطرح طرح کی آزمائشیں بھی آتی تھیں۔اس کے باوجود یہ لوگ سرکشی میں مبتلا ہوئے۔جہاد کا انکارکیا۔نبی کی تکذیب کی۔اس کو ستایا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی خوراک کا غیر معمولی انتظام فرمایا۔

بارہ چشموں کا پھوٹنا / استسقاء کی حقیقت / فسادفی الارض حقیقتاً ہے کیا چیز؟

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْہُ اثْنَتَا عَشْرَۃَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَھُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰہِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ۞٦٠

استسقٰی کا لفظی معنی اور اس کی حقیقت

وَاِذِ	اور جب	اسْتَسْقٰی	پانی مانگا	مُوْسٰی	موسیٰ نے
لِقَوْمِہٖ	اپنی قوم کیلئے	فَقُلْنَا	تو ہم نے کہا	اضْرِبْ	تو مار
بِّعَصَاكَ	اپنی لاٹھی کو	الْحَجَرَ	پتھر (پر)	فَانْفَجَرَتْ	تو پھوٹ پڑے
مِنْہُ	اُس سے	اثْنَتَا عَشْرَۃَ	بارہ	عَیْنًا	چشمے
قَدْ	تحقیق	عَلِمَ	جان لیا	كُلُّ اُنَاسٍ	تمام لوگوں نے
مَّشْرَبَھُمْ	اپنا گھاٹ	كُلُوْا	تم سب کھاؤ	وَاشْرَبُوْا	اور تم سب پیو

مِنۡ رِّزۡقِ اللّٰهِ	اللہ کے رزق سے	وَلَا	اور مت	تَعۡثَوۡا	تم سب پھرو
فِی الۡاَرۡضِ	زمین میں	مُفۡسِدِيۡنَ (60)		فساد مچانے والے۔	

وَاِذِ اسۡتَسۡقٰى مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ ،اس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ استسقیٰ کا لفظی معنی طلب آب ہے۔اور اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑ گڑانا استغفار کرنا اور معافی مانگنا ہے۔حضرت ہود (علیہ السلام) اور حضرت نوح (علیہ السلام) کے واقعات میں ملتا ہے۔کہ قحط سالی کے دوران انہوں نے اپنی اپنی قوم سے کہا تھا اے قوم اپنے رب سے استغفار کرو اور توبہ کرو۔"يُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا" تا کہ وہ تمہارے لیے آسمان سے پانی برسائے۔جب کبھی دنیا خشک سالی کا شکار ہو جائے۔زمین، باغات، انسانوں، حیوانوں کے لیے پانی کی قلت پیدا ہو جائے تو فراہمی آب کے لئے کئی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔منجملہ ان تدابیر کے شریعت نے استغفار کو بڑی اہمیت دی ہے۔کہ انسان اپنے رب تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔صدقہ خیرات کریں،جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا۔ باران رحمت نازل کرے گا اور خشک سالی دور ہو جائے گی غرضیکہ استسقیٰ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے رو رو کر گناہوں کی معافی طلب کی جائے۔اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اِستغفار کرنے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرنے سے بے شمار دینی اور دُنیوی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو باقی تمام فقہاء پر فوقیت

فقہاء کرام میں سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو باقی تمام فقہاء پر فوقیت حاصل ہے۔فقاہت واجتہاد میں کوئی بھی آپ کا ہم پلہ نہیں۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو بڑی گہری بصیرت عطا فرمائی تھی۔انہوں نے دین کی ایسی زبردست خدمت کی ہے۔جو آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہے گی۔آپ نے دین کا نچوڑ اور خلاصہ اس طریقے پر پیش کیا کہ تمام عجمی قومیں اسے بخوشی قبول کر گئیں امت پر آپ کا بڑا احسان ہے۔جس طرح محدثین کرام نے احادیث کے الفاظ کی حفاظت کی۔مفسرین کرام

نے قرآن پاک کی تشریح بیان کی اسی طرح فقہائے کرام نے اجتہاد کے ذریعے ضروری مسائل کا استنباط کیا۔اور مشکلات کے حل پیش کئے۔انہوں نے دین اسلام کو احسن طریقے پر امت کے سامنے پیش کیا۔راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کیا۔

استسقا کی حقیقت

استسقا کی حقیقت یہ ہے کہ انسان گناہوں کی معافی طلب کرے۔اس کے لئے نماز پڑھنا بھی سنت ہے۔تاہم استسقا کے عام طور پر دو طریقے ہیں۔جیسا کہ حضور ﷺ نے آنے سے پہلا طریقہ یہ ہے مسلمان بستی سے باہر کھلے میدان میں نکل جائیں۔دو رکعت نماز ادا کریں۔فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ استسقاء کے لئے صرف مومن اکٹھے ہوں۔کسی کافر کو قریب نہ آنے دیں۔پھر عاجزی اور انکساری کے ساتھ دو نفل ادا کریں۔اس کے بعد دعا کریں اللہ تعالیٰ باران رحمت نازل کرے گا۔اور خشک سالی دور ہو جائے گی۔دوسرا طریقہ بھی حضور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے آپ منبر پر تشریف فرما تھے۔خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے آ کر عرض کیا کہ حضور! جانور ہلاک ہو رہے ہیں۔فصلیں تباہ ہو گئیں۔دعا کریں اللہ تعالیٰ پانی برسا دے۔آپ نے منبر پر بیٹھے بیٹھے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دے۔اس وقت آسمان بالکل صاف تھا۔بادل کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔آپ دعا فرما رہے تھے کہ کسی کنارے سے بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا دیکھتے ہی دیکھتے وہ بادل پھیل گیا اور یکا یک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی ایک تیسرا طریقہ بھی ہے کہ کسی بھی نماز کے بعد بارش کے لیے دعا کی جائے۔استسقا کی یہ مختلف صورتیں ہیں۔ان میں سے کوئی بھی صورت اپنائی جا سکتی ہے۔

بہر حال موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ساری قوم سخت پریشانی کے عالم میں تھی۔وہ موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئے۔مگر آپ دعا میں مصروف ہو گئے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور حکم دیا فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ یعنی اپنی لاٹھی اس پتھر پر مارو۔موسیٰ (علیہ السلام) نے حکم کی تعمیل کی۔جونہی لاٹھی پتھر پر ماری، فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور اس طرح اللہ

تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے پانی کا انتظام فرمادیا۔ یہ واقعہ بھی اس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل میدان تیہ (صحرائے سینا) میں محصور تھے وہاں پانی کا کوئی چشمہ نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے ایک معجزہ کے طور پر بارہ چشمے پیدا فرمادئے، حضرت یعقوب (اسرائیل) کے بارہ بیٹے تھے ہر بیٹے کی اولاد ایک مستقل قبیلہ بن گئی اور اس طرح بنی اسرائیل بارہ قبیلوں میں تقسیم ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے ہر قبیلے کے لئے الگ چشمہ جاری فرمادیا تا کہ کوئی الجھن پیش نہ آئے۔

پانی کے بارہ چشمے پھوٹنے کی حکمت یہ تھی۔ کہ بنی اسرائیل بارہ قبیلوں پر مشتمل تھے۔ ان کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان کے آپس کے کسی متوقع جھگڑے کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے ہر قبیلے کے لیے علیحدہ علیحدہ چشمہ مقرر کردیا۔ چشموں کا تعین ہر قبیلے کی تعداد کے لحاظ سے کیا گیا تھا۔ بڑے قبیلے کے لیے بڑا چشمہ مقرر رہوا۔ اور چھوٹے قبیلے کے لئے چھوٹا چشمہ۔ اس طرح گویا پانی تقسیم کردیا گیا۔ فرمایا:۔ قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ "ہر ایک نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کرلیا۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ہر قبیلے میں ایک ایک چشمہ تقسیم کردیا ہر قبیلے نے اپنی ضرورت کے مطابق نالیاں کھودلیں۔ اور پانی کو دور تک لے گئے۔

اس تقسیم سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ مشترکہ مفاد کی اشیا کی تقسیم عدل و انصاف پر ہونی چاہئے۔ تا کہ کسی قسم کا تنازعہ پیدا نہ ہو۔ حضرت صالح (علیہ السلام) کی اونٹنی والے معاملہ میں بھی پانی تقسیم کیا گیا تھا۔ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرۡبٌ وَّلَـكُمۡ شِرۡبُ يَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ "قوم صالح (علیہ السلام) سے فرمایا کہ پانی پینے کی ایک روز تمہاری باری ہوگی۔ اور ایک روز اونٹنی کی۔ قوم نے مقررہ حد سے تجاوز کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم تباہ ہوگئی۔

معجزہ اور کرامت

نبی کا معجزہ ہو یا ولی کی کرامت ہو۔ اصل حکم تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ کام کرنے والی وہی ذات ہے۔ اسی مقام پر آ کر لوگ ٹھوکر کھا جاتے۔ نبی کے معجزے یا ولی کی کرامت کو ان کا ذاتی فعل سمجھتے ہیں۔ اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات کو

ان کا ذاتی فعل سمجھا۔ وہ شرک میں مبتلا ہو گئے۔ حالانکہ وہ تو "بِاِذْنِ اللّٰهِ" تھا فرمایا "وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ" میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور برص کو ٹھیک کرتا ہوں۔ اور مردے میں جان ڈال دیتا ہوں۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی جو کرامات صحیح طریقے سے ثابت ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عزت بخشتے ہیں اس کے ہاتھ پر کرامت ظاہر ہو جاتی ہے اپنی مرضی سے تو کوئی نبی بھی معجزہ پیش نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک میں تصریح موجود ہے۔ "وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ" فعل تو اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ مگر نبی کے ہاتھ پر ظاہر کر دیا جاتا ہے۔

ہمارے ہادی اعظم (علیہ السلام) کی زندگی میں بیشمار معجزات پیش آئے۔ پتھروں سے پانی نکلنا تو عام مشاہدہ کی بات ہے۔ جنگلوں اور پہاڑوں سے چشمے نکلتے ہیں۔ مگر ہمارے نبی رحمت (علیہ السلام) کا معجزہ ملاحظہ فرمائیے کہ ہاتھ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں (1۔ بخاری ج 1 ص 505، مسلم ج 2 ص 245) کہ لشکر اسلامی جہاد کے لیے سفر پر تھا راستے میں پانی کی قلت پیدا ہو گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ کسی کے پاس تھوڑا بہت پانی ہے تو پیش کیا جائے۔ چنانچہ ایک لوٹے میں تھوڑا سا پانی حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس پانی سے وضو فرمایا پھر وہ پانی پیالے میں ڈال کر اپنا ہاتھ مبارک اس پیالے میں رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انگلیوں مبارکہ کے نیچے سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ آپ نے فرمایا یہ بابرکت پانی ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے نکالا ہے۔ آؤ پانی پی لو اور اس سے وضو کر لو گوں نے پانی حاصل کیا اس سے وضو کیا۔ اس میں سے پیا اور دوسری ضروریات پوری کیں۔ جب سارا لشکر سیراب ہو گیا۔ تو آپ نے اپنا ہاتھ مبارک اٹھا لیا اور پانی نکلنا بند ہو گیا۔ اسی لیے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر انبیاء (علیہم السلام) کو جو معجزات عطا کیے وہ اس کا کمال ہے مگر جو معجزات حضور ﷺ کو عنایت کیے وہ کمالوں سے بھی بڑھ کر کمال ہے۔ معجزہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا ہو یا ہمارے رسول اعظم ﷺ کا ہو۔ اصل میں کمال اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔

ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر

بنی اسرائیل کے کھانے کے لئے من وسلویٰ کا بندوبست ہوگیا۔اور پینے کے لیے بارہ چشمے جاری ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا "كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ" اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ اور پیو۔بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ساری نوع انسانی کو یہ بات سمجھا دی گئی ہے کہ ہر قسم کی روزی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے۔اسے کھاؤ اور پیو اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔شیخ سعدی نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔فرماتے ہیں کہ زمین وآسمان کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے گردش کر رہی ہیں۔تاکہ تو روٹی کو ہاتھ میں لائے اور غفلت سے نہ کھائے۔روٹی کھاتے وقت انسان کو غور کرنا چاہئے کہ روٹی کا یہ ٹکڑا کتنے مراحل طے کر کے آپ کے ہاتھ میں پہنچتا ہے۔کارخانہ قدرت میں لاکھوں مشینیں اور کروڑوں ہاتھ کام کر رہے ہیں۔جب ایک روٹی اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہے ،پانی کا ایک گلاس جو آپ کے ہونٹوں تک پہنچتا ہے۔یہ کن کن مشقتوں سے گزر کر آتا ہے۔اسی طرح لباس کی تیاری میں کتنی مشینیں،کتنا خام مال،کتنے انسانی دماغ اور ہاتھ کام کرتے ہیں۔تب جا کر زینت اور ستر پوشی کے لیے کپڑا مہیا ہوتا ہے۔یہ تمام چیزیں انسان کو غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں کہ جس مالک الملک نے انسان کو اس قدر انعامات سے نوازا ہے۔اس کی روزی استعمال کر کے کیا اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں ہوتا۔اسی لیے فرمایا کہ کس قدر ناانصافی کی بات ہوگی۔اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں استعمال کرنے کے بعد اس کی فرمانبرداری نہ کرو۔

قرآن پاک میں دوسری مقام پر آتا ہے۔" كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ حلال اور طیب چیزیں کھاؤ جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں" وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (172) "اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو،اگر تم اسی کے بندے ہو۔اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ناداروں کو محروم نہ رکھو۔تم سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے تم مالک ہو۔مگر اس بات کی طرف غور نہیں کرتے کہ یہ نعمت آئی کہاں سے ہے۔یہ کس کی عنایت ہے۔یاد رکھو۔اگر غریبوں،مسکینوں اور محتاجوں کو محروم رکھو گے۔ان کے حق ادا نہیں کرو گے تو یہ

اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور مستحقین پر زیادتی ہوگی۔ ہر صاحب استطاعت کا فرض ہے کہ وہ ناداروں کا خیال رکھے۔ اسے دیکھنا چاہئے کہ سوسائٹی میں کوئی بھوکا یا ننگا نہ رہے۔ خاص طور پر برسر اہان مملکت کا یہ فرض منصبی ہے۔ کہ اپنے اپنے ملک میں حاجت مندوں کی خبر گیری کریں لٰہذا یہ انسانوں کا اجتماعی فریضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی استعمال کریں۔ اور اس کا شکریہ بھی ادا کریں۔ آگے فرمایا وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ چلو،

فساد فی الارض کیا ہے؟

قرآن وتفاسیر کی روشنی میں ”فساد فی الارض“ ایک جامع اصطلاح ہے جس کا تعلق عملی، اخلاقی، معاشرتی اور اعتقادی بگاڑ سے ہے۔ مفسرین نے اس کی حقیقت مختلف پہلوؤں سے بیان کی ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے: سب سے بنیادی معنیٰ اللہ کی نافرمانی اور اس کی حدود کو توڑنا ہے۔ فساد فی الارض اس ہر چیز کا نام ہے جو: اللہ کی نافرمانی، عدل وامن کے نظام کا بگاڑ، معاشرتی انتشار، قتل وفتنہ، ظلم، لوٹ مار، راستہ روکنا، کھیتی اور نسل کی بربادی، قحط وخشک سالی کو جنم دے۔ قرآن کے مطابق یہ زمین کے نظام میں بگاڑ اور انسانوں کے باہمی معاملات میں خرابی پیدا کرتا ہے۔ یہ دراصل اللہ کی شریعت سے انحراف اور اس کے نتیجے میں اخلاقی، معاشی، سماجی اور فطری بگاڑ کا مجموعہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم سب نے خدا تعالیٰ کے قانون کو چھوڑ رکھا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ شیطان کے نقش قدم پر چلنا اسی کا نام ہے۔ الغرض فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ روزی سے کھاؤ پیو۔ مگر زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

طعام کی تبدیلی/ ذلت اور مسکنت کا مفہوم/ آیات الٰہی کا انکار

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۟۶۱

غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

وَاِذْ	اور جب	قُلْتُمْ	تم نے کہا	يٰمُوْسٰى	اے موسیٰ	لَنْ	ہرگز نہیں
نَّصْبِرَ	ہم صبر کریں گے	عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ	ایک کھانے پر				
فَادْعُ	پس آپ دعا کریں	لَنَا	ہمارے لئے	رَبَّكَ	اپنے رب سے		
يُخْرِجْ	وہ نکالے	لَنَا	ہمارے لئے	مِمَّا	(اس) سے جو		
تُنْۢبِتُ	اُگاتی ہے	الْاَرْضُ	زمین	مِنْۢ بَقْلِهَا	اُس کا ساگ		
وَقِثَّآئِهَا	اور اُس کی ککڑی	وَفُوْمِهَا	اور اس کی گندم				

اور اس کا پیاز	وَبَصَلِهَا	اور اس کی مسور	وَعَدَسِهَا

یہ بھی اسی جنگل کا واقعہ ہے جہاں ایک طویل مدت کے لئے بنی اسرائیل کو محصور کیا گیا تھا۔ انہیں من وسلویٰ جیسی نعمتیں بلا مشقت مل رہی تھیں۔ مگر وہ ان چیزوں کو کھاتے کھاتے اکتا گئے تھے تو زمینی پیداوار کا مطالبہ کر دیا۔ موسیٰ نے انہیں سمجھایا کہ جو چیز تمہیں یہاں سے بلا مشقت مل رہی ہے وہ اس سے بدرجہا بہتر ہے جو تم مانگ رہے ہو اور وہ مشقت کے بعد ہی تمہیں حاصل ہوگی۔ دراصل مسلسل غلامی کی وجہ سے بنی اسرائیل کی اخلاقی قدریں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ ان میں طرح طرح کی کمزوریاں پیدا ہو چکی تھیں۔ اسی غلامی کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا تھا غلامی میں بدل جاتا ہے۔ قوموں کا ضمیر۔ مقصد یہ کہ جب کوئی قوم کسی دوسری قوم کی غلام بن جاتی ہے۔ تو پھر نہ ان کا جسم اپنا ہوتا ہے۔ اور نہ ان کا ذہن اپنا ذہن ہوتا ہے۔ بلکہ یہ دونوں چیزیں غالب قوم کی تابع ہو جاتی ہیں۔ اس کی رائے اپنی رائے نہیں رہتی۔ اس کے اخلاق کا جنازہ نکل جاتا ہے چونکہ بنی اسرائیل لمبے عرصے تک فرعون کے غلام رہ چکے تھے۔ لہٰذا مذکورہ ساری کمزوریاں ان میں پائی جاتی تھیں۔ ارشاد ہوتا ہے "وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَٰحِدٍ" اے بنی اسرائیل اس واقعہ کو یاد کرو۔ جب تم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا۔ کہ ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔

بنی اسرائیل کی ناشکری

صحرائے سینا میں بلا مشقت من وسلویٰ کھاتے کھاتے بنی اسرائیل کے مزاج بھر چکے تھے۔ اور وہ کھانے میں تبدیلی چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے شکایت کی کہ ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ حالانکہ حقیقت میں من اور سلویٰ دو مختلف کھانے تھے۔ مگر مسلسل یہی کھانا کھانے کی وجہ سے انہوں نے انہیں ایک ہی کھانا کہا۔ کہ اب ہم زیادہ دیر تک اس کھانے سے شکم پری نہیں کر سکتے۔ اسرائیلی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے وہ کہنے لگے کہ ہمیں تو مصر کی مچھلی یاد آرہی ہے۔ وہاں ہمیں مختلف قسم کی سبزیاں اور ترکاریاں میسر آتی تھیں۔ اور یہاں پر ایک ہی قسم کا

کھانا کھا کھا کر تنگ آچکے ہیں اے موسیٰ (علیہ السلام)" فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ " آپ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کریں۔" يُخْرِجْ لَنَا " کہ وہ نکالے ہمارے لئے" مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وہ چیزیں جن کو زمین اگاتی ہے۔" مِنْۢ بَقْلِهَا اپنی تر کاریوں سے" بَقْل: ہر قسم کی ہری سبزی یا ساگ۔۔ وَقِثَّآىِٕهَا" اور اپنی ککڑیوں سے" قِثَّاء: ککڑی، کھیرے یا تر وَفُوْمِهَا" اور گندم سے" فُوْم: اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد گیہوں (گندم) ہے، جبکہ بعض اسے لہسن بھی مانتے ہیں۔ وَعَدَسِهَا" اور مسور سے" عَدَس: یعنی مسور کی دال وَبَصَلِهَا" اور اپنے پیاز سے۔ یعنی اے موسیٰ! ہمیں توان چیزوں کی ضرورت ہے۔ اپنے رب سے کہہ کر ہمیں یہ دلوایے۔ من وسلویٰ جیسی قوت بخش غذا سے ان کا جی بھر گیا تھا۔ اور وہ اس قسم کی چٹ پٹی چیزوں سے اپنے منہ کا ذائقہ بدلنا چاہتے تھے۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل کو میدانِ تیہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسمانی غذا' من وسلویٰ مفت اور بغیر محنت کے ملتی تھی۔ لیکن وہ اس نعمت سے اکتا گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسانوں جیسی عام سبزیاں اور دالیں مانگیں۔

اعلیٰ چیز کے بدلے ادنیٰ اور کمتر چیز لینا چاہتے ہو؟

قَالَ	اس نے کہا		اَتَسْتَبْدِلُوْنَ	کیا تم بدلنا چاہتے ہو	
الَّذِىْ	جو	هُوَ اَدْنٰى	وہ ادنیٰ (ہے)	بِالَّذِىْ	(اُس کے) بدلے میں جو
هُوَ خَيْرٌ	وہ بہتر (ہے)		اِهْبِطُوْا مِصْرًا	تم اتر جاؤ شہر میں	

اور فرمایا قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ اِهْبِطُوْا مِصْرًا " کیا تم ایک ادنیٰ اور گھٹیا چیز کو اعلیٰ اور بڑھیا چیز سے بدلنے کے خواہش مند ہو۔ تم کتنے بیوقوف ہو۔ کہ اللہ تعالیٰ تو تمہیں من وسلویٰ جیسی بہترین غذا فراہم کر رہا ہے۔ یعنی" من وسلویٰ" جیسی عمدہ، لذیذ اور بے محنت حاصل ہونے والی غذا کی جگہ یہ معمولی ساگ سبزی کی خواہش کرتے ہو! اور تم سبزی تر کاری اور لہسن پیاز کے پیچھے پھر رہے ہو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بالکل مفت من وسلویٰ دے رکھا تھا۔ اور پھر وہ حساب وکتاب سے بری تھے۔ ان چیزوں کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ پھر

ان کے مطلوبہ لہسن پیاز پر تو حساب کتاب بھی ہوگا۔ یہ بھی ان کے گھاٹے کا سودا تھا۔ مگر وہ اسی پر مصر تھے۔ جب بنی اسرائیل کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کی زبان سے کہلوایا۔ کہ اگر تم یہی چاہتے ہو۔ا "اِهۡبِطُوۡا مِصۡرًا " تو کسی شہر میں اتر جاؤ۔ وہاں جا کر کھیتی باڑی کرو۔ ہل چلاؤ۔ آبپاشی کرو۔ اور اپنے لیے اپنی مرضی کی چیزیں کاشت کرو۔" فَاِنَّ لَـكُمۡ مَّا سَاَلۡتُمۡ " پس جو کچھ تم چاہتے ہو۔ تمہیں مل جائے گا۔ البتہ ذرا محنت مشقت کرنی پڑے گی۔ مصر سے مراد یہاں ملک مصر نہیں، بلکہ کوئی ایک شہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں سے کسی بھی شہر میں چلے جاؤ اور وہاں کھیتی باڑی کرو، اپنی پسند کی سبزیاں، دالیں اگاؤ اور کھاؤ۔ ان کا یہ مطالبہ چونکہ کفران نعمت اور استکبار پر مبنی تھا، اس لئے زجر و توبیخ کے انداز میں ان سے کہا گیا" تمہارے لئے وہاں مطلوبہ چیزیں ہیں۔

مسکنت و دناءت کا اصل معنیٰ و مفہوم

فَاِنَّ	پس بیشک	لَـكُمۡ	تمہارے لئے	مَّا سَاَلۡتُمۡ	جو تم نے مانگا ہے	
وَضُرِبَتۡ	اور مسلط کر دی گئی	عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ	اُن پر ذلت			
وَالۡمَسۡكَنَةُ	اور محتاجی	وَبَآءُوۡ	اور وہ لوٹے	بِغَضَبٍ	غضب کے ساتھ	
مِّنَ اللّٰهِ	اللہ (کی طرف) سے					

مسکنت' کا اصل معنیٰ 'محتاجی' ہے، مولانا دریابادی نے یہی ترجمہ کیا ہے، مسلسل فقر و افلاس قوم کے اندر دناءت و پستی کی کیفیت بھی پیدا کر دیتا ہے؛ گویا یہ پستی محتاجی کا نتیجہ ہے؛ اسی لئے مولانا محمود حسن صاحب اور مولانا تھانوی نے 'پستی' سے ترجمہ کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ فقر و احتیاج تو آنی جانی چیز ہے اور آج دولت جتنی یہود کے پاس ہے شاید کسی اور قوم کے پاس ہو؛ عربی لفظ" دناءت" (دَنَاءَة) کا بنیادی مفہوم پستی، گھٹیا پن اور اخلاقی کمینگی ہے، دناءت کا جامع مطلب و مفہوم یہ بنتا ہے:" اخلاقی پستی، کمینگی، گھٹیا پن، ذلت اور وہ صفت جو انسان کو خیر و شرافت سے دور اور رذالت کے قریب کر دے۔ لیکن دناءت و پستی ایسا وصف ہے۔ جس سے کبھی یہ قوم آزاد نہ ہو سکی اور نہ آج ہے۔" اور یہ جو

مشہور بات ہے کہ یہودی دنیا میں امیر ترین قوم ہیں۔ مگر یہ درست نہیں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہودیوں میں بھی مال و دولت تھوڑے لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ ورنہ اکثریت ان کی بھی محتاج ہی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہودی مالدار بھی ہوں تو پھر بھی ان کی حالت خستہ ہی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو مسکین ہی ظاہر کرتے ہیں۔ حکومت سے محرومی بھی ذلت و رسوائی کی نشانی ہے۔ یہ قوم دو تین ہزار سال تک حکومت سے محروم رہی۔ دنیا میں کسی جگہ ان کی سلطنت نہیں تھی۔ یہ لوگ اتنے لمبے عرصہ تک دربدر مارے مارے پھرتے رہے۔ ان کو کسی دوسری حکومت نے بھی برداشت نہ کیا۔ جرمنی والے ان کے دشمن۔ اٹلی والے ان کے دشمن۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

یہ سازشی ذہن کے لوگ ہیں۔ انہیں کوئی بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آج اعتراض ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ دنیا میں یہودیوں کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ ان کا کوئی ملک نہیں ہوگا۔ مگر ان کی سلطنت قائم ہو چکی ہے۔" معاذ اللہ قرآن پاک کا دعویٰ غلط ہو گیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ چوتھے پارے میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قوم کو کبھی اقتدار نصیب نہیں ہوگا۔ مگر دو شرطوں کے ساتھ" اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ "یعنی یا تو اللہ تعالیٰ کی رسی کو پکڑ لینے سے یا پھر لوگوں کی رسی کو تھام لینے کی وجہ سے ہاں قرب قیامت میں دجال کے ظہور کے وقت ان کو عروج حاصل ہوگا۔ تو اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کے تو یہ قریب بھی نہیں جاتے۔ البتہ انہوں نے لوگوں کی رسی کو پکڑ رکھا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس وغیرہ کے دامن سے چمٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کو وطن بھی حاصل ہو گیا ہے۔ اور باقی دنیا کو آنکھیں بھی دکھانے لگے ہیں۔ ان کی سلطنت کا قیام محض امریکہ کی بے ایمانی کا نتیجہ ہے۔ آج امریکہ اگر اپنا ہاتھ اٹھالے تو یہودی سلطنت دو دن بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ الغرض! اگر آج یہودیوں کو کسی خطہ زمین پر عروج حاصل ہوے تو وہ بھی قرآن پاک کے بیان کردہ اصول کے مطابق ہی ہے۔ ورنہ اس قوم کی حقیقت یہی ہے وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہی لے کر لوٹے۔ اور وہ غضب

الٰہی کے مصداق بن گئے۔

داعیان حق کا قتل اور ان کی تذلیل واہانت

ذٰلِكَ	یہ اس وجہ سے	بِاَنَّهُمْ	کہ بیشک	كَانُوْا	وہ تھے

يَكْفُرُوْنَ	وہ سب انکار کرتے	بِاٰيٰتِ اللّٰهِ	اللہ کی آیات کا

وَيَقْتُلُوْنَ	اور وہ قتل کرتے	النَّبِيّٖنَ	نبیوں کو	بِغَيْرِ الْحَقِّ	ناحق

قتل کے ساتھ 'ناحق' کا لفظ محض اظہارِ واقعہ کے لئے ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا قتل تو ناحق ہی ہوگا، خود بائبل کے بیان کے مطابق یہودیوں نے یسعیاہ نبی، یرمیاہ نبی، زکریا نبی اور یحییٰ نبی علیہم الصلوٰۃ والسلام کا قتل کیا اور اپنے تئیں بنی اسرائیل کے آخری نبی حضرت مسیح کے قتل کی بھی کوشش کی، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ان کی بدسلوکی کی داستان بہت دراز ہے اور بائبل کا عہد عتیق اور عہد جدید اب بھی اس شقاوت کے تذکرے سے بھرا پڑا ہے۔ یہ ذلت وغضب الٰہی کی وجہ بیان کی جارہی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار اور اللہ کی طرف بلانے والے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور داعیان حق کا قتل اور ان کی تذلیل واہانت، یہ غضب الٰہی کا باعث ہے۔ کل یہود اس کا ارتکاب کر کے مغضوب اور ذلیل ورسوا ہوئے تو آج اس کا ارتکاب کرنے والے کس طرح معزز اور سرخرو ہو سکتے ہیں: " أَيْنَ مَا كَانُوْا وَحَيْثُ مَا كَانُوْا" "وہ کوئی بھی ہوں اور کہیں بھی ہوں۔"

مَنْهِيَّات سے باز رہا جائے اور مَأْمُوْرَات کو بجالایا جائے

ذٰلِكَ بِمَا	یہ اس وجہ سے	عَصَوْا	اُنہوں نے نافرمانی کی
وَّكَانُوْا	اور وہ تھے	يَعْتَدُوْنَ(61)	حد سے تجاوز کرتے۔

فرمایا " ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ " بنی اسرائیل کی ذلت و رسوائی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔ جب کوئی انسان نافرمانی کرتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برستی ہے۔ ابلیس کا بھی یہی حال ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ

اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ جاؤ تم پر قیامت تک میری لعنت پرستی رہے یہ ذلت و مسکنت کی دوسری وجہ ہے۔ عَصَوۡا (نافرمانی کی) کا مطلب ہے جن کاموں سے انہیں روکا گیا تھا، ان کا ارتکاب کیا اور (یَعۡتَدُوۡنَ) کا مطلب ہے مامور بہ کاموں میں حد سے تجاوز کرتے تھے۔ اطاعت و فرمانبرداری یہ ہے کہ مَنۡہِیَّات سے باز رہا جائے اور مَاۡمُوۡرَات کو اس طرح بجالایا جائے جس طرح ان کو بجا لانے کا حکم دیا گیا ہو۔ اپنی طرف سے کمی بیشی یہ زیادتی (اعۡتِدَاء) ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ خلاصہ اس آیت کا یہ کہ ذلت اور بدحالی کے علاوہ اللہ کا غضب یہ ہوا کہ ان کی ٹریننگ اور تربیت کی مدت کو پھیلا کر چالیس سال تک بڑھا دیا گیا۔ ورنہ اگر اللہ اور اس کے پیغمبر موسیٰ (علیہ السلام) کی مرضی پر چلتے تو ممکن تھا کہ چالیس سال گزرنے سے پہلے ہی شام کا ملک فتح کرنے کے قابل ہو جاتے۔ مگر ان لوگوں کی عادت ہی یہ بن گئی تھی کہ جو بات اپنی مرضی کے خلاف دیکھتے تو فوراً نافرمانیوں پر اتر آتے تھے حتیٰ کہ بعض انبیاء تک کو قتل کرتے رہے اور اللہ کے غضب، ذلت اور مسکنت کی دوسری صورت یہ ہے کہ یہودی قوم کئی بار دوسری قوموں سے پٹ چکی ہے۔ مالدار ہونے کے باوجود آج بھی سخت افرادی قلت سے دوچار ہے اور ایک چھوٹے سے خطہ میں ان کی حکومت قائم ہوئی بھی ہے تو وہ دوسری قوموں کے سہارے پر اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اخلاقی انحطاط اس قدر ہے کہ آج بھی بے حیائی، فحاشی، سودخوری اور حرام خوری اس قوم کا طرہ امتیاز ہے۔ اے مسلمانو! اگر تم بھی انہیں لوگوں کی روش پر چلو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ تمہاری صحت ایمانی بھی جاتی رہے گی۔ اور ذائقہ ایمانی بھی تبدیلی ہو جائے گا۔

بنی اسرائیل کا عہد/ دین میں جبر نہیں کا مطلب

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ وَاِذْ
اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْکُرُوْا مَا فِیْهِ
لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُهٗ
لَکُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۶۴﴾

یہود، نصاریٰ اور صابئین

اِنَّ الَّذِیْنَ	بے شک جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے	وَالَّذِیْنَ	اور جو				
ھَادُوْا	یہودی بنے	وَالنَّصٰرٰی	اور نصاریٰ	وَالصّٰبِـِٕیْنَ	اور بے دین				
مَنْ اٰمَنَ	جو ایمان لایا	بِاللّٰہِ	اللہ پر	وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ	اور آخرت کے دن پر				
وَعَمِلَ	اور عمل کیا	صَالِحًا	نیک	فَلَھُمْ	تو اُن کیلئے	اَجْرُھُمْ	اُن کا اجر ہے		
عِنْدَ رَبِّھِمْ	اُن کے رب کے پاس	وَلَا خَوْفٌ	اور نہ کوئی خوف ہوگا						
عَلَیْھِمْ	اُن پر	وَلَا ھُمْ	اور نہ وہ	یَحْزَنُوْنَ (62)	غمگین ہوں گے۔				

يَهُود هَوَادَةٌ (بمعنی محبت) سے یا تَهَوُّدٌ (بمعنی توبہ) سے بنا ہے۔گویا ان کا یہ نام اصل میں توبہ کرنے یا ایک دوسرے کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے پڑا۔تاہم موسیٰ (علیہ السلام) کے ماننے والوں کو یہود کہا جاتا ہے۔

نَصَارَىٰ، نَصْرَانٌ کی جمع ہے۔جیسے سُكَارَىٰ سَكْرَانُ کی جمع ہے۔اس کا مادہ نصرت ہے۔آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی وجہ سے ان کا نام پڑا،ان کو انصار بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو کہا تھا: نَحْنُ أَنْصَارُ اللهِ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پیروکاروں کو نصاریٰ کہا جاتا ہے، جن کو عیسائی بھی کہتے ہیں۔یہاں 'نصاریٰ' سے حقیقی عیسائی یعنی وہ لوگ مراد ہیں، جو حضرت مسیح کو اللہ کا بندہ اور رسول یقین کرتے تھے، نہ کہ وہ لوگ جو آپ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں؛ اس لئے کہ جو حضرت مسیح کو 'ابن اللہ' مانتے ہیں، وہ تو اللہ پر ایمان ہی سے محروم ہیں اور یہاں اللہ پر ایمان رکھنے کی شرط ہے۔

صَابِئِينَ صَابِئٌ کی جمع ہے۔یہ لوگ وہ ہیں جو یقیناً ابتداءً کسی دین حق کے پیرو رہے ہوں گے (اسی لئے قرآن میں یہودیت وعیسائیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے) لیکن بعد میں ان کے اندر فرشتہ پرستی اور ستارہ پرستی آ گئی، یا یہ کسی بھی دین کے پیرو نہ رہے۔اسی لئے لا مذہب لوگوں کو صابی کہا جانے لگا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار گروہوں یعنی مؤمنین، یہود، نصاریٰ اور صائبین کا ذکر فرمایا ہے۔البتہ سورہ حج میں پانچویں گروہ مجوسیوں کا ذکر بھی آیا ہے۔نزول قرآن کے وقت جو فرقے پائے جاتے تھے۔ان میں مشرکین۔یہود، نصاریٰ اور صابی ہیں۔حضرت مولانا شیخ الہند اپنی تفسیر کے حاشیہ پر لکھتے ہیں (1۔قرآن مجید مترجم ص 13 مطبوعہ دار التصنیف کراچی) کہ یہود حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی امت کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی امت کو کہتے ہیں البتہ صابی ایک ایسا فرقہ ہے جس نے مختلف ادیان سے بعض ایسی چیزوں کو اختیار کر لیا ہے۔جنہیں وہ اچھا سمجھتے تھے۔اس فرقہ کے پیروکار حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو مانتے ہیں۔فرشتوں کی پرستش کرتے ہیں۔زبور پڑھتے اور کعبے کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ لوگ بہت سی

جائز باتوں میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔

اس میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف ہے، تاہم ان اقوال سے اتنی بات بہرحال واضح ہے کہ قرآن کے نازل ہونے کے زمانہ میں اس نام سے ایک ایسی قوم موجود تھی، جو توحید و رسالت پر ایمان رکھتی تھی اور اپنے آپ کو کسی ایسے پیغمبر سے منسوب کرتی تھی، جن کی نبوت کی قرآن مجید نے تصدیق کی ہے۔ اللہ پر ایمان 'رسول اور آسمانی کتاب پر ایمان' کو بھی شامل ہے، چوں کہ مسلمان، یہودی، نصاریٰ اور صابی رسول اور آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے ہی تھے؛ اس لئے رسول پر ایمان رکھنے کا مستقل اور علاحدہ ذکر نہیں فرمایا گیا۔ اس آیت سے پہلی آیات اور اس کے بعد والی آیات میں بنی اسرائیل پر انعامات اور ان کے مقابلے میں ان کے اعمال بد کا تذکرہ ہے۔ یہ آیت درمیان میں ایک خاص مناسبت کی بنا پر آئی ہے، وہ یہ کہ جب بات ان پر ذلت و مسکنت مسلط ہونے اور اللہ کے غضب کا نشانہ بننے تک پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی عادت کے مطابق ان کے لیے اپنی رحمت کا تذکرہ ضروری سمجھا کہ بنی اسرائیل کا ہر فرد اس ذلت و مسکنت اور غضب الٰہی کا نشانہ نہیں، پہلے بھی اللہ تعالیٰ بیحد مہربان تھا اور توبہ کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوگا، خواہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہو، جیسے آپ سے پہلے اپنے اپنے انبیاء پر ایمان لا کر عمل صالح کرنے والے لوگ ہوں، یا آپ کے زمانے میں یہود و نصاریٰ میں سے ایمان لانے والے ہوں، مثلاً عبداللہ بن سلام، صہیب اور سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم، سب کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے۔ یہود و نصاریٰ کو مزید مانوس کرنے کے لیے مسلمانوں اور صابئین کا بھی ساتھ ذکر کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کسی خاص نسل کے ساتھ مخصوص نہیں، شرط صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔ [التحریر والتنویر]

شریعت کے احکام میں اولین حکم

خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد اب آپ ﷺ کی شریعت پر عمل کرنا ہی ''عمل صالح'' ہے؛ اس لئے اب 'عمل صالح' سے شریعت محمدی پر عمل کرنا مراد ہے، معلوم ہوا کہ آپ ﷺ

کی تشریف آوری کے بعد یہودیت اور عیسائیت کے ساتھ توحید وآخرت پر ایمان اور اچھے اعمال کافی نہیں ہیں ؛ بلکہ شریعت محمدی ﷺ کو تسلیم کرنا اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے اور شریعت کے احکام میں سے اولین حکم آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان لانا، آپ ﷺ سے محبت کرنا اور آپ ﷺ کا احترام کرنا بھی ہے۔ الغرض! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نجات کا یہ قانون سمجھا دیا کہ نجات کسی خاص فرقہ گروہ کے لیے مختص نہیں ہے۔ ایمان کا دعویدار ہو یا یہودیت کا۔ کوئی عیسائی مذہب رکھتا ہے یا صابی۔ نجات کے لیے واحد قانون یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ آخرت کے دن پر ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ کے نبیوں، کتابوں اور فرشتوں پر ایمان لائے اور عمل صالحہ انجام دے۔ اس کے بغیر نجات نہیں ہے۔ ہر گروہ اپنے ہی فرقے کو افضل اور حق پر سمجھتا ہے۔ مگر نجات کا دارومدار اسی قانون پر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا۔ آگے قانون کی مزید تشریح آرہی ہے۔

ایک ہیبت ناک منظر

وَاِذۡ	اور جب	اَخَذۡنَا	ہم نے لیا	مِيۡثَاقَكُمۡ	تم سے پختہ عہد
وَرَفَعۡنَا	اور ہم نے اٹھایا	فَوۡقَكُمُ	تمہارے اوپر	الطُّوۡرَ	طور (پہاڑ)
خُذُوۡا	تم تھام لو	مَآ اٰتَيۡنٰكُمۡ	جو ہم نے دیا تم کو	بِقُوَّةٍ	مضبوطی سے
وَّاذۡكُرُوۡا	اور تم یاد رکھو	مَا فِيۡهِ	جو اس میں (ہے)		
لَعَلَّكُمۡ	تا کہ تم	تَتَّقُوۡنَ(63)	تم بچ جاؤ۔		

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے تورات پر عمل کا عہد لیتے ہوئے ایک ہیبت ناک منظر پیدا فرما دیا، تا کہ وہ دل سے یہ عہد کریں۔ اس وقت وہ پہاڑ کے دامن میں تھے کہ زلزلے کے ساتھ پہاڑ اکھڑ کر (وَاِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ) ان پر جھک گیا اور سائبان کی طرح ان پر سایہ فگن ہو گیا، حتیٰ کہ انھیں یقین ہو گیا کہ وہ ان پر گرنے ہی والا ہے۔ یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کے اس دور سے تعلق رکھتا ہے۔ جب ان کے ستر منتخب افراد پر بجلی گرا کر انہیں ہلاک کیا گیا اور پھر دوبارہ زندہ کیا گیا تھا۔ ان کو بھی اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کے دوسرے لوگوں کو بھی طور کے دامن میں کھڑا کیا گیا اور طور

پہاڑ کو ان پر اس طرح جھکا دیا گیا جیسے وہ ان کے اوپر ایک سائبان ہے۔ اب پیچھے سمندر تھا اور آگے سروں کے اوپر سائبان کی طرح طور پہاڑ، اس وقت ان سے پوچھا گیا بتاؤ تورات پر عمل کرتے ہو یا نہیں؟ اور اقرار کرتے ہو تو پھر پوری مضبوطی سے عہد و پیمان کرو، ورنہ ابھی اس پہاڑ کو تمہارے اوپر گرا کر تمہیں کچل دیا جائے گا۔ اس وقت بنی اسرائیل کو اپنی نافرمانیوں اور غلطیوں اور عہد شکنیوں کا احساس ہوا اپنے گناہوں سے توبہ کی اور تورات پر عمل پیرا ہونے کا پختہ اقرار کیا۔ اور یہ اس لیے کیا گیا تھا تاکہ تم لوگوں میں کچھ پرہیز گاری کی صفت پیدا ہو۔ اولاً تو بنی اسرائیل نے تورات کو اللہ کی طرف سے ماننے میں ہی بہت پس و پیش سے کام لیا اور خدا کی آواز سننے اور خدا کو دیکھنے کی جسارت انگیز شرطیں لگائیں، پھر جب ماننے سے چارہ نہ رہا تو کچھ احکام کے بارے میں مطالبہ کرنے لگے کہ ان کو نکال دیا جائے، اس ناشائستہ مطالبہ پر اللہ تعالیٰ نے ان پر ''طور'' نامی پہاڑ کو اُٹھا لیا کہ تورات کو قبول کرو، ورنہ اس پہاڑ کے نیچے ریزہ ریزہ کر دیئے جاؤ گے، اب جا کر اس سرکش قوم نے تورات کو قبول کرنے کی ہامی بھری، بائبل میں بھی یہ واقعہ آیا ہے (خروج: ۱۹/ ۱۷-۱۸)

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

قرآن مجید کا بیان بالکل واضح ہے کہ خود پہاڑ ان پر اٹھا لیا گیا تھا، یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ دین میں تو جبر و اکراہ نہیں ہے، یہاں جبر سے کیوں کام لیا گیا؟ اس لئے کہ کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن جو مسلمان ہو، اس کو احکامِ اسلام کے ماننے پر یقیناً مجبور کیا جائے گا، بنی اسرائیل ایمان لا چکے تھے؛ لیکن تورات کے تمام احکام کو ماننے سے گریز کر رہے تھے؛ اسی لئے ان کو مجبور کیا گیا۔ کسی غیر مسلم کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے قطعاً جبر روا نہیں۔ البتہ فی الجملہ اسلام میں جبر ہے۔ جو قانون شکنی کا مرتکب ہوگا۔ اس پر جبر بھی ہوگا۔ بنی اسرائیل پر پہاڑ معلق کرنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ کہ جو عہد کیا تھا اس کی پابندی کرو۔ ورنہ یہ پہاڑ تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا۔ توراۃ میں تو یہ الفاظ آتے ہیں۔ کہ اگر تم نے عہد کی پابندی نہ کی تو تمہارا مدفن یہیں بنے گا۔ اگر قانون کی پابندی کے لیے جبر کو جبر فی الدین سمجھ لیا جائے تو سارا معاملہ ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ حدود اور

تعزیرات کا سلسلہ بند کرنا پڑے گا۔جب کسی ملزم کو سزا دی جائے گی تو وہ جبر جبر کی دہائی دینے لگے گا۔کہ اس پر زیادتی ہو رہی ہے۔اسے جبراً کوڑے لگائے جا رہے ہیں یا سے جبراً قید میں ڈالا جا رہا ہے۔حالانکہ یہ اس پر جبر نہیں ہوگا بلکہ قانون کی خلاف ورزی پر تعزیر ہوگی۔الغرض! اسلام میں داخل کرنے کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔البتہ قانون کی پابندی کرانے کے لیے جبراً سزا دی جا سکتی ہے۔اس آیت میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے بات ہمیں سمجھائی جا رہی ہے کہ جو کچھ قرآن پاک میں قانون نازل ہوا ہے۔اسے یاد کرو۔اس کو خود پڑھو اور دوسروں کو پڑھاؤ۔اس کی تشہیر کرو۔تاکہ قانون کی تفصیلات عوام الناس تک پہنچ سکیں۔جس طرح ایک عام دنیوی حکومت کے قانون کی تشہیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون قرآن پاک کو عام کرنا بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے۔

پختہ عہد و پیمان کے باوجود روگردانی

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ	پھر تم پھر گئے	مِّنۢ بَعْدِ ذٰلِكَ	اُس کے بعد	فَلَوْلَا	پس اگر نہ
فَضْلُ اللّٰهِ	اللہ کا فضل (ہوتا)	عَلَيْكُمْ	تم پر	وَرَحْمَتُهٗ	اور اس کی رحمت
لَكُنْتُمْ	البتہ تم ہو جاتے	مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ (64)	خسارہ پانے والوں میں سے		

اس سارے عہد و پیمان کے بعد انھوں نے بہت سی باتوں میں تورات سے کنارہ کشی اختیار کی، چنانچہ انھوں نے تورات میں تحریف کی، اس کی آیات کو چھپایا، انبیاء کے احکام کی نافرمانی کی، بعض کو جھٹلایا، بعض کو قتل کیا، میدان تیہ میں عجیب وغریب نعمتوں کے مشاہدے کے باوجود موسیٰؑ پر بار بار اعتراض کیے، ان کی حکم عدولی کی، انھیں سخت ایذا پہنچائی۔ارض مقدس میں داخلے کا حکم ہوا تو صاف انکار کر دیا حتیٰ کہ موسیٰؑ نے خود کو ان نافرمانوں سے الگ کر دینے کی دعا کی۔یہ تو پہلوں کا حال تھا، بعد والوں نے رسول اللہ ﷺ کو پہچاننے کے باوجود آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔فرمایا اے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد کرنے کے بعد "ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنۢ بَعْدِ ذٰلِكَ" تم اس کے بعد اس عہد سے پھر گئے اسے پورا نہ کیا اللہ تعالیٰ نے پھر بھی تم پر مہربانی کی اور

تمہیں موقع دیتا رہا کہ تم اپنے عہد کی پاسداری کرسکو۔حتیٰ کہ یہ آخری موقع بھی دیا۔فَضْلُ اللّٰہِ: اللہ کا فضل ۔ یہاں فضل ورحمت سے یا تو توبہ کی توفیق مراد ہے کہ انہیں توبہ کی توفیق مل گئی اور یا عذاب کو مؤخر کرنا مراد ہے یعنی بنی اسرائیل پر عذاب نازل نہ ہوا بلکہ انہیں مزید مہلت دی گئی ۔(مدارک، البقرۃ،تحت الآیۃ: ۶۴،ص ۵۶) اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآں پاک بھی نازل ہو چکی ہے ۔اللہ تعالیٰ کا آخری نبی (علیہ السلام) بھی آچکا ہے ۔لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ) یعنی ان تمام نافرمانیوں کے باوجود فوراً عذاب کے ساتھ ہلاک کرنے کے بجائے تمہیں توبہ واستغفار کی مہلت دی گئی ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ وہ تمہیں بار بار موقع دے رہا ہے ۔کہ اب بھی سمجھ جاؤ اور راہ راست پر آجاؤ ۔ورنہ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری کوتاہیوں اور غلطیوں کی طرف دیکھے تو فوراً ہلاک کر دے اور توبہ کا موقع بھی نہ مل سکے ۔اس آیت میں بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور نافرمانی کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے پختہ عہد و پیمان اور ان پر کی گئی عنایات کے باوجود وہ دوبارہ روگردانی کے مرتکب ہوئے ۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی رحمت اور فضل کو واضح کیا ہے کہ اگر اس کی توبہ کی توفیق اور معافی شامل حال نہ ہوتی، تو وہ ہمیشہ کے لیے تباہ اور خسارہ پانے والوں میں شامل ہو جاتے ۔

اصحاب سبت کا انجام/ جمعہ کی فضیلت/ تبدیلی اشکال کی توجیہہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْکُمْ فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ کُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ ﴿۶۵﴾
فَجَعَلْنٰهَا نَکَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۶۶﴾

ہفتے کے دن تعدی اور زیادتی کرنے والے

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	عَلِمْتُمُ	تم جان چکے ہو	الَّذِیْنَ	جنہوں نے
اعْتَدَوْا	زیادتی کی	مِنْکُمْ	تم میں سے	فِی السَّبْتِ	ہفتے کے دن میں
فَقُلْنَا	تو ہم نے کہا	لَهُمْ	اُن سے	کُوْنُوْا	تم سب ہو جاؤ
قِرَدَةً	بندر	خٰسِئِیْنَ(65)	ذلیل		

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْکُمْ فِی السَّبْتِ یعنی اے اسرائیلیو! تم ان لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے ہفتے کے دن تعدی اور زیادتی کی تھی ہفتے کے دن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے توراۃ میں حکم نازل فرمایا تھا۔ شہر اَیْلَه میں بنی اسرائیل آباد تھے انہیں حکم تھا کہ ہفتے کا دن عبادت کے لیے خاص کر دیں اور اس روز شکار نہ کریں اور دنیاوی مشاغل ترک کر دیں۔ ان کے ایک گروہ نے یہ چال چلی کہ وہ جمعہ کے دن شام کے وقت دریا کے کنارے کنارے بہت سے

گڑھے کھودتے اور ہفتہ کے دن ان گڑھوں تک نالیاں بناتے جن کے ذریعہ پانی کے ساتھ آ کر مچھلیاں گڑھوں میں قید ہو جاتیں اور اتوار کے دن انہیں نکالتے اور کہتے کہ ہم مچھلی کو پانی سے ہفتے کے دن تو نہیں نکالتے، یہ کہہ کر وہ اپنے دل کو تسلی دے لیتے۔ چالیس یا ستر سال تک ان کا یہی عمل رہا اور جب حضرت داوٗد عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی نبوت کا زمانہ آیا تو آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے انہیں اس سے منع کیا اور فرمایا کہ قید کرنا ہی شکار ہے جو تم ہفتے ہی کو کر رہے ہو۔ جب وہ باز نہ آئے تو آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے ان پر لعنت فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بندروں کی شکل میں مسخ کر دیا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ نوجوان بندروں کی شکل میں اور بوڑھے خنزیروں کی شکل میں مسخ ہو گئے، ان کی عقل اور حواس تو باقی رہے مگر قوت گویائی زائل ہو گئی اور بدنوں سے بدبو نکلنے لگی، وہ اپنے اس حال پر روتے رہے یہاں تک کہ تین دن میں سب ہلاک ہو گئے، ان کی نسل باقی نہ رہی اور یہ لوگ ستر ہزار کے قریب تھے۔ (روح البیان، البقرۃ،)

یہ واقعہ حضرت داوٗد علیہ السلام کے زمانہ کا ہے، اس زمانہ میں مقامِ 'ایلہ' میں یہودیوں کی ایک بڑی آبادی واقع تھی، یہود کو تورات میں جو احکام دیئے گئے تھے، ان میں ایک یہ تھا کہ 'ہفتہ' کے دن کو عبادت کے لئے مخصوص رکھیں اور اس دن کسب معاش سے اجتناب کریں، یہ حکم اتنی تاکید کے ساتھ تھا کہ اس کی مخالفت کی سزا موسوی شریعت میں قتل تھی (خروج: ۳۱ / ۱۴-۱۵)

ناجائز حیلہ سازی پر سخت سزا

ایلہ کے یہودیوں نے اس کی مخالفت کی اور حیلہ بہانہ سے اس دن بھی مچھلی کا شکار کرنے لگے اس پر یہ عذاب نازل ہوا کہ یہ بندر بنا دیئے گئے، تین دنوں تک اسی حال میں رہے اور اس کے بعد مر گئے، اللہ ہی اصل صورت بنانے والے ہیں، ''یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ'' (آلِ عمران: ۶) جو صورت بنا سکتا ہے، اس کے لئے صورتوں اور جسم کے قالبوں کا بدل دینا کیا مشکل ہے؟ معلوم ہوا کہ ناجائز حیلہ سازی بہت بری خصلت اور بہت بڑا جرم ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیروں اور بندروں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تم حیلہ سازی سے خدا تعالیٰ کے قانون کو نہ توڑنا، یہ بڑا سخت جرم ہے ایسا کرنے والوں کی اگرچہ اب شکلیں تو تبدیل نہیں ہوں گی۔ مگر ان کا باطن بالکل ایسا ہی ہوگا اب کیا کچھ نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے حیلہ سازی کی جاتی ہے۔ سود اور رشوت کی تاویلیں کی جاتی ہیں۔ اور اس کے جواز کا فتویٰ لیا جاتا ہے۔ سب کچھ جعل سازی اور حرام ہے۔ ناجائز حیلہ سازی بہرحال حرام ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی سے بچنے کے لیے زیور بیوی کے نام ہبہ کر دیا۔ جب اس کے پاس سال پورا ہونے لگا تو بیوی نے خاوند کے نام ہبہ کر دیا گویا نہ کسی کے ہاں زیور پر پورا سال گزرے اور نہ اس کی زکوٰۃ دینی پڑے۔ یہ حیلہ سازی ناجائز ہے اسی طرح کسی بھی فرض، روزہ، نماز، جہاد وغیرہ سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ سازی کرے گا تو مجرم ٹھہرے گا۔

یہود و نصاریٰ کے مقدس دن

یہودیوں کے لیے ہفتہ اور نصاریٰ کے لیے اتوار کا دن مقدس ہے۔ مگر اہل اسلام کے لیے جمعہ کا دن مبارک ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا (1۔ بخاری ج 1 ص 120، مسلم ج 1 ص 282) کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کو بہکا دیا کہ وہ جمعہ کا دن نہ پاسکیں۔ بلکہ یہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے آخری امت کے لیے مخصوص کر رکھی تھی کیونکہ جمعہ تمام ایام سے زیادہ فضیلت والا دن ہے۔ جمعہ کو یوم المزید بھی کہا گیا ہے، کیونکہ اس میں اہلِ ایمان کو مزید کرامتیں اور انعامات عطا ہوتے ہیں۔

جمعہ اہلِ اسلام کیلئے سب سے عظیم دن

تنبیہ الغافلین میں ہے کہ قیامت کے دن اہلِ ایمان اس دن کے ذریعے مزید قربِ الٰہی حاصل کریں گے۔ جمعہ کی نماز اور جمعہ سے جمعہ تک کے اعمال انسان کے گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں ہے، یہ دن اجتماع اور امت کی یکجہتی کا دن ہے۔ قرآن نے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ

جمعہ کے دن ایک قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے جس میں دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ اس کا ذکر مختلف احادیث میں آیا ہے اور کتابوں میں اس دن کی خصوصیات میں شمار کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ جمعہ اسلام

میں ہفتے کا سب سے عظیم دن ہے؛ تخلیق انسان، خصوصی عبادات، اجتماعی عبادات، دعاؤں کی قبولیت، گناہوں کی مغفرت اور بلند درجات ایک ہی دن میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا "الیھودُ غدًا " یعنی یہود نے جمعہ سے اگلا دن اختیار کیا۔ "وَالنَّصٰرٰی بعدَ غدٍ" اور نصاری نے اس کے بعد یعنی اتوار کا دن منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی حد تک اختیار دے دیا تھا کہ وہ اپنے لیے بہتر دن منتخب کر لیں۔ اور انہوں نے یہ ایام پسند کیے۔ اور جمعہ کو منتخب نہ کیا۔ جو کہ مسلمانوں کے مقدر میں تھا۔ یہودیوں نے ہفتے کا دن اس لیے اختیار کیا کہ کائنات کی تخلیق ہفتہ کے روز شروع ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے ہاں یہ سب سے متبرک دن سمجھا گیا۔

الغرض! حضرت داؤد (علیہ السلام) نے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا۔ انہیں نیکی کی تلقین کی اور برائیوں سے منع کیا۔ انہوں نے اچھی طرح تنبیہہ کی کہ اگر تم اپنی بری خصلتوں سے باز نہیں آؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ آپ کی اس تبلیغ سے تقریباً بارہ ہزار لوگ نہ صرف خود اس غلط کام سے باز آ گئے۔ بلکہ انہوں نے دوسروں کو بھی روکنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی۔ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے باز آنے کے لئے تیار نہ تھے۔ گویا ایک گروہ فاسقین کا تھا۔ تو ان کے مقابلے میں صالحین کا ایک گروہ بھی پیدا ہو گیا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ایسا تھا۔ جو خود تو برائی کا ارتکاب نہ کرتا تھا۔ مگر دوسروں کو روکتا بھی نہ تھا۔ قرآن پاک میں آتا ہے کہ یہ گروہ برائی سے منع کرنے والوں کو کہتا تھا کہ تم انہیں کیوں روکتے ہو۔ کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ مگر صالحین کا گروہ انہیں جواب دیتا "مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ" کہ بھائی! اللہ تعالیٰ کے سامنے غداری کے لیے انہیں روکتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے پوچھ لیا کہ تم نے انہیں برائی سے کیوں نہ روکا تو ہمارا کیا جواب ہوگا۔ قیامت کے روز ندامت اٹھانی پڑے گی۔

اہل علم کیلئے دعوت و تبلیغ ضروری ہے

اس لئے اہل علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان اور اس کی عطا کردہ شریعت

لوگوں تک پہنچائیں۔اور تبلیغ کا حق ادا کریں۔ہوسکتا ہے کہ ان کی تبلیغ سے کوئی شخص راہ راست پر آجائے۔پھر جب اس قوم پر عذاب نازل ہوا تو اس عذاب سے صرف منع کرنے والا گروہ بچا لیا گیا۔خاموش رہنے والے اور مجرم دونوں گروہوں پر عذاب نازل ہوا اور وہ عذاب یہ تھا کہ تم ذلیل و خوار بندر بن جاؤ۔

نیچری حضرات کی توجیہہ

اب معجزات کے منکر اور نیچری حضرات یہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کی عادات وخصائل تو بندروں جیسے ہوگئے تھے۔لیکن ان کی صورتیں مسخ نہیں ہوئی تھیں (یعنی وہ فی الواقع بندر نہیں بنے تھے) یہ توجیہ اس لحاظ سے غلط ہے کہ ایک تو قرآن کے ظاہری الفاظ سے یہ گنجائش نہیں نکلتی۔دوسرے مابعد کی آیت اس توجیہ کی توثیق کے بجائے تردید کررہی ہے۔کیونکہ اگر ان کی شکلیں بدستور انسانوں کی ہی رہیں،تو وہ اس وقت کے موجود لوگوں اور پچھلوں کے لیے سامان عبرت کیسے بن سکتے تھے اور پرہیزگاران سے کیا سبق لے سکتے تھے؟حقیقت یہ ہے کہ وہ فی الواقع بندر بن گئے تھے تاہم ان کے دماغ وہی رہے۔ان میں فہم وشعور انسانی موجود تھا۔وہ ایک دوسرے کو پہچانتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر روتے تھے مگر کلام نہیں کرسکتے تھے۔پھر تین دن کے بعد سب مرگئے۔یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان نافرمانوں کو جانوروں کی شکل میں اور خاص طور پر خنزیروں اور بندروں کی شکل میں کیوں تبدیل کیا۔وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایک قانون مقرر کیا تھا۔کہ ہفتے کے دن سوائے عبادت کے کوئی کاروبار نہیں کریں گے۔مگر انہوں نے حکم خداوندی کو توڑ کر مچھلی کا شکار شروع کردیا۔جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا کے طور پر خنزیر اور بندر بنا دیا۔

انسان اور جانور میں فرق

اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ انسان اور جانور میں یہی فرق ہے کہ انسان قانون کی پابندی کرتا ہے۔اور جانور اس سے مستثنیٰ ہے۔اب اگر انسان بھی قانون کی خلاف ورزی شروع کردے تو

ظاہر ہے کہ وہ انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کے درجے پر آ گیا۔ اور ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے انسان بندر سے زیادہ مشابہ ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں بندر کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ شکل وصورت کے علاوہ بندر حس اور شعور میں بھی انسان سے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ بڑا نقال جانور ہے۔ جس طرح انسان کو کرتے ہوئے دیکھ لے اسی طرح کرنے لگتا ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے ان نافرمانوں کو جانوروں کی اس قسم میں تبدیل کیا جو ان سے زیادہ مشابہ ہیں۔

اخلاق اور قانون میں فرق

مفسرین فرماتے ہیں کہ جب اکیلا آدمی کسی ضابطے کی پابندی کرتا ہے۔ تو اسے اخلاق کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جب کوئی دو افراد آپس میں کوئی معاملہ طے کرتے ہیں تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ قانون کی ادنیٰ ترین صورت میاں بیوی کے درمیان نکاح کا ضابطہ ہے۔ جس کی پابندی دونوں فریقوں پر لازم ہے۔ اگر کوئی فریق اس قانون کو توڑے گا۔ تو وہ انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔ اس کی مزید وضاحت یوں سمجھیں کہ عقد نکاح کے قانون کے مطابق کوئی عورت ایک ہی مرد کے ساتھ مختص ہوتی ہے۔ یہ ایک معاہدہ یا (Agreement) ہوتا ہے۔ جس کی پابندی ضروری ہے۔ اگر اسی ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عورت ایک مخصوص مرد کی بجائے کسی دوسرے مرد کی خلوت میں بھی چلی جائے تو ظاہر ہے کہ وہ جانور کی سطح پر آ جائے گی جس پر کسی ایسے قانون کی پابندی لازم نہیں اسی طرح مرد اگر اپنی منکوحہ عورت کی علاوہ کسی دوسرے عورت کی طرف نظر بد سے دیکھتا ہے تو وہ قانون کی خلاف ورزی کر کے انسانیت کے درجے سے گر جائے گا۔ اور اس کے علاوہ یہ دونوں جانور اخلاقی طور پر دوسرے جانوروں کی نسبت زیادہ گرے ہوئے ہیں خنزیر ایک ایسا جانور ہے کہ اس کی مادہ کے ساتھ کئی کئی نر بیک وقت جفتی کرتے ہیں۔ یہ اس قسم کا بے غیرت جانور ہے۔ اور بندر کی ایک بہت بری خصلت یہ ہے کہ یہ اپنے ہی ہم جنس بندر کے ساتھ بھی قضائے شہوت کر لیتا ہے خنزیر قانون کی ایک شق کی خلاف ورزی کرتا ہے تو بندر دوسری شق کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سور کا گوشت کھانے والے لوگ بے غیرت

ہوتے ہیں ۔انگریز اور سکھ جو خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں ۔ان میں بے غیرتی کا مادہ کثرت سے پایا جاتا ہے ۔الغرض جب یہود نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑ ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں ان جانوروں میں تبدیل کر دیں جو خود قانون شکن ہے ۔نماز کا ایک اہم قانون ہے کہ مقتدی امام سے آگے نہ نکلے ۔ رکوع ،سجود،قومہ،قعدہ،ہر مقام پر امام کی اقتداء میں رہے ۔اور اگر کوئی نمازی امام سے آگے نکلنے کی کوشش کرے گا تو اس کی مثال گدھے کے ساتھ دی گئی ہے ۔جو کہ بڑا بیوقوف جانور ہے ۔گویا جو شخص نماز کے قانون کو توڑتا ہے وہ گدھے کی مانند ہے ۔

عذاب کے واقعات ہماری عبرت و نصیحت کیلئے

فَجَعَلۡنٰهَا	تو ہم نے بنا دیا اس کو	نَكَالًا	عبرت	لِّمَا	(اُن) کیلئے جو
بَيۡنَ يَدَيۡهَا	اس کے سامنے	وَمَا	اور جو	خَلۡفَهَا	اس کے پیچھے تھے
وَمَوۡعِظَةً	اور نصیحت	لِّلۡمُتَّقِيۡنَ(66)	پرہیز گاروں کیلئے ۔		

نَكَالًا: عبرت ۔اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک میں عذاب کے واقعات ہماری عبرت و نصیحت کیلئے بیان کئے گئے ہیں ،یعنی اس واقعہ اور اس عقوبت کو ہم نے باعث خوف و عبرت بنا دیا اگلے اور پچھلے لوگوں کے واسطے یعنی جنہوں نے اس عذاب کا مشاہدہ کیا اور جو آئندہ پیدا ہوں گے" یا جو بستیاں شہر کے آگے اور اس کے پیچھے آباد تھیں ۔لہٰذا قرآن پاک کے حقوق میں سے ہے کہ اس طرح کے واقعات و آیات پڑھ کر اپنی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی جائے ۔اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ اس وقت کے لوگوں کے لیے اور بعد میں آنے والوں کے لیے باعث عبرت بنا دیا ۔ڈرنے والوں کے لیے نصیحت میں یہ بھی شامل ہے کہ امت محمد ﷺ بنی اسرائیل کی ان نافرمانیوں اور ان پر ملنے والی سزاؤں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے ۔

گائے کو ذبح کرنے کے حکم پر بنی اسرائیل کی کٹ حجتیاں / گائے کی نشانیاں

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی
لِقَوْمِہٖٓ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً ط قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا ھُزُوًا ط قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ
اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا ھِیَ ط قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ
لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِکْرٌ ط عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِکَ ط فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ
یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُھَا ط قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ لا فَاقِعٌ لَّوْنُھَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ﴿۶۹﴾
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا ھِیَ لا اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَہَ عَلَیْنَا ط وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ
لَمُھْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ ج
مُسَلَّمَۃٌ لَّا شِیَۃَ فِیْھَا ط قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ط فَذَبَحُوْھَا وَمَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

گؤ سالہ پرستی کے جراثیم اور گائے بیل سے محبت

وَاِذْ قَالَ	اور جب کہا	مُوْسٰی	موسیٰ نے	لِقَوْمِہٖ	اپنی قوم سے	اِنَّ اللّٰہَ	بیشک اللہ	
یَاْمُرُکُمْ	حکم دیتا ہے تمہیں	اَنْ تَذْبَحُوْا	یہ کہ تم ذبح کرو	بَقَرَۃً	گائے			
قَالُوْٓا	اُنہوں نے کہا	اَتَتَّخِذُنَا	کیا تو کرتا ہے ہم سے	ھُزُوًا	مذاق			

قَالَ	اُس نے کہا	اَعُوْذُ	میں پناہ مانگتا ہوں	بِاللّٰہِ	اللہ کی
اَنْ اَكُوْنَ	کہ میں ہو جاؤں	مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (67)	جاہلوں میں سے		

بنی اسرائیل میں ایک مالدار شخص مارا گیا جس کا وارث صرف ایک بھتیجا تھا، ایک رات اس بھتیجے نے اپنے چچا کو قتل کر کے لاش کسی اور آدمی کے دروازے پر ڈال دی، صبح قاتل کی تلاش میں ایک دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانے لگے، بالآخر بات حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تک پہنچی تو انہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا، گائے کا ایک ٹکڑا مقتول کو مارا گیا جس سے وہ زندہ ہو گیا اور قاتل کی نشاندہی کر کے مر گیا (فتح القدیر) گائے کو ذبح کرنے کا حکم دراصل بنی اسرائیل کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کے مترادف تھا۔گؤ سالہ پرستی کے جراثیم اور گائے بیل سے محبت اور اسے دیوتا سمجھنے کا عقیدہ تاہنوز ان میں موجود تھا۔لہٰذا ایک تکلیف تو انہیں یہ ہوئی کہ جس چیز کو قابل پرستش سمجھتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔دوسرے انہیں یہ یقین نہیں تھا کہ اس طرح گائے کے گوشت کا ٹکڑا مارنے سے مردہ لاش جی اٹھے گی اور بول کر قاتل کا پتہ بتا دے گی۔لہٰذا موسیٰ (علیہ السلام) سے یوں کہہ دیا کہ ہم سے دل لگی کرتا ہے۔موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ میں تو تمہیں اللہ کا حکم بتا رہا ہوں، دل لگی نہیں کر رہا۔ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ "کا اصل معنی ہے: 'میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں' مقصود یہی ہے کہ نبی ہونے کے باوجود (جس کا ایک ایک قول اللہ کی طرف سے ہوتا ہے) جاہلوں کی سی بات کیسے کر سکتا ہوں؟۔کیونکہ ایسی دل لگی کرنا جاہلوں کا کام ہے۔

تعمّق کا معنی ومفہوم

قَالُوا	اُنہوں نے کہا	ادْعُ	آپ دعا کریں	لَنَا	ہمارے لئے	رَبَّكَ	اپنے رب سے		
يُبَيِّنْ	وہ بیان کرے	لَّنَا	ہمارے لئے	مَا هِيَ	وہ کیسی ہو				
قَالَ	اُس نے کہا	اِنَّهٗ	بیشک وہ	يَقُوْلُ	فرماتا ہے	اِنَّهَا	بیشک وہ		
بَقَرَةٌ	گائے	لَّا فَارِضٌ	نہ بوڑھی ہو	وَّلَا بِكْرٌ	اور نہ چھوٹی عمر کی ہو				
عَوَانٌۢ	جوان ہو	بَيْنَ ذٰلِكَ	اُس کے درمیان	فَافْعَلُوْا	پس تم سب کرو				

مَا تُؤْمَرُوْنَ(68)	جوتم کوحکم دیا جاتا ہے۔

مفسرین فرماتے ہیں (1۔معالم التنزیل ج 1 ص 32) کہ جس وقت قتل کا یہ واقعہ پیش آیا اس وقت تک توراۃ نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔چونکہ ان کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود نہیں تھا۔اس لیے وہ موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس آئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی بھی تھے اور ظاہری طور پر حکومت بھی موسیٰ (علیہ السلام) کی تھی۔صحیح حدیث میں آتا ہے (2۔تفسیر مظہری ج 1 ص 80،درمنثور ج 1 ص 77،ابن کثیر ج 1 ص 21) کہ اگر بنی اسرائیل اس وقت لیت ولعل نہ کرتے بلکہ کوئی بھی گائے ذبح کردیتے تو بات بن جاتی۔مگر ان کی طبعیتوں میں تعمق تھا۔تَعَمُّق کا معنی ہے کسی معاملے کی تہہ تک پہنچنا،گہرائی میں جا کر چھان بین کرنا،غور وخوض،یا باریک بینی سے سوچنا۔یہ عربی زبان کا لفظ ہے جو کسی مسئلے،بات یا علم کی گہرائی،باریک بینی اور دور اندیشی کو ظاہر کرتا ہے،یعنی کسی چیز کا سرا اور اصل دریافت کرنا۔اور اسرائیلی بال کی کھال اتارنا جانتے تھے۔انہوں نے پیغمبر کا حکم ماننے کی بجائے طرح طرح کے سوالات کرنے شروع کردیے نتیجہ یہ ہوا۔کہ جوں جوں سوال کرتے گئے توں توں سختی بڑھتی گئی حتیٰ کہ بچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہا اور وہ مجبور ہو گئے۔مگر اس حیلہ سازی میں کافی عرصہ گزر گیا۔اور انہوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حکم پر عمل نہ کیا۔اسی لیے حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ تعمق اچھا نہیں ہر بات میں بال کی کھال نہ اتارو بلکہ حکم پر عمل کرو۔جس قدر زیادہ باریکی میں جاؤ گے۔اسی قدر سختی میں مبتلا ہو گے۔اور آخر مجبور ہو جاؤ گے۔اگر بنی اسرائیل ایک فرمانبردار قوم ہوتے اور کوئی سی گائے بھی ذبح کردیتے تو حکم کی تعمیل ہو جاتی،مگر کٹ حجتی اور ٹال مٹول حتیٰ کہ نافرمانی ان کی رگ رگ میں بھری ہوئی تھی۔کہنے لگے اچھا ہمیں اپنے پروردگار سے پوچھ کر بتاؤ وہ گائے کیسی ہونی چاہیے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا۔وہ گائے جوان ہونی چاہیے،بوڑھی یا کم عمر نہ ہو۔

شوخ زرد رنگ کی گائے

قَالُوا	اُنہوں نے کہا	ادْعُ	دعا کرو	لَنَا	ہمارے لئے

رَبَّكَ	اپنے رب سے	يُبَيِّنْ	وہ بیان کرے	لَّنَا	ہمارے لئے
مَا لَوْنُهَا	کیا (کیسا) ہو اُس کا رنگ	قَالَ	اُس نے کہا	اِنَّهٗ	بیشک وہ
يَقُوْلُ	وہ فرماتا ہے	اِنَّهَا	بیشک وہ	بَقَرَةٌ	گائے ہو
صَفْرَآءُ	زرد رنگ کی	فَاقِعٌ	گہرا ہو	لَّوْنُهَا	اُس کا رنگ
تَسُرُّ	خوش کردے	النّٰظِرِيْنَ(69)	سب دیکھنے والوں کو۔		

پھر دوسری مرتبہ یہ سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر ہمیں بتاؤ کہ اس کا رنگ کیسا ہونا چاہیے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا کہ وہ گہرے زرد رنگ کی ہونی چاہیے، جو دیکھنے والے کے دل کو خوش کردے۔ اب بھی حکم بجالانے پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔ بَقَرَةٌ اس کی تنوین سے ظاہر ہے کہ وہ کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو کافی تھا، مگر وہ تو گائے ذبح کرنے پر آمادہ ہی نہ تھے، ادھر موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے سرتابی بھی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انھوں نے پے در پے سوال کیے، جن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ کسی طرح جان چھوٹ جائے، مگر وہ جتنے سوال کرتے گئے پھنستے گئے، آخر اس شوخ زرد رنگ کی گائے پر بات آپہنچی جو عبادت کے لیے مثالی سمجھی جاتی تھی۔

مسلمانوں کو ذبح گاؤ پر پابندی قبول نہیں کرنی چاہیے

قَالُوا	اُنہوں نے کہا	ادْعُ	دعا کرو	لَنَا	ہمارے لئے	رَبَّكَ	اپنے رب سے
يُبَيِّنْ	وہ بیان کرے	لَّنَا	ہمارے لئے	مَا هِيَ	کیا (کیسی) ہو وہ		
اِنَّ الْبَقَرَ	بیشک گائے	تَشٰبَهَ	مشتبہ ہوگئی ہے	عَلَيْنَا	ہم پر		
وَاِنَّآ	اور بیشک ہم	اِنْ شَآءَ اللّٰهُ	اگر چاہا اللہ نے				
لَمُهْتَدُوْنَ(70)	ضرور ہدایت پالیں گے۔						

بنی اسرائیل کے دل و دماغ میں تعمق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے تیسرا سوال کر دیا۔ "قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ" اے موسیٰ (علیہ السلام) اپنے رب سے دعا کریں "يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ" وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ گائے کیسی ہو۔ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا" بیشک گائے

ہم پر مشتبہ ہوگئی ہے۔یعنی ہم ابھی تک اس کی ٹھیک ٹھیک نانشانیاں نہیں جان سکے اگر ہمیں اس کی پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا جائے"وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ "تو بیشک اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہم راہ پالیں گے۔اس دفعہ انہوں نے اپنے مطالبہ کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ منسلک کیا گویا یہ آخری بات تھی جو انہوں نے دریافت کی عام قانون بھی ہے"وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا (23) اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ یعنی جب کبھی کوئی مستقبل میں کام کرنا ہو۔تو یوں نہ کہو کہ کل یا پرسوں ضرور کر دوں گا۔بلکہ اس فعل کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ معلق کرو۔کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ایسا کر دوں گا۔مومن کی یہی شان ہے،کہ وہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی توفیق کا طلب گار ہوتا ہے۔اور تیسری بار ان کی زبان سے'انشاء اللہ'نکل گیا؛ورنہ شاید اب بھی ان کی سَیری نہ ہوتی، خدا خدا کر کے ان کو بات سمجھ میں آئی،تلاش کی گئی تو یہ خوبصورت سنہری گائے ایک یتیم کی ملکیت تھی، اُس بہانہ اِس غریب کو بھی منہ مانگی قیمت مل گئی،غالباً گائے اور سنہری گائے کا انتخاب اس لئے فرمایا گیا کہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل سونے کی خود ساختہ گائے ہی کی پرستش میں مبتلا ہو گئے تھے،تو ایسی ہی گائے ان کے ہاتھوں ذبح کرائی گئی؛تاکہ گائے کی تقدیس ہمیشہ کے لئے ان کے دل سے نکل جائے،اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جن ملکوں میں پڑوسی قوم گائے کی پوجا کرتی ہو،وہاں خاص کر مسلمانوں کو ذبح گاؤ پر پابندی قبول نہیں کرنی چاہئے؛اس لئے کہ وہاں ذبح گاؤ توحید کے شعار کی حیثیت رکھتا ہے،اسی حکم میں ہمارا پڑوسی ملک ہندوستان بھی ہے۔

اس واقعہ سے حاصل ہونے والا سبق

قَالَ	اُس نے کہا	اِنَّهٗ	بیشک وہ	يَقُوْلُ	وہ فرماتا ہے	اِنَّهَا	بیشک وہ		
بَقَرَةٌ	گائے	لَّا ذَلُوْلٌ	نہ کام میں لگائی گئی ہو(کہ)	تُثِيْرُ	ہل جوتتی ہو				
الْاَرْضَ	زمین میں	وَلَا تَسْقِي	اور نہ پانی دیتی ہو	الْحَرْثَ	کھیتی کو				
مُسَلَّمَةٌ	صحیح سلامت ہو	لَّا شِيَةَ	نہ کوئی داغ ہو	فِيْهَا	اُس میں				
قَالُوا الْـٰٔنَ	انہوں نے کہا اب	جِئْتَ	تو آیا ہے	بِالْحَقِّ	حق کے ساتھ				

فَذَبَحُوْهَا	پھراُنھوں نے ذبح کیا اسے	وَمَا	اور نہ	كَادُوْا	وہ لگتے تھے
يَفْعَلُوْنَ(71)			وہ سب کریں گے۔		

پھر یہ سوال کردیا کہ ایسی صفات کی گائیں تو ہمارے ہاں بہت سی ہیں ہمیں پوچھ کر بتایا جائے کہ اس کی مزید صفات کیا ہوں؟ تاکہ ہمیں کسی متعین گائے کا علم ہوجائے جس کی قربانی اللہ تعالیٰ کو منظور ہے۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ وہ گائے ایسی ہونی چاہیے جس سے ابھی تک کھیتی باڑی کا کام لینا شروع ہی نہ کیا گیا ہو یعنی نہ وہ ہل کے آگے جوتی گئی ہو اور نہ کنویں کے آگے۔ تندرست ہو اور صحیح وسالم ہو۔ یہ نہ ہو کہ کسی بیماری یا کمزوری کی وجہ سے کام نہ لیا جارہا ہو اور اس میں کوئی داغ بھی نہ ہو۔مطلب یہ ہے کہ شروع میں جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا تو کسی خاص قسم کی گائے نہیں بتائی گئی تھی چنانچہ وہ کوئی بھی گائے ذبح کردیتے تو حکم پورا ہوجاتا لیکن انہوں نے خواہ مخواہ کھود کرید شروع کردی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے بھی نت نئی شرطیں عائد فرمالیں اور ایسی گائے تلاش کرنا مشکل ہوگیا جو ان شرطوں کو پورا کرتی ہو۔ یہاں تک کہ ایک مرحلے میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید وہ ایسی گائے تلاش کرکے ذبح کرنے کے قابل نہ ہوں۔اس واقعے میں سبق یہ دیا گیا ہے کہ بلاوجہ غیر ضروری کھوج میں پڑنا ٹھیک نہیں جو بات جتنی سادہ ہو اس پر اتنی ہی سادگی سے عمل کرلینا چاہیے۔

اس واقعہ سے ملنے والی معلومات

(1)......نبی کے فرمان پر بغیر ہچکچاہٹ عمل کرنا چاہیے اور عمل کرنے کی بجائے عقلی ڈھکوسلے بنانا بے ادبوں کا کام ہے۔

(2)......پیغمبر جھوٹ، دل لگی اور کسی کا مذاق اڑانا وغیرہ عیبوں سے پاک ہیں البتہ خوش طبعی ایک محمود صفت ہے یہ ان میں پائی جاسکتی ہے۔

(3)......شرعی احکامات سے متعلق بے جا بحث مشقت کا سبب ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ اگر بنی اسرائیل بحث نہ نکالتے تو جو گائے ذبح کردیتے وہی کافی ہوجاتی۔(درمنثور، البقرۃ، تحت

الآیۃ:۷۰،۱/۱۸۹)

(4)......اِنْ شَآءَ اللّٰہ کہنے کی بہت برکت ہے۔حضور پرنور صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا: اگر بنی اسرائیل وَ اِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ لَمُهْتَدُوْنَ نہ کہتے تو کبھی وہ گائے نہ پاتے۔ (کشف الخفاء،حرف الشین المعجمۃ،۲/۷،رقم:۱۵۲۸)

(5)......جو اپنے عیال کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اللہ تعالیٰ اس کی عمدہ پرورش فرماتا ہے۔

(6)......جو اپنا مال اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر اس کی امانت میں دے اللہ تعالیٰ اس میں برکت دیتا ہے۔

(7)......والدین کی فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

لاش کا زندہ ہو کر قاتل کا پتہ بتانا / دل سخت ہوتا کیوں ہے اور اس کا علاج

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا
فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ
يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٧٣﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا
يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا
تَعْمَلُوْنَ ﴿٧٤﴾

اللہ کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے

وَاِذْ	اور جب	قَتَلْتُمْ	تم نے قتل کیا	نَفْسًا	ایک شخص
فَادّٰرَءْتُمْ	پھر تم جھگڑنے لگے	فِيْهَا	اُس (کے بارے) میں		
وَاللّٰهُ	حالانکہ اللہ	مُخْرِجٌ	ظاہر کرنے والا ہے	مَّا كُنْتُمْ	جو تم تھے
تَكْتُمُوْنَ (72)	تم سب چھپاتے۔				

یہ قتل کا وہی واقعہ ہے جس کی بنا پر بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور اس طرح

اللہ تعالیٰ نے اس قتل کا راز فاش کر دیا، دراں حالیکہ وہ قتل رات کی تاریکی میں لوگوں سے چھپ کر کیا گیا تھا۔ مطلب یہ ہوا کہ نیکی یا بدی تم کتنی بھی چھپ کر کرو، اللہ کے علم میں ہے اور اللہ تعالیٰ اسے لوگوں پر ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس لئے خلوت ہو یا جلوت ہر وقت اور ہر جگہ اچھے کام ہی کیا کرو تا کہ اگر وہ کسی وقت ظاہر ہو جائیں اور لوگوں کے علم میں بھی آ جائیں تو شرمندگی نہ ہو، بلکہ اس کے احترام و وقار میں اضافہ ہی ہو اور بدی کتنی بھی چھپ کر کیوں نہ کی جائے، اس کے فاش ہونے کا امکان ہے جس سے انسان کی بدنامی اور ذلت و رسوائی ہوتی ہے۔ اس آیت سے حاصل ہونے والے سبق: جرم چھپانے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا؛ اللہ حقیقت ظاہر کر دیتا ہے۔ الزام تراشی کے بجائے تحقیق اور انصاف ضروری ہے۔ اللہ کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے، وہ مردے بھی زندہ کرسکتا ہے۔ قتل جیسے بڑے گناہ کے دنیاوی اور اخروی نتائج شدید ہیں۔

قاتل کی تین جرائم

فَقُلْنَا	پھر ہم نے کہا	اضْرِبُوْهُ	تم مارو اس کو	بِبَعْضِهَا	اس کے ٹکڑے کو
كَذٰلِكَ	اسی طرح	يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى	اللہ زندہ کرے گا مُردے کو		
وَيُرِيْكُمْ	اور وہ دکھاتا ہے تمہیں	اٰيٰتِهٖ	اپنی نشانیاں	لَعَلَّكُمْ	تاکہ تم
تَعْقِلُوْنَ(73)	تم سمجھ جاؤ۔				

قاتلوں کا جرم صرف یہی نہیں تھا کہ انہوں نے مال و دولت کے لالچ میں آ کر اپنے چچا کو قتل کر ڈالا تھا۔ بلکہ ان کا دوسرا جرم یہ تھا کہ لاش کو کسی دوسرے شخص کے دروازے پر پھینک دیا تھا تا کہ ان پر شبہ نہ ہو سکے اور تیسرے یہ کہ خود شبہ سے بچنے کی خاطر اس قتل کا الزام دوسروں پر تھوپ رہے تھے۔ گائے ذبح ہونے کے بعد اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا لے کر اس مقتول کی میت پر مارا گیا تو اس کے زخم سے خون بہنے لگا۔ جسم میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور اس لاش نے بول کر قاتل یا قاتلوں کا نام اور پتا بتا دیا۔ اس کے بعد پھر سے اس پر موت طاری ہو گئی۔ اس طرح جن جرائم کو یہ قوم چھپائے رکھنا چاہتی تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں ظاہر کر دیا۔ چنانچہ قصاص میں یہ دونوں بھتیجے مارے گئے

اور انہیں اپنے چچا کے ورثہ میں سے بھی کچھ نہ ملا۔ مقتول کے دوبارہ جی اٹھنے سے استدلال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ روزِ قیامت تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت کا اعلان فرمارہا ہے۔

انسان کا دوبارہ زندہ قرآن کی مثالیں

قیامت کے دن دوبارہ مردوں کا زندہ ہونا، منکرین قیامت کے لئے ہمیشہ حیرت واستعجاب کا باعث رہا ہے اور قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے تعجب کو ذکر کیا ہے. یہ منکرین اس بات پر یقین کرنے سے قاصر تھے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ زندگی کیسے دی جاسکتی ہے، منکرین سمجھتے تھے کہ مٹی میں مل جانے کے بعد انسان کا دوبارہ زندہ ہونا عقلاً ممکن نہیں، انہوں نے کبھی مردوں کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا تھا، اس لیے وہ اسے افسانہ سمجھتے تھے، جسے قرآن نے قدرت الٰہی کے کھلے ثبوتوں کے ذریعے رد کیا ہے، قرآن فرماتا ہے کہ جس نے پہلی بار انسان کو عدم سے وجود بخشا، اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا زیادہ آسان ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ جوڑنا اس کے لیے کوئی مشکل نہیں، یہ حیرت واستعجاب محض علم کی کمی اور منکرین کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے تھا، جبکہ حق تعالیٰ کے لیے دوبارہ زندہ کرنا بالکل آسان ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کو بھی قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف اسلوب اور پیرائے میں بیان فرمایا ہے سورہ بقرۃ میں ہی اللہ تعالیٰ نے اس کی پانچ مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ایک مثال: ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ (البقرۃ:56) میں گزرچکی ہے۔دوسری مثال یہی قصہ ہے۔تیسری مثال دوسرے پارے کی آیت نمبر 243 مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ چوتھی آیت نمبر 259 فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ اور پانچویں مثال اس کے بعد والی آیت میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے طیور اربعہ (چار چڑیوں) کی ہے۔ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ فرمایا تو اچھا چار پرندے لے کر اپنے ساتھ ہلالے پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دے پھر انہیں بلا وہ تیرے پاس چلے آئیں گے پاؤں سے دوڑتے اور جان رکھ کہ اللہ

غالب حکمت والا ہے۔(البقرۃ260)

قاتل وراثت سے محروم، اور اس پر اہل علم کا اجماع

ہماری شریعت میں بھی قاتل وراثت سے محروم ہے۔حضور ﷺ کا ارشاد ہے(1۔احکام القرآن للجصاص ج 1 ص 26)"لَا يَرِثُ الْقَاتِلُ شَيْئًا" قاتل (مقتول کی) کسی شے کا وارث نہ ہوگا۔" اس میں حکمت یہ ہے کہ شریعت نے اس حکم کے ذریعے سے ایک خطرناک دروازہ بند کیا ہے اور وہ یہ کہ کبھی دنیوی مال کی محبت وارث کو آمادہ کرتی ہے کہ اپنے مورث کا مال جلدی حاصل کرنے کی خاطر اسے قتل کر دے ایسی صورت میں شریعت نے اسے محروم قرار دیا۔علاوہ ازیں قاعدہ مشہور ہے کہ جو شخص کسی چیز کو اس کے (مشروع) وقت سے پہلے (ناجائز طور پر) حاصل کرنے کی کوشش کرے، اس کی سزا یہ ہے کہ اسے اسی سے محروم کر دیا جائے۔قاتل کو میراث سے محروم رکھنے پر اہل علم کا اجماع ہے، البتہ ان میں اختلاف یہ ہے کہ قتل کی وہ کون سی نوعیت اور صورت ہے جو مانع ہے اور کون سی مانع نہیں ہے۔

وہ دل، جو پتھروں سے بھی زیادہ سخت

ثُمَّ قَسَتْ	پھر سخت ہو گئے	قُلُوْبُكُمْ	تمہارے دل		
مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ	اس کے بعد	فَهِيَ	پس وہ	كَالْحِجَارَةِ	پتھر کی طرح
اَوْ	یا (اس سے بھی)	اَشَدُّ قَسْوَةً	بہت زیادہ سخت	وَاِنَّ	اور بیشک
مِنَ الْحِجَارَةِ	پتھروں میں سے (بعض)	لَمَا	البتہ جو		
يَتَفَجَّرُ	وہ پھوٹ پڑتی ہیں	مِنْهُ الْاَنْهٰرُ	اس سے نہریں		
وَاِنَّ	اور بیشک	مِنْهَا	اُن میں سے (بعض)	لَمَا	البتہ جو
يَشَّقَّقُ	وہ پھٹ جاتے ہیں	فَيَخْرُجُ	پس وہ نکل آتا ہے		
مِنْهُ الْمَآءُ	اُس سے پانی	وَاِنَّ	اور بیشک	مِنْهَا	ان میں سے (بعض)

لَمَا	البتہ جو	يَهْبِطُ	وہ گر پڑتے ہیں
مِنْ خَشْيَةِ اللهِ	اللہ کے ڈر سے	وَمَا اللهُ	اور نہیں اللہ

بِغَافِلٍ	ہرگز غافل	عَمَّا	(اس) سے جو	تَعْمَلُوْنَ(74)	تم کرتے ہو۔

یعنی یہ معجزہ اور کئی سابقہ معجزات دیکھنے کے بعد تمہارے دل میں اللہ کا خوف پیدا نہ ہوا۔ بلکہ تمہارے دل سخت سے سخت تر ہوتے چلے گئے بلکہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت۔ کیونکہ کچھ پتھر (پہاڑ) ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹتی ہیں اور وہ عام لوگوں کے لیے نفع کا سبب بنتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن سے کوئی چشمہ ہی جاری ہوجاتا ہے یہ پہلے کی نسبت گو کم نفع بخش ہیں تاہم نفع بخش ضرور ہیں، اور گرنے والے پتھروں میں اللہ کا خوف اور تاثر موجود ہوتا ہے مگر تم جیسے نافرمان لوگوں سے دوسروں کو کچھ فائدہ پہنچنے کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔ جن کے دلوں میں اللہ کا ڈر قطعاً مفقود ہے۔ اور یہ تازہ واقعہ کہ مقتول دوبارہ زندہ ہوگیا، دیکھ کر بھی تمہارے دلوں کے اندر "إِنَابَةٌ إِلَى اللهِ" کا داعیہ اور توبہ واستغفار کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس تمہارے دل پتھر کی طرح سخت، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہوگئے۔

دلوں کی سختی افراد اور امتوں کے لئے سخت تباہ کُن

دلوں کا سخت ہوجانا یہ افراد اور امتوں کے لئے سخت تباہ کن، اور اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ دلوں سے اثر پذیری کی صلاحیت سلب اور قبول حق کی استعداد ختم ہوگئی ہے، اس کے بعد اس کی اصلاح کی توقع کم اور مکمل فنا اور تباہی کا اندیشہ زیادہ ہوجاتا ہے۔ اسی لئے اہل ایمان کو خاص طور پر تاکید کی گئی ہے: وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ (الحدید: 16) "اہل ایمان ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں جن کو ان سے قبل کتاب دی گئی لیکن مدت گزرنے پر ان کے دل سخت ہوگئے۔" اس آیت میں بنی اسرائیل کے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت موسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کے زمانے میں موجود تھے، ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ بڑی بڑی نشانیاں اور حضرت موسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام کے معجزات

دیکھ کر بھی انہوں نے عبرت حاصل نہ کی، ان کے دل پتھروں کی طرح ہو گئے بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت کیونکہ پتھر بھی اثر قبول کرتے ہیں کہ ان میں کسی سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں، کوئی پتھر پھٹ جاتا ہے تو اس سے پانی بہتا ہے اور کوئی خوف اِلٰہی سے گر جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے لیکن انسان جسے بے پناہ اِدراک وشعور دیا گیا ہے، حواس قوی ہیں، عقل کامل ہے، دلائل ظاہر ہیں، عبرت و نصیحت کے مواقع موجود ہیں لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کی طرف نہیں آتا۔ دل کی سختی کا مطلب ہوتا ہے کہ نصیحت دل پر اثر نہ کرے، گناہوں سے رغبت ہو جائے، گناہ کرنے پر کوئی شرمندگی نہ ہو اور توبہ کی طرف توجّہ نہ ہو۔

قساوتِ قلبی کے اسباب، اور علاج نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

قساوتِ قلبی کا پہلا سبب پیٹ بھر کر کھانا ہے چُنانچہ حضرتِ سیِّدُنا یحییٰ بن مُعاذ رازِی رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ فرماتے ہیں: ”جو پیٹ بھر کر کھانے کا عادی ہو جاتا ہے اس کے بدن پر گوشت بڑھ جاتا ہے اور جس کے بدن پر گوشت بڑھ جاتا ہے وہ شہوت پرست ہو جاتا ہے اور جو شہوت پرست ہو جاتا ہے اس کے گناہ بڑھ جاتے ہیں اور جس کے گناہ بڑھ جاتے ہیں اس کا دِل سخت ہو جاتا ہے اور جس کا دِل سخت ہو جاتا ہے وہ دُنیا کی آفتوں اور رنگینیوں میں غرق ہو جاتا ہے۔

حضور نبیِّ کریم، رءوف رحیم صَلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسَلَّم کی بارگاہ میں ایک شخص نے سخت دلی کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا: اِنْ اَرَدْتَ اَنْ یَلِیْنَ قَلْبُكَ، فَاَطْعِمِ الْمِسْکِیْنَ وَامْسَحْ رَاْسَ الْیَتِیْمِ یعنی اگر تم دل کی نرمی چاہتے ہو تو مسکین کو کھانا کھلاؤ اور یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرو۔ اِس حدیثِ پاک میں رسولُ اللہ صَلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسَلَّم نے دل کی سختی کے دو علاج عطا فرمائے ہیں، علاج کی خوب صورتی پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یتیموں اور مسکینوں سے حسنِ سلوک اللہ پاک کی رحمت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور رحمتِ الٰہی دل کی نرمی کا سبب ہے۔ دل کی سختی کوئی چھوٹی بیماری نہیں بلکہ اس کی وجہ سے انسان سے بڑے بڑے گناہ ہو جاتے ہیں، چوری، ڈکیتی اور قتل وغیرہ جیسے چھوٹے بڑے ظلم اور حق تلفی کے واقعات دل کی

سختی کی وجہ سے ہوتے ہیں، دل سخت ہونے کی وجہ سے انسان بڑے سے بڑا گناہ بھی کر جاتا ہے حتی کہ کفر تک جا پہنچتا ہے، یہ بیماری اللہ پاک کی رحمت سے دور اور عبادت کی لذت ختم کر دیتی ہے، سخت دل شخص گناہ کرنے میں دلیر ہو جاتا ہے، یہی وہ بیماری ہے کہ جس کی وجہ سے نصیحت بھی بھی بالکل بے اثر ہو جاتی ہیں۔ دل کی سختی کتنی بڑی سزا ہے؟ اس کا اندازہ حضرت مالک بن دینار رحمۃُ اللہِ علیہ کے اس فرمان سے بھی ہوتا ہے: اللہ کی طرف سے دلوں اور جسموں میں کچھ سزائیں ہیں مثلاً: روزی میں تنگی اور عبادت میں سستی اور بندے کے لئے دل کی سختی سے بڑی کوئی سزا نہیں ہے۔ رسولِ اکرم صَلَّی اللہ علیہ واٰلہٖ وسَلَّم نے دل کی سختی کے جو علاج عطا فرمائے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: (1) تلاوتِ قرآن اور موت کی یاد بھی دل کی سختی دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے چنانچہ فرمانِ مصطفیٰ ہے: دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جس طرح لوہے کو پانی پہنچنے سے زنگ لگ جاتا ہے۔ عرض کی گئی: یارسولَ اللہ! اس کی صفائی کس چیز سے ہوگی؟ فرمایا: موت کی بکثرت یاد اور تلاوتِ قرآن سے۔ اللہ کریم ہمارے دلوں کو نرمی کی نعمت سے نوازے۔ آمین

نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلقہ آیات کو چھپانا اور ان میں تحریف/حق کو چھپانا بہت بڑا جرم ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَقَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَہٗ
مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْہُ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝۷۵ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا
بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَھُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ لِیُحَآجُّوْکُمْ بِہٖ عِنْدَ
رَبِّکُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۷۶ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۝۷۷
وَمِنْھُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْکِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ وَاِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ۝۷۸

تورات وانجیل میں لفظی اور معنوی تحریف

اَفَتَطْمَعُوْنَ	کیا پس تم توقع رکھتے ہو	اَنْ یُّؤْمِنُوْا	کہ وہ ایمان لے آئیں گے		
لَکُمْ	تم پر	وَقَدْ	حالانکہ یقیناً	کَانَ فَرِیْقٌ	تھا ایک گروہ
مِّنْھُمْ	ان میں سے	یَسْمَعُوْنَ	وہ سنتے (تھے)		
کَلٰمَ اللّٰہِ	اللہ کا کلام	ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَہٗ	پھر بدل ڈالتے اسے		

مِنۢ بَعۡدِ	اس کے بعد کہ	مَا عَقَلُوۡهُ	وہ سمجھ لیتے اُسے
وَهُمۡ	حالانکہ وہ	يَعۡلَمُوۡنَ(75)	وہ سب جانتے ہیں۔

یہ خطاب مسلمانوں سے ہے کہ یہود سے ایمان کی توقع بے سود ہے، ان کے پہلے بزرگ یہ ہیں کہ وہ دیدہ و دانستہ اللہ کے کلام یعنی تورات میں تحریف کرڈالتے تھے۔تورات وانجیل میں لفظی اور معنوی تحریف ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آج خود یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی اس کا اعتراف ہے، دوسرے مذاہب کے پیروی کرنے والوں اور ان کی مذہبی کتابوں کا حال اس سے بھی بدتر ہے، نہ قرآن مجید کے سوا کوئی کتاب ہے جو محفوظ ہو اور نہ مسلمانوں کے سوا کوئی اُمت ہے جو اپنی آسمانی کتاب کے محفوظ ہونے کی دعویدار ہو۔ مدینہ کے مسلمان جو یہود سے کئی بار یہ سن چکے تھے کہ ایک نبی آخرالزمان ﷺ آنے والا ہے اور جو لوگ ان کا ساتھ دیں گے وہ ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔اب یہ لوگ تو ایمان لے آئے مگر یہود نے یہ کام کیا کہ تورات میں جو حلیہ نبی آخرالزمان ﷺ کا مذکور تھا۔اس میں تحریف کرڈالی اور ایمان نہ لانے کی وجہ یہ بتائی کہ اس کا حلیہ تورات میں مذکور حلیہ سے مختلف ہے انصار صحابہ کرام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کو اس بات کی بہت حرص تھی کہ یہودی اسلام قبول کرلیں کیونکہ وہ یہودیوں کے حلیف تھے اور ان کے پڑوسی بھی تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے مسلمانو! کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ یہ یہودی تمہارا یقین کریں گے یا تمہاری تبلیغ کی وجہ سے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں ایک گروہ وہ تھا جو صرف علماء پر مشتمل تھا، وہ اللہ تعالیٰ کا کلام یعنی تورات سنتے تھے اور پھر اسے سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر بدل دیتے تھے، اسی طرح ان یہودیوں نے بھی تورات میں تحریف کی اور رسول کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی سیرت کو بدل ڈالا، تو ایسے لوگ کہاں ایمان لائیں گے؟ لہٰذا تم ان کے ایمان کی امید نہ رکھو۔(قرطبی،)

باطل پرست علماء کی تحریف

آج کل کے باطل پرست علماء بھی اپنے خود ساختہ مسائل کو درست ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے حوالہ جات قرآن و حدیث سے تراش رہے ہیں اور شریعت میں تحریف کا ارتکاب کر رہے

ہیں ۔اس سے معلوم ہوا کہ عالم کا بگڑنا عوام کے بگڑنے سے زیادہ تباہ کن ہے کیونکہ عوام علماء کو اپنا ہادی اور رہنما سمجھتے ہیں، وہ علماء کے اقوال پر عمل کرتے اور ان کے افعال کو دلیل بناتے ہیں اور جب علماء ہی کے عقائد و اعمال میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو عوام راہ ہدایت پر کس طرح چل سکتی ہے، اور کئی جگہ پر شاید یہ عالم کہلانے والوں کی بد عملی کا نتیجہ ہے کہ آج لوگ دیندار طبقے سے متنفر ہو رہے ہیں اور ان کے خلاف اپنی زبان طعن دراز کر رہے ہیں ۔اے گروہ علماء! اگر تم مستحبات چھوڑ کر مباحات کی طرف جھکو گے (تو) عوام مکروہات پر گریں گے، اگر تم مکروہ کرو گے (تو) عوام حرام میں پڑیں گے، اگر تم حرام کے مرتکب ہو گے (تو) عوام کفر میں مبتلا ہوں گے ۔لِلّٰہِ اپنے اوپر رحم کرو، اپنے اوپر رحم نہ کرو (تو) اُمت مصطفیٰ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ پر رحم کرو، چرواہے کہلاتے ہو بھیڑیئے نہ بنو۔ بہرحال علم بہت اہم اور عالی چیز ہے اور یہ حقیقت ہے کہ علم، دین کا ہی علم ہے، جو لوگ علم دین میں لگتے ہیں اس کو حاصل کرنے کیلئے جدو جہد کرتے ہیں اس کی نشر و اشاعت میں محنت و مشقت برداشت کرتے ہیں ان کیلئے دنیا میں سربلندی و سرداری ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی بہت معزز اور اعلیٰ مقام ہے لیکن ان کی عزت و تکریم اور ان کا مقام و مرتبہ جب ہی ہے جب وہ علم کے ساتھ علم کے تقاضوں کو بھی پورا کریں۔

یہودیوں کے دس بڑے عالم

الغرض! اہل ایمان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ یہود سے یہ توقع نہ رکھو۔ کہ تمہاری تبلیغ سے یہ لوگ ایمان لے آئیں گے ۔ یہ تو سخت قسم کے ہٹ دھرم لوگ ہیں ۔جانتے بوجھتے ہوئے بھی یہ راہ راست سے دور ہی رہیں گے ۔حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا (1 ۔بخاری ج 1 ص 562) کہ اس وقت یہودیوں کے دس بڑے عالم موجود ہیں ۔اگر یہ دس آدمی ایمان قبول کرلیں تو کوئی بھی یہودی باقی نہیں رہے گا۔سب ایمان لے آئیں گے ۔مگر یہ عالم اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے ۔ان سے صرف ایک آدمی نے ایمان قبول کیا۔ باقی سب اپنی ضد پر اڑے رہے ۔نصاریٰ کا بھی یہی حال ہے حضور ﷺ کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں ۔مگر انہوں نے آج تک انہیں تسلیم نہیں کیا۔آپ کا ارشاد ہے (2

بخاری ج 1 ص 490، مسلم ج 1 ص 87) کہ نصاریٰ اسی طرح دنیا میں موجود رہیں گے۔ حتیٰ کہ جب مسیح (علیہ السلام) قرب قیامت میں نازل ہوں تو اس وقت ان کی سرکوبی ہوگی۔ اور پھر یہ دنیا سے ختم ہوجائیں گے۔

منافق یہودی جب صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُم سے ملتے

وَاِذَا	اور جب	لَقُوا	وہ ملتے ہیں	الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	جو ایمان لائے
قَالُوْٓا	وہ کہتے ہیں	اٰمَنَّا	ہم ایمان لائے ہیں	وَاِذَا	اور جب
خَلَا	اکیلے ہوتے ہیں	بَعْضُھُمْ	اُن کے بعض	اِلٰی بَعْضٍ	بعض کی طرف
قَالُوْٓا	وہ کہتے ہیں	اَتُحَدِّثُوْنَھُمْ	کیا تم بتاتے ہو اُنہیں	بِمَا	وہ (جو)
فَتَحَ اللّٰہُ	کھول دیا ہے اللہ نے	عَلَیْکُمْ	تم پر		
لِیُحَآجُّوْکُمْ	تاکہ وہ حجت پیش کریں تم پر	بِہٖ	اس کے ذریعے		
عِنْدَ رَبِّکُمْ	تمہارے رب کے پاس	اَفَلَا	تو کیا نہیں		
تَعْقِلُوْنَ (76)	تم عقل رکھتے۔				

حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُما فرماتے ہیں: یہودی منافق جب صحابہ کرام رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُم سے ملتے تو ان سے کہتے کہ جس پر تم ایمان لائے اس پر ہم بھی ایمان لائے، تم حق پر ہو اور تمہارے آقا محمد مصطفٰی صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سچے ہیں، ان کا قول حق ہے، ہم ان کی صفات اپنی کتاب توریت میں پاتے ہیں۔ جب یہ اپنے سرداروں کے پاس جاتے تو وہ ان منافقوں کو ملامت کرتے ہوئے کہتے: کیا تم مسلمانوں کے سامنے ان کے آقا محمد مصطفٰی صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے بارے وہ باتیں بیان کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری کتاب میں بیان فرمائی ہیں تاکہ وہ اس کے ذریعے دنیا و آخرت میں تمہارے اوپر حجت قائم کردیں کہ جب ہمارے آقا محمد مصطفٰی صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا نبی برحق ہونا تمہاری کتابوں میں موجود ہے تو تم نے ان کی پیروی کیوں نہ کی؟ کیا تمہیں عقل نہیں کہ تمہیں یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ (خازن، البقرۃ)

ضرورت کے وقت علمِ حق کو چھپانا

وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ: بڑا جرم یہ ہے کہ حق و باطل میں تلبیس کی بجائے سرے سے حق ہی کو چھپا لیا جائے۔ یہ بھی بہت بڑا جرم ہے۔ زوال کے زمانے میں رجعت پسند مذہبیت اس مرض کا بھی شکار ہوتی ہے اور وہ دین کی سچی تعلیمات کو ذاتی اور گروہی مفادات کے لیے عام لوگوں سے چھپاتی ہے۔ یہودیوں میں بھی زوال کے زمانے میں یہ مرض لاحق ہو چکا تھا۔ اس لیے قرآن حکیم نے خاص طور پر بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے حق کو چھپانے سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔ حق کو چھپانا اتنا بڑا جرم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی شدید مذمت کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ”جس آدمی سے کسی ایسے علم کے بارے میں سوال کیا گیا، جسے وہ جانتا ہے، پھر اُس نے اُسے چھپایا تو قیامت کے دن اُس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔“ (مشکوٰۃ: 223) امام شاہ ولی اللہ دہلوی اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ: ”ضرورت کے وقت علمِ حق کو چھپانا حرام ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا دین کی توہین ہے۔ یہ شریعت کو بھلا دینے کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح کرنے سے علم کا بڑا حصہ مٹ جاتا ہے۔“ (حجۃ اللہ البالغہ، من ابواب الاعتصام بالکتاب و السنۃ) حقیقت یہ ہے کہ جب دین کے نااہل نمائندے دنیاوی لذات اور خواہشات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور دین کے غلبے کا اہتمام نہیں کرتے اور نہ اُس کی تعلیم دیتے ہیں اور نہ اس پر ٹھیک طرح سے عمل کرتے ہیں، نیکیوں اور معروفات کا نظام نہیں بناتے، منکرات سے نہیں روکتے تو آہستہ آہستہ دین کے خلاف رسومات اور نظام ہائے حیات قائم ہو جاتے ہیں۔ یہ سچے علم کو چھپانے اور اُسے پڑھنے پڑھانے سے رک جانے کے نتائج ہوتے ہیں۔ اس لیے خاص طور پر حق و باطل کی تلبیس اور سرے سے حق کو چھپانے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ اس کو بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچاننے کے لیے تورات وغیرہ میں خاصا مواد موجود تھا۔ جسے یہ لوگ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ آنے سے پہلے لوگوں میں مشہور کر چکے تھے اور ان میں کچھ لوگ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد بھی بیان

کر دیتے تھے اور ان سے کہہ دیتے کہ ہم بھی اس پیغمبر پر ایمان لاتے ہیں ۔ مگر وہ جب اپنے گرو گھنٹالوں کے ہاں جاتے تو وہ انہیں یہ کہتے کہ تم مسلمانوں کو تورات کی ایسی باتیں کیوں بتاتے ہو جو تمہارے اپنے خلاف جاتی ہیں ۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ کے حضور مسلمان تم پر حجت قائم کر دیں کہ یہ لوگ پورا علم ہونے کے باوجود بھی ایمان نہ لائے تھے ۔ مسلمانوں سے بات کرنے سے پہلے کچھ سوچ تو لیا کرو ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق پوشی اور سرکار دوعالم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے اوصاف کو چھپانا اور ان کے کمالات کا انکار کرنا یہودیوں کا طریقہ ہے ۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کی معرفت

اَوَلَا	اور کیا نہیں	یَعْلَمُوْنَ	وہ جانتے ہیں	اَنَّ اللّٰہَ	کہ بیشک اللہ
یَعْلَمُ	وہ جانتا ہے	مَا یُسِرُّوْنَ	جو وہ چھپاتے ہیں	وَمَا	اور جو
یُعْلِنُوْنَ(77)			وہ سب ظاہر کرتے ہیں ۔		

بالفاظ دیگر ان یہود علماء کا یہ خیال تھا کہ بس مسلمانوں کے بتانے سے ہی اللہ تعالیٰ کو قیامت کے دن اس حقیقت کا پتہ چلے گا ورنہ نہیں ۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کی معرفت اتنی کمزور ہے کہ انہیں یہ بھی یقین نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی کھلی اور چھپی سب باتوں کو خوب جاننے والا ہے اور ان باتوں کو بھی جو یہ اب اپنے ساتھی یہودیوں سے کر رہے ہیں ۔

بے بنیاد اور غلط قسم کی آرزوئیں

وَمِنْھُمْ	اور ان میں سے (بعض)	اُمِّیُّوْنَ	ان پڑھ ہیں		
لَا یَعْلَمُوْنَ	نہیں وہ جانتے	الْکِتٰبَ کتاب		اِلَّآ سوائے	
اَمَانِیَّ	آرزوؤں کے	وَاِنْ ھُمْ		اور نہیں وہ سب	
اِلَّا یَظُنُّوْنَ(78)			مگر وہ گمان کرتے ہیں ۔		

بنی اسرائیل کے عناد اور سرکشی کو بیان کرنے کے بعد اب ان کے مختلف طبقوں کا بیان ہو رہا

ہے، اس آیت میں عوام کی حالت بیان کی گئی ہے۔ (رازی) اُمیّ وہ ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو اور "اَمَانِیَّ" "اُمْنِیَّةٌ" کی جمع ہے، "اُمْنِیَّةٌ" کا ایک معنی تلاوت بھی آتا ہے، فرمایا: (اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ) [الحج:52] اس کا ایک ترجمہ تلاوت بھی کیا گیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ خالی تلاوت کر سکتے ہیں مگر انھیں اس کے مطلب کی کچھ خبر نہیں، جیسا کہ آج کل اکثر مسلمان، خواہ حافظ قرآن ہوں، محض تلاوت کر سکتے ہیں، مگر مفہوم سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ جس کے معنی آرزوؤں یا من گھڑت روایات کے ہیں، یعنی یہود میں ایک طبقہ جو عوام کا ہے اور ان پڑھ ہے، انھیں "الکتاب" یعنی تورات کا تو کچھ علم نہیں، مگر وہ اپنے سینوں میں بعض بے بنیاد قسم کی آرزوئیں پالے ہوئے ہیں، یعنی علماء یہود اپنی عوام کو یقین دلاتے تھے کہ جنت میں صرف ہم ہی داخل ہوں گے اور چوں کہ ہمارے آباء واجداد اللہ کے پیغمبر تھے: اس لئے وہ بہر حال ہماری مغفرت کرالیں گے، اس طرح کی جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا کر کے ان کو اسلام قبول کرنے سے روکتے تھے، قرآن نے اسی خوش خیالی اور خود فریبی کی تردید کی ہے۔ مختلف قسم کی خرافات کا عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ ان کی غلط آرزوئیں ہیں یا من گھڑت قصے ہیں جو انھوں نے سن رکھے ہیں۔

بے بنیاد اور غیر حقیقت پسندانہ آرزوؤں (خواہشات) کا تعلق عموماً ایسی سوچ سے ہوتا ہے جو زمینی حقائق، انسانی صلاحیتوں یا اخلاقی حدود سے ماورا ہو۔ ایسی خواہشات اکثر انسان کو ذہنی تناؤ اور مایوسی کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور ایسی بے بنیاد آرزوئیں انسان کو موجودہ نعمتوں کی قدر کرنے سے روکتی ہیں، ذہنی سکون غارت کرتی ہیں اور مستقل بے چینی کا سبب بنتی ہیں۔ ہمیں اس سے سبق حاصل کر کے ان بے بنیاد خواہشات کی جگہ حقیقت پسندانہ اہداف مقرر کیے جائیں، اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کیا جائے، اور قناعت (جو مل گیا ہے اس پر شکر) کو اپنایا جائے، جس سے زندگی میں حقیقی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

غلط فتووں کی کمائی / باطل عقائد کی بنیاد
مسلمانوں کے باطل عقائد

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا
يَكْسِبُوْنَ ۝٧٩ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ
عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٨٠ بَلٰى مَنْ كَسَبَ
سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـــَٔـــتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٨١
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٨٢

تورات کے احکام ردو بدل کرنے والے

فَوَيْلٌ	پس ہلاکت ہے	لِّلَّذِيْنَ	(اُن) کے لئے جو		
يَكْتُبُوْنَ	وہ لکھتے ہیں	الْكِتٰبَ	کتاب	بِاَيْدِيْهِمْ	اپنے ہاتھوں سے
ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ	پھر وہ کہتے ہیں	هٰذَا	یہ		
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ	اللہ کی طرف سے	لِيَشْتَرُوْا	تاکہ وہ حاصل کریں		
بِهٖ	اس کے ذریعے	ثَمَنًا قَلِيْلًا	معمولی قیمت	فَوَيْلٌ	پس ہلاکت ہے

لَّهُمْ	اُن کے لئے	مِّمَّا كَتَبَتْ	(اس) سے جولکھا

اَيْدِيْهِمْ	ان کے ہاتھوں نے	وَوَيْلٌ	اور ہلاکت ہے	لَّهُمْ	اُن کیلئے

مِّمَّا	(اس) سے جو	يَكْسِبُوْنَ(79)	وہ کماتے ہیں۔

گذشتہ آیت میں عوام کا ذکر تھا اور اس آیت میں علماء یہود کا ذکر ہے، جو معمولی پیسے لے کر تورات کے احکام ردو بدل کے ساتھ بتایا کرتے تھے۔ جب سرکارِ دو جہاں صَلَّى اللہُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ مدینہ طیبہ تشریف فرما ہوئے تو علماء توریت اور سرداران یہود کو قوی اندیشہ ہوگیا کہ ان کی روزی جاتی رہے گی اور سرداری مٹ جائے گی کیونکہ توریت میں حضور پرنور صَلَّى اللہُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا حلیہ اور اوصاف مذکور ہیں، جب لوگ حضور اقدس صَلَّى اللہُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو اس کے مطابق پائیں گے تو فوراً ایمان لے آئیں گے اور اپنے علماء اور سرداروں کو چھوڑ دیں گے، اس اندیشہ سے انہوں نے توراۃ میں تحریف وتغیر کر ڈالا۔ علماء یہود کا یہ حال تھا کہ انہوں نے تورات کی شروح اور علماء کے فتاویٰ کو بھی تورات میں ہی خلط ملط کر ڈالا تھا۔ پھر عام لوگوں سے اسے یوں بیان کرتے تھے گویا یہ سب کچھ ہی منزل من اللہ ہے۔ اور اس سے غرض محض دنیوی مال و دولت کا حصول ہوتا تھا اور ان کے مفسروں کی تاویلات، مفکروں کے فلسفیانہ خیالات اور فقہاء کے قانونی اجتہادات اور اپنے قومی تاریخی واقعات، یہ سب چیزیں بائیبل میں شامل کر دی تھیں اور اس سب کچھ پر ایمان لانا فرض قرار دیا گیا تھا۔ ایسے مجموعہ میں سے انہیں کسی بھی قسم کا فتویٰ دینے یا لکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی اور جرائم کی نوعیت کے لحاظ سے اپنے فتووں کے منہ مانگے دام وصول کرتے تھے۔

اس پر فرمایا گیا کہ بربادی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے تورات میں من گھڑت باتیں لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ بھی خدا عَزَّ وَجَلَّ کی طرف سے ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اس کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت حاصل کرلیں۔ تو ان لوگوں کے لئے ان کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے کی وجہ سے اور ان کی کمائی کی وجہ سے تباہی و بربادی ہے۔ اس آیت میں یہود کے علما کی جسارت اور خوف الٰہی سے بے نیازی کی وضاحت ہے کہ اپنے

ہاتھوں سے مسئلے گھڑتے ہیں اور یہ بانگ دہل یہ باور کراتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہیں۔ (وَيۡلٌ) کا معنی ہلاکت اور تباہی ہے، اس پر تنوین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ بڑی ہلاکت کیا گیا ہے۔ حدیث کی رو سے (وَيۡلٌ) جہنم میں ایک وادی بھی ہے جس کی گہرائی اتنی ہے کہ ایک کافر کو اس کی تہ تک گرنے میں چالیس سال لگیں گے۔ (احمد، ترمذی، ابن حبان والحاکم بحوالہ فتح القدیر) بعض علما نے اس آیت سے قرآن مجید کی فروخت کو ناجائز قرار دیا ہے، لیکن یہ استدلال صحیح نہیں۔ آیت کا مصداق صرف وہی لوگ ہیں جو دنیا کمانے کے لئے کلام الٰہی میں تحریف کرتے اور لوگوں کو مذہب کے نام پر دھوکہ دیتے ہیں۔

یہود کا من گھڑت عقیدہ اور اس کے تین جواب

وَقَالُوۡا	اور انہوں نے کہا	لَنۡ	ہرگز نہیں	تَمَسَّنَا	چھوئے گی ہمیں
النَّارُ	آگ	اِلَّآ اَيَّامًا	مگر چند دن	مَّعۡدُوۡدَةً	گنتی کے
قُلۡ	آپ کہہ دیں	اَتَّخَذۡتُمۡ	کیا تم نے لے رکھا ہے	عِنۡدَ اللّٰهِ	اللہ کے پاس
عَهۡدًا	کوئی وعدہ	فَلَنۡ	تو ہرگز نہیں	يُّخۡلِفَ اللّٰهُ	وہ خلاف کرے گا اللہ
عَهۡدَهٗۤ	اپنے وعدے کے	اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ	یا تم کہتے ہو		
عَلَى اللّٰهِ	اللہ پر	مَا لَا	جو نہیں	تَعۡلَمُوۡنَ(80)	تم جانتے۔

یہودیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم چونکہ انبیاء کی اولاد اور اللہ کے محبوب ہیں لہذا ماسوائے چند دن کے انہیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ ان کے اس باطل عقیدہ کا جواب اللہ تعالیٰ نے کئی طرح سے دیا ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ اس عقیدہ کی اصل کیا ہے؟ کیا اللہ نے تم سے کوئی ایسا وعدہ لے رکھا ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو دکھاؤ تو سہی۔ یا بس تم اللہ پر ایسی ہی جھوٹی باتیں جڑ دیتے ہو؟ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اے یہود! اگر تم فی الواقع اس دعوے میں سچے ہو کہ تم اللہ کے چہیتے ہو اور ماسوائے چند دن کے تمہیں دوزخ کی آگ چھو بھی نہیں سکے گی تو پھر تم مرنے کی آرزو کیوں نہیں کرتے یا بالفاظ دیگر

ان دنیا کے جھنجٹوں سے نکل کر جنت میں جانے کی آرزو کیوں نہیں کرتے؟ اور چونکہ یہود مرنے کے لیے مطلقاً آمادہ نہیں بلکہ طویل مدت تک دنیا میں ہی رہنا چاہتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ یہود اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں اور تیسرا جواب انہیں یہ دیا گیا کہ اللہ کا قانون جزاء وسزا سب کے لیے یکساں ہے۔ یہاں نسبی رشتے کچھ کام نہیں آئیں گے جس شخص کو اس کی بداعمالیوں نے گھیر لیا وہ یقیناً دوزخ میں ہی جائے گا۔ پھر ہمیشہ اس میں رہے گا اور اس قانون میں اے یہود! تمہارے لیے کوئی تخصیص نہیں۔ اس آیت میں یہود کی ہمہ گیر گمراہی کا بیان ہے، جس میں عوام اور علماء سبھی مبتلا تھے، یعنی ہم اللہ کے محبوب اور پیارے ہیں، ہم چاہے کتنے بھی گناہ کریں جہنم میں نہیں ڈالے جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو چند دن وہاں رکھ کر نکال لیے جائیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں سے کئی سوال کیے، ان میں سے ایک یہ تھا: (مَنْ أَهْلُ النَّارِ ؟) "آگ میں جانے والے کون لوگ ہیں؟" انھوں نے کہا: "ہم اس میں تھوڑی دیر رہیں گے، پھر اس میں تم ہماری جگہ لے لو گے۔" تو آپ ﷺ نے فرمایا: (اِخْسَئُوْا فِيْهَا، لَا نَخْلُفُكُمْ فِيْهَا أَبَدًا) "تمھی اس میں دفع دور رہو ہم اس میں کبھی تمہاری جگہ نہیں لیں گے۔" [بخاری، الجزیۃ والموادعۃ، باب إذا غدر المشرکون۔۔: 3169] اللہ تعالیٰ کے ہاں بنی اسرائیل کے عقائد باطلہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ جس چیز کو بنی اسرائیل بیان کر رہے ہیں۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب امت کا رشتہ علم وعمل نبی سے منقطع ہو جاتا ہے۔ تو آرزوئیں اور خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔ یہی حال یہودیوں کا تھا ان کے تمام افعال نبی سے قطع تعلق پر دلالت کرتے ہیں۔ انہوں نے نبی کی تعلیم کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی کے عقیدے وضع کئے ہوئے ہیں۔ اور انہیں من گھڑت عقیدوں بلکہ خواہشات کی بنا پر وہ اس زعم میں مبتلا ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) انہیں دوزخ سے بچا لیں گے۔ اس قسم کے غلط عقیدوں کا دائرہ یہودیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ مسلمانوں تک وسیع ہو چکا ہے۔

شفاعت کا مسئلہ اور قرآن پاک کی وضاحت

شفاعت کا مسئلہ ہی لے لیں۔ یہاں پر" یاشفیع المذنبین " کے نعرے مارے جاتے ہیں۔کہ ہم جو چاہے کرتے پھریں۔حضور ﷺ ہماری شفاعت کر دیں گے اور ہم نجات پا جائیں گے۔حالانکہ شفاعت کا مسئلہ قرآن پاک نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ شفاعت لوگوں کی خواہش پر نہیں ہوگی۔بلکہ یہ تو اللہ جل جلالہ کی مرضی پر موقوف ہے۔" لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی۔" اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر تو کوئی بھی سفارش نہیں کریگا اس آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ روزِ قیامت انبیاء اور فرشتے بھی صرف انہی لوگوں کی سفارش کرسکیں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ اجازت دے گا اور ان کے عمل سے راضی ہوگا۔تم کس زعم میں مبتلا ہو۔ یہ عقیدہ کہ فلاں ضرور ہماری سفارش کریں گے۔اور اللہ تعالیٰ اسے ضروری قبول فرمائے گا یہ تو یہودیوں والا عقیدہ ہے۔محض میلاد منعقد کر لینا۔جلوس نکال لینا یا گیارہویں منالینا کافی سمجھ رکھا ہے۔بس شفاعت کے حقدار ہو گئے شیعہ بھی یہی کہتے ہیں۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نام لے لو۔ماتم برپا کرلو۔بس بخشے جاؤ گے،کسی نماز روزے کی ضرورت نہیں۔اس قسم کے باطل عقیدے اس وقت پیدا ہوتے ہیں۔جب علم وعمل کا تعلق نبی سے کٹ جاتا ہے۔پھر خواہشات عقیدے بن جاتے ہیں۔اور ساری عمر لوگ اسی ڈھول کو پیٹتے رہتے ہیں۔یہ یہودیوں والے عقائد ہیں۔سفارش کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔جو لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔کہ خدا چاہے راضی ہو یا ناراض۔نبی،ولی،جبری سفارش کریں گے۔اور ہمیں بچالیں گے یہودیوں نے بھی یہیں سے ٹھوکر کھائی۔اور ہم بھی اسی راستے پر چل نکلے ہیں۔ان میں اور ہم میں کیا فرق رہ گیا ہے۔

گناہ کا احاطہ کا مفہوم ومطلب

بَلٰی	ہاں کیوں نہیں	مَنْ کَسَبَ	جس نے کمائی	سَیِّئَۃً	برائی				
وَّاَحَاطَتْ	اور گھیرلیا	بِهٖ	اس کو	خَطِیْٓـَٔتُهٗ	اس کے گناہ نے				
فَاُولٰٓئِكَ	تو وہی لوگ	اَصْحٰبُ النَّارِ	دوزخ والے ہیں۔						

هُمۡ فِيۡهَا	وہ اس میں	خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾	ہمیشہ رہیں گے۔

فرمایا اے بنی اسرائیل! نجات کا قانون وہ نہیں ہے جو تم نے بنا رکھا ہے۔ کہ جنت میں پہنچنے کے لیے صرف یہودی ہونا کافی ہے۔"بَلٰی" بلکہ قانون نجات یہ ہے کہ"مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيۡٓـئَتُهٗ جس شخص نے بھی گناہ کمایا اور اسکے گناہوں نے اسے گھیر لیا۔"فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ" یہی لوگ دوزخی ہیں۔ "هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ" جو ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہی گناہ انسان کو گھیرے گا۔ جو سب سے بڑا ہوگا۔ اور چاروں طرف چھایا ہوگا۔ اور یہ گناہ کفر و شرک کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ آدمی بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ مگر وہ گناہوں سے گھرا ہوا نہیں ہوتا۔ جب تک کفر و شرک کا ارتکاب نہ کرے۔ اس آیت میں گناہ سے شرک وکفر مراد ہے اور احاطہ کرنے سے یہ مراد ہے کہ نجات کی تمام راہیں بند ہو جائیں اور کفر وشرک ہی پر اس کو موت آئے کیونکہ مومن خواہ کیسا بھی گنہگار ہو گناہوں سے گھرا نہیں ہوتا مومن کس قدر بھی گناہ میں مبتلا ہو، کم سے کم ایمانِ قلبی سے محروم نہ ہوگا اور وہی چیز انشاء اللہ اس کو انجام کار دوزخ سے نجات دلائے گی اور جنت میں لے جائے گی۔

مؤمنین کے ایمان اور عمل صالح پر بشارت

وَالَّذِيۡنَ	اور جو (لوگ)	اٰمَنُوۡا	ایمان لائے	وَعَمِلُوا	انہوں نے عمل کئے
الصّٰلِحٰتِ	نیک	اُولٰٓـئِكَ	وہی لوگ	اَصۡحٰبُ الۡجَـنَّةِ	جنت والے ہیں
هُمۡ فِيۡهَا	وہ اس میں	خٰلِدُوۡنَ (82)	ہمیشہ رہنے والے ہیں		

جس طرح کفر اور شرک عظیم گناہ ہیں۔ اسی طرح ایمان عظیم ترین نیکی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، أَيُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟ حضور! کونسا عمل افضل ترین ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا (1۔ مسلم ج 1 ص 62) اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا یہ تمام اعمال کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی لیے فرمایا"وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا" جو لوگ ایمان لائے"وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" اور نیک اعمال کئے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ادا کیا۔ اس کے بعد جہاد اور نیکی کے دیگر کام انجام دیے،

ان کے متعلق فرمایا "أُولَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلۡجَنَّةِ" یہی لوگ جنت والے ہیں۔ جنت کی چابی ان کے پاس ہے اور یہ کوئی عارضی مقام نہیں ہوگا۔ بلکہ "هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں سے کبھی بھی نکالے نہیں جائیں گے۔(وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ) کفر پر وعید کے بعد ایمان اور عمل صالح پر بشارت ہے اور یہ قرآن کا عام اسلوب ہے کہ بشارت و نذارت دونوں اکٹھی ذکر ہوتی ہیں۔ الغرض! یہاں اُصول بتا دیا گیا کہ جنت و دوزخ میں داخل ہونا رنگ و نسب اور نسل و خاندان سے متعلق نہ ہوگا، کہ حضرت ابراہیم یا حضرت اسحاق یا حضرت اسماعیل علیہم السلام کی اولاد جنت ہی میں جائے گی، دوزخ میں نہ جائے گی؛ بلکہ اس کا تعلق ایمان و عمل سے ہوگا، جو صاحب ایمان ہو اور عمل صالح کرتا ہو وہ جنتی ہوگا اور جو کفر و نافرمانی کا راستہ اختیار کرے گا، وہ دوزخی ہوگا اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْجَنَّةَ، وَأَعُوذُبِكَ مِنَ النَّارِ۔

دین میں عبادات کا مقام/عبادت کا ناقص تصور
خون ناحق اور جلا وطنی

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْـنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ
ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ
دِمَاۗءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾

اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ موڑنے والے

وَاِذْ	اور جب	اَخَذْنَا	ہم نے لیا	مِيْثَاقَ	پختہ عہد
بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ	بنی اسرائیل سے	لَا تَعْبُدُوْنَ	نہیں تم عبادت کرو گے		
اِلَّا اللّٰهَ	مگر اللہ کی	وَبِالْوَالِدَيْنِ	اور والدین کے ساتھ	اِحْسَاناً	احسان کرنا
وَذِي الْقُرْبٰى	اور قرابت داروں	وَالْيَتَامٰى	اور یتیموں		
وَالْمَسَاكِيْنِ	اور مساکین (کے ساتھ)	وَقُوْلُوْا	اور تم کہو		

لِلنَّاسِ	لوگوں سے	حُسْناً	اچھی بات	وَاَقِیْمُوا	اور قائم کرو	الصَّلٰوۃَ	نماز
وَآتُوا	اور ادا کرو	الزَّکٰوۃَ	زکوۃ	ثُمَّ	پھر	تَوَلَّیْتُمْ	تم پھر گئے
اِلَّا	سوائے	قَلِیْلاً	تھوڑے سے	مِّنْکُمْ	تم میں سے		
وَاَنْتُمْ	اور تم	مُّعْرِضُوْنَ	سب پھر جانے والے ہو۔(83)				

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ: اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ یعنی اے یہودیو! وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے تورات میں یہ عہد لیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو لیکن اسے قبول کرنے کے بعد ان میں سے چند آدمیوں کے علاوہ سب اس عہد سے پھر گئے اور تم بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام سے منہ موڑنے والے ہو۔ (جلالین مع صاوی، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۸۳، ۱ / ۸۱-۸۲، ملخصاً) اب یہاں اس آیت میں پھر ان کو وہ عہد یاد دلایا جا رہا ہے جو بنیادی احکام (عبادات ومعاملات) دیتے وقت ان سے لیا گیا تھا اور بتایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس عہد کی پابندی نہ کی اور اس سے سراسر بے پروائی اختیار کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کی عادت ہی اللہ تعالیٰ کے احکام سے اعراض کرنا اور اس کے عہد سے پھر جانا ہے۔ چنانچہ تورات میں جا بجا توحید پر قائم رہنے کی اور لوگوں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید موجود ہے۔

عبادت کی چار قسمیں

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللہَ: عبادت کی چار قسمیں ہیں: 1 بدنی عبادت، جیسے طواف، رکوع، سجدہ وغیرہ۔ 2 مالی عبادت، جیسے صدقہ وخیرات کرنا اور نذر ونیاز ماننا۔ 3 لسانی عبادت (یعنی زبان سے)، جیسے کسی کے نام کا وظیفہ جپنا، یا اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے کسی کا نام لینا۔ 4 قلبی عبادت (یعنی دل سے)، جیسے کسی پر بھروسا رکھنا کسی سے خوف کھانا یا امید رکھنا۔ یہ سب عبادتیں اللہ کے لیے ہیں،

ان میں جس نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک بنایا وہ شرک کا مرتکب ہوگیا۔

عبادت کا لفظ تین معانی پر مشتمل

عبادت کا لفظ تین معانی پر مشتمل ہے: (۱) پرستش، (۲) غلامی، (۳) اطاعت، خدا کے واحد پروردگار ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اسی کا شکر گزار رہو، اسی سے دعائیں مانگے اور اسی کے آگے عقیدت و محبت سے سر جھکائے، یہ عبادت کا پہلا مفہوم ہے۔ انسان خدا کا بندہ و غلام بن کر رہے، اس کے مقابلے میں خود مختارانہ رویہ نہ اختیار کرے اور اس کے سوا کسی اور کی غلامی قبول نہ کرے یہ عبادت کا دوسرا مفہوم ہے، انسان خدا کے حکم کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرے نہ خود اپنا حکمراں بنے اور اس کے سوا کسی دوسرے کی حاکمیت تسلیم کرے یہ عبادت کا تیسرا مفہوم ہے۔

عبادت ایک جامع لفظ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ "اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔" عبادت ایک ایسا جامع لفظ ہے اس کے اندر وہ تمام ظاہری و باطنی اقوال و افعال داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور اس کی خوشنودی کا باعث ہیں مثلاً: نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، راست گوئی، امانت داری، اطاعت والدین، ایفائے عہد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ، پڑوسیوں، مسکینوں اور ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک، جانوروں کے ساتھ اچھا برتاؤ، دعاء، ذکر الٰہی، تلاوت قرآن اور اس قسم کے تمام اعمال صالحہ عبادات کے اجزاء ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت، رحمت خداوندی کی امیدوار اور عذاب الٰہی کا خوف، خشیت، انابت، اخلاص، صبر و شکر، توکل اور تسلیم و رضا وغیرہ ساری اچھی صفات عبادات میں شامل ہیں۔

دین میں عبادات کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہیں، عبادات کے بغیر دین کو صحیح صورت پہ باقی رکھنا ممکن نہیں، اگرچہ دین کے تمام احکام کی تعمیل لوجہ اللہ عبادت ہے مگر عام طور پر مشہور عبادتیں: نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے اندر جو ملأ اعلیٰ سے ربط اور مناسبت پیدا کرنے کی تاثیر اور

انسان کے روحانی اور ملکوتی پہلو کی ترقی اور تکمیل کی خاصیت ہے وہ کسی دوسرے عمل میں نہیں، ان کو عبادات میں وہی مقام حاصل ہے جو اعضاء جسم میں قلب و دماغ کو ہے اسی بنا پر ان کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور ان پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

اسلام کی بنیادی پانچ چیزیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: بُنِيَ الإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ، عَلَى أَنْ يُعْبَدَ اللّٰهُ، وَيُكْفَرَ بِمَا دُونَهُ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَحَجِّ الْبَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس پر کہ اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے سوا ہر کسی کی عبادت سے انکار کیا جائے، یعنی اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں نماز قائم کرنے، زکاۃ دینے، بیت اللہ کا حج کرنے اور رمضان کے روزے رکھنے پر۔" [صحیح مسلم/ کتاب الایمان/ حدیث: 112]

یہ بنیادی عبادات ہیں؛ لیکن ان کا دائرہ محدود نہیں ہے؛ بلکہ بے حد وسیع ہے، انسان کے لیے ضروری ہے کہ اہم عبادات کے ذریعے اپنی ساری زندگی کو کامیاب بنائے اور پھر اصل مقصود جو رضاء الٰہی ہے وہ حاصل کرے، بقول آزاد قرآن کہتا ہے: "اصل دین خدا پرستی اور نیک عمل ہے۔" اسلام میں عبادات کا ایک رخ داخلی و قلبی ہے اور دوسرا خارجی و جسمانی و مجلسی۔ ان دونوں رخوں کے بارے میں قرآن و حدیث اور کتب فقہ میں مفصل احکام موجود ہیں۔ اسلام میں عبادات صرف وہی نہیں جو خدا سے مناجات و مکالمے کا روپ دھارتی ہے؛ بلکہ وہ بھی ہے جو اندر کی طہارت کے ذریعے خارجی اجتماعی افعال و اعمال انسانی کے بارے میں بھی صدق و اخلاص، حسن نیت اور حسن عمل کے اوصاف پیدا کرتی ہے، داخلی عبادات کے بغیر عبادت کے ظاہری رخ ناقص رہتے ہیں۔ شریعت کے ظاہری اعمال بھی اسی لیے ہیں کہ یہ مقصد حاصل ہو۔ پس ہمیں پوری زندگی کو عبادت کے سانچے میں ڈالنا چاہیے، جس کی صورت یہ ہے کہ ہم اپنے تمام ظاہری اور باطنی اعمال و اقوال جو اللہ کو پسند ہیں، اس کی خوشنودی کا ذریعہ ہیں انھیں پورے خلوص و دیانت داری کے ساتھ ادا کریں۔

چند اعمال اور مراسم عبودیت کا ہمارا تصور

آج ہمارے یہاں عبادت کا حلیہ بگڑا ہوا ہے، اس کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر یہ ہے کہ ہم نے عبادات کو صرف چند اعمال اور مراسم عبودیت کے ساتھ خاص کرلیا ہے اور یہ سمجھ لیا کہ بس ان کی ادائیگی پر عبادت منحصر ہے، بقیہ زندگی اس سے بالکل خالی ہے، نماز کو ہم عبادت سمجھتے ہیں اور صحیح سمجھتے ہیں، روزہ عبادت ہے، زکوۃ عبادت ہے، حج عبادت ہے۔ بلاشبہ یہ سب عبادات ہیں، لیکن جب دین کو ان میں منحصر کرلیا جائے اور یہ تصور قائم کرلیا جائے کہ بس ان کو بجالانے سے ہم حق عبودیت سے عہدہ برآ ہوگئے یہ بالکل غلط تصور ہوگا۔ "اگر صرف ان عبادات کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ بس ان کو ادا کرنے سے عبادت کا حق ادا ہوگیا، تو تصور دین محدود ہی نہیں؛ بلکہ مسخ ہو جائے گا"

عبادت پوری زندگی میں خدا کے سامنے بچھ جانے کا نام ہے؛ زندگی کے ہر معاملے اور ہر گوشے کو اللہ کے حکم کا مطیع بنا دینا اور اپنی آزادی، اپنی خود مختاری، اپنی پسند اور ناپسند کو اللہ کی مرضی کے تابع بنا دینا اسی رویہ اور طرز عمل پر کاربند ہونا، زندگی کے تمام افعال و اعمال میں سر تسلیم خم کرنا ہی عبادت ہے۔ الغرض! معلوم ہوا کہ عبادت کے معنی بندگی اور طاعت کے ہیں، عبادت صرف کلمہ، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کا نام نہیں بلکہ ہر وہ کار خیر اور مباح عمل بھی عبادت میں داخل ہے جو خالص اللہ کے لئے کیا جائے اور شریعت کے مطابق کیا جائے، پس سنت پر عمل کرنا بھی عبادت ہے، اور ۲۴ / گھنٹے کی زندگی میں کھانا، پینا، اٹھنا بیٹھنا، والدین کی خدمت کرنا اور تجارت وغیرہ کرنا یہ سب کام عبادت بن سکتے ہیں بشرطیکہ سنت و شریعت کے مطابق انجام دئے جائیں، درود شریف بھی عبادت ہے، ذکر بھی عبادت ہے اور حجر اسود کو بوسہ دینا بھی عبادت ہے۔

خون ناحق اور جلا وطنی

وَاِذۡ	اور جب	اَخَذۡنَا	ہم نے لیا	مِیۡثَاقَکُمۡ	تم سے پختہ عہد
لَا تَسۡفِکُوۡنَ	نہ تم بہاؤ گے	دِمَآءَکُمۡ	اپنوں کے خون		
وَلَا تُخۡرِجُوۡنَ	اور نہ تم نکالو گے	اَنۡفُسَکُمۡ	اپنے نفسوں کو		

مِّن دِيَارِكُمْ	اپنے گھروں سے	ثُمَّ	پھر	اَقْرَرْتُمْ	تم نے اقرار کیا
وَاَنْتُمْ	اور تم	تَشْهَدُوْنَ		گواہ ہو۔(84)	

خون ناحق اور جلاوطنی بڑے گناہوں میں سے ہیں ۔ان دو برائیوں سے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے توراۃ میں عہد لیا تھا کہ ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کریں گے ۔مگر یہ قوم اس عہد پر بھی قائم نہ رہی ۔ارشاد ہوتا ہے" وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ " جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا" لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ " کہ ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے ۔یعنی اپنے ہی بھائی بندوں اور اپنے ہم مذہب اور اپنی ہی ملت والوں کا قتل ناحق نہیں کرو گے ۔جس طرح یہ حکم آج تک بائبل میں موجود ہے ۔یہی حکم قرآن پاک میں موجود ہے ۔آگے سورہ نساء سورہ بنی اسرائیل اور سورہ فرقان میں آئے گا کہ ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ ۔یہ قطعی حرام ہے اور اکبر الکبائر یعنی سب سے بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے ۔توراۃ میں دوسرا حکم یہ تھا" وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ "یعنی تم اپنے ہم مسلک لوگوں کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے ۔مگر تم نے اس عہد کا بھی پاس نہ کیا ۔فرمایا" ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ "یہ الفاظ توراۃ میں موجود ہیں ۔کہ اے بنی اسرائیل !تم نے اقرار کیا کہ وعدہ کو ایفاء کریں گے اور توراۃ کے احکام کی پابندی کریں گے ۔" وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ "اور تم خود اس بات کے گواہ ہو کہ ایسا ہی ہوا تھا ۔تم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ اقرار کیا تھا کہ تم اپنے بھائیوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہ ہی انہیں جلاوطن کرو گے ۔

ہر نبی کی بنیادی اور اولین دعوت

الحاصل !ان آیات میں پھر وہ عہد بیان کیا جارہا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا لیکن اس سے بھی انہوں نے اعراض ہی کیا ۔اس عہد میں اولاً صرف ایک اللہ کی عبادت کی تاکید ہے جو ہر نبی کی بنیادی اور اولین دعوت رہی ہے (جیسا کہ سورۃ الانبیاء آیت اور دیگر آیات سے واضح ہے)اس کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے اللہ کی عبادت کے بعد دوسرے نمبر پر والدین کی اطاعت وفرماں برداری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید سے واضح کر دیا گیا کہ جس طرح اللہ کی

عبادت بہت ضروری ہے، اسی طرح اس کے بعد والدین کی اطاعت بھی بہت ضروری ہے اور اس میں کوتاہی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد دوسرے نمبر پر والدین کی اطاعت کا ذکر کرکے اس کی اہمیت کو واضح کر دیا ہے، اس کے بعد رشتے داروں، یتیموں اور مساکین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اور حسن گفتار کا حکم ہے، اسلام میں بھی ان باتوں کی بڑی تاکید ہے، جیسا کہ احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے واضح ہے۔اس عہد میں اقامت صلٰوۃ اور ایتائے زکٰوۃ کا بھی حکم ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں عبادتیں پچھلی شریعتوں میں بھی موجود رہی ہیں جن سے ان کی اہمیت واضح ہے۔اسلام میں بھی یہ دونوں عبادتیں نہایت اہم ہیں، حتیٰ کہ ان میں سے کسی ایک کے انکار، یا اس سے اعراض کو کفر کے مترادف سمجھا گیا ہے، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق (رضي الله عنہ) کے عہد خلافت میں مانعین زکٰوۃ کے خلاف جہاد کرنے سے واضح ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نیک راہوں پر چلائے اور یہود کی اختیار کردہ راہوں سے بچائے، اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں اپنی اطاعت و بندگی اور اپنے محبوب کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت واتباع میں اخلاص عطا کرے۔آمین

دورِ نبوی میں یہود کا انجام/مسلمانوں کی حالت زار

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

ثُمَّ اَنْتُمْ ھٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْکُمْ مِّنْ دِیَارِھِمْ ز تَظٰھَرُوْنَ
عَلَیْھِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ یَّاْتُوْکُمْ اُسٰرٰی تُفٰدُوْھُمْ وَھُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْکُمْ
اِخْرَاجُھُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ
ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ج وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ط
وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ ز فَلَا
یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾

مدینہ میں یہود کے مشہور قبائل اور ان کے مذموم افعال

ثُمَّ اَنْتُمْ	پھر تم	ھٰٓؤُلَآءِ	وہی (لوگ ہو)	تَقْتُلُوْنَ	تم قتل کرتے ہو
اَنْفُسَکُمْ	اپنوں کو	وَ تُخْرِجُوْنَ	اور تم نکالتے ہو	فَرِیْقًا	ایک گروہ کو
مِنْکُمْ	اپنوں میں سے	مِنْ دِیَارِھِمْ	ان کے گھروں سے		
تَظَاھَرُوْنَ	تم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو				

’’تظاھرون علیھم ‘‘ سے مخالفین کی مدد کرنا‘ مراد ہے، اور قرآن میں مختلف مواقع پر یہ لفظ

اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (دیکھئے: الفرقان: ۵۵، التحریم: ۴)

عَلَيۡهِمۡ	ان کے خلاف	بِالۡاِثۡمِ	گناہ کے ساتھ	وَالۡعُدۡوَانِ	اور زیادتی کے ساتھ
وَاِنۡ	اور اگر	يَّاۡتُوۡكُمۡ	وہ آئیں تمہارے پاس	اُسٰرٰى	قیدی بن کر
تُفٰدُوۡهُمۡ	تم انہیں فدیہ دیکر (چھڑاتے ہو	وَهُوَ مُحَرَّمٌ	حالانکہ حرام کیا گیا		
عَلَيۡكُمۡ	تم پر	اِخۡرَاجُهُمۡ	ان کا نکالنا	اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ	تو کیا تم ایمان لاتے ہو
بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ	کتاب کے کچھ حصے پر	وَتَكۡفُرُوۡنَ	اور تم انکار کرتے ہو		
بِبَعۡضٍ	بعض کا	فَمَا جَزَآءُ	پس نہیں بدلہ	مَنۡ يَّفۡعَلُ	جو وہ کرے
ذٰلِكَ	یہ	مِنۡكُمۡ	تم میں سے	اِلَّا خِزۡىٌ	سوائے رسوائی (کے)
فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا	دنیا کی زندگی میں	وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ	اور قیامت کے دن		
يُرَدُّوۡنَ	وہ لوٹائے جائیں گے	اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ	سخت عذاب کی طرف		
وَمَا اللّٰهُ	اور نہیں اللہ	بِغَافِلٍ	بے خبر	عَمَّا	اس سے
تَعۡمَلُوۡنَ (85)	جو تم عمل کرتے ہو۔				

مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے بیشتر مشرکین مدینہ کے دو مشہور قبائل اوس اور خزرج مدینہ میں آباد تھے اور یہ آپس میں ہمیشہ لڑتے رہتے تھے اور یہود مدینہ کے دو قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر ان عرب قبائل کے حلیف بن کر ان کو باہم لڑاتے رہنے کا کردار ادا کیا کرتے تھے۔ بنو قریظہ تو قبیلہ اوس کے حلیف تھے اور بنو نضیر قبیلہ خزرج کے۔ یہود گو تعداد میں کم تھے مگر یہ مالدار قوم تھی اور اوس وخزرج کو لڑا کر اپنا سیاسی تفوق بھی برقرار رکھتے تھے اور اسلحہ بھی بیچتے تھے۔ جس کے یہ تاجر تھے۔ ان یہود کی بالکل وہی مثال سمجھئے جو آج سے کچھ مدت پیشتر روس اور امریکہ کی تھی۔ اور آج کل امریکہ اور اسرائیل کی ہے یہ دونوں طاقتیں اسلام کی دشمن تھیں اور آپس میں بھی ان میں اختلاف تھا لیکن اسلام دشمنی میں دونوں متحد ہو کر مسلمان ممالک کو آپس میں لڑاتی رہتی تھیں۔ بنو قریظہ اوس کے اور بنو نضیر خزرج کے حلیف تھے، اس طرح یہود کئی طرح کے فوائد اٹھاتے تھے۔ ان کا اسلحہ بھی

فروخت ہوتا تھا اور سیاسی تفوق بھی برقرار رہتا تھا۔ جب جنگ ہوتی تو یہ دونوں یہودی قبائل بھی اپنے حلیفوں کے ساتھ برسرپیکار ہوتے اور اپنے ہی ہم مذہب دوسرے قبیلہ کو قتل بھی کرتے اور شہر سے نکال بھی دیتے؛ لیکن جب ان میں سے کوئی قید ہو کر آتا تو فدیہ ادا کر کے اس کو رہا کرا لیتے اور کہتے کہ مذہب کی رو سے اپنے یہودی بھائی کو رہا کرانا ہماری ذمہ داری ہے۔

یہود سے چار عہد ان کا اس کے برعکس طرزِ عمل

قرآن مجید نے اس رویہ پر تنقید کی ہے کہ ان کو تین باتوں کا حکم دیا گیا تھا: آپس میں خونریزی نہ کرنے کا، اپنے ہی بھائیوں کو گھر سے باہر نہ نکالنے کا، اور کوئی قید ہو جائے تو اس کا فدیہ ادا کرنے کا، تو دو احکام کو تم نے نظر انداز کر دیا اور پس پشت ڈال دیا، صرف ایک حکم کو یاد رکھا؛ گویا اللہ کے جس حکم پر جی چاہا عمل کر لیا اور جس کو چاہا، چھوڑ دیا، یہودیوں کا یہ طرزِ عمل کچھ ان ہی احکام کے ساتھ نہ تھا؛ بلکہ ان کا مزاج ہی یہ بن چکا تھا کہ تورات کے جس حکم کو چاہتے لے لیتے اور جس کو چاہتے چھوڑ دیتے، پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہ لانا بھی اس کی ایک مثال ہے: حالاں کہ آپ ﷺ کے نبی ہونے کے بارے میں واضح پیشین گوئیاں تورات میں موجود ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود سے چار عہد لیے تھے (1) وہ ایک دوسرے کا خون نہ کریں گے (2) ایک دوسرے کو جلاوطن نہ کریں گے (3) ظلم اور زیادتی پر مدد نہ کریں گے (4) اور فدیہ دے کر قیدیوں کو چھڑایا کریں گے۔ اب قبیلہ اوس وخزرج کی جنگ میں بنو قریظہ اور بنو نضیر بھی آپس میں حلیف ہونے کی حیثیت سے لڑتے اور ایک دوسرے کے گلے کاٹتے تھے۔ اب ایک جنگ میں مثلاً اوس اور بنو قریظہ کو فتح ہوئی تو لازماً بنو نضیر کے قیدی بھی ان کے ہاتھ آتے تھے اور بنو نضیر ان کا فدیہ ادا کر کے انہیں چھڑا لیتے تھے۔ جب ان سے اس کی وجہ پوچھی جاتی تو کہتے کہ قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانا اللہ کا حکم ہے اور جب ان سے پوچھا جاتا کہ ان سے جو جنگ کرتے ہو تو وہ اللہ کے کس حکم کے تحت کرتے ہو؟ تو کہتے کیا کریں اپنے دوستوں (حلیفوں) کو ذلیل نہیں کر سکتے۔ گویا تین کام تو اللہ کے حکم کے خلاف کرتے تھے اور ایک کام اللہ کے حکم کے مطابق جس کا سبب بھی وہ خود ہی

بنتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انکی ایسی حرکات پر گرفت کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا تم اللہ کی کتاب کے کچھ حصے پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصے کا انکار کر دیتے ہو؟ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص بعض احکام شرعیہ کی تعمیل کرے اور جو حکم اس کی طبیعت یا عادت یا مرضی کے خلاف ہو اس کو چھوڑ دے تو بعض احکام کی تعمیل اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتی اور ایسا انکار دراصل پوری کتاب اللہ کا انکار ہوتا ہے۔ ایسے لوگ حقیقتاً اپنے نفس کے پیروکار ہوتے ہیں۔ کتاب اللہ کے نہیں ہوتے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ شریعت کے تمام احکام پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور تمام ضروری احکام پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ کوئی شخص کسی وقت بھی شریعت کی پابندی سے آزاد نہیں ہو سکتا اور خود کو طریقت کا نام لے کر یا کسی بھی طریقے سے شریعت سے آزاد کہنے والے کافر ہیں۔

دنیا میں ہی یہود کا عبرتناک انجام

دنیا میں یہ یہود عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے۔ بنونضیر تو 4ھ میں اس ذلت سے دوچار ہوئے جس کا تفصیلی ذکر سورہ حشر میں کیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کے بعض باغات کو نذر آتش کر دیا۔ اور وہ قلعہ بند ہو کر اپنے گھروں کو خود بھی برباد اور توڑ پھوڑ رہے تھے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ اب جلاوطنی ان کا مقدر بن چکی ہے اور وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمان ان کے تعمیر شدہ مکانات سے فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح لڑائی کے بغیر ہی انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ انہیں فوری جلاوطنی کا حکم دیا گیا تو انہوں نے شام کا رخ کیا اور جزیہ کا حکم نازل ہونے کے بعد ان سے جزیہ وصول کیا جاتا رہا اور بنو قریظہ پر جنگ خندق (احزاب 5ھ) کے فوراً بعد چڑھائی کی گئی اور ان کے مردوں کو تہ تیغ کر دیا گیا اور عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنا لیا گیا، اور آخرت کو جو عذاب انہیں ہوگا وہ تو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ بنی اسرائیل کی دنیا میں تو یہ رسوائی ہوئی کہ بنی قُرَیظَہ 3 ہجری میں مارے گئے اور بنی نَضِیر اس سے پہلے ہی جلاوطن کر دیئے گئے۔ دنیا میں یہودیوں کی جو رسوائی ہر عہد میں ہوتی رہی ہے اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ شہر بدر کئے جاتے رہے ہیں، جن لوگوں نے تاریخ پڑھی ہے، وہ اس سے ناواقف نہیں ہیں، آج بھی مغربی ممالک

میں اکثر لوگ یہودیوں سے سخت نفرت کرتے ہیں، یہ بھی رسوائی ہی کی ایک صورت ہے۔ دنیا و آخرت کی رسوائی سے مراد انسان کا اللہ کی نافرمانی اور بداخلاقی کی وجہ سے دونوں جہانوں میں ذلیل اور نامراد ہونا ہے۔ اس میں دنیا کی بدنامی اور ناکامی کے ساتھ ساتھ آخرت کا عذاب شامل ہے اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی طرفداری میں دین کی مخالفت کرنا اخروی عذاب کے علاوہ دنیا میں بھی ذلت و رسوائی کا باعث ہوتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے معاملات کو اِس آیت کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ کبھی گناہوں کی شامت سے دنیاوی آفات بھی آجاتی ہیں۔

یہودیوں کے جزوی ایمان کا نقشہ اور مسلمانوں کی موجودہ حالت

یہودیوں کے جزوی ایمان کا جو نقشہ قرآن پاک نے ان آیات میں کھینچا ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو آجکل مسلمانوں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں۔ آج مسلمانوں کی حالت بھی یہی ہے کہ قرآن پاک کے کسی حصہ پر ایمان لاتے ہیں۔ اور بعض احکام کو نہیں مانتے۔ اسی لیے تو دنیا میں رسوا ہو رہے ہیں۔ غلامی سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے۔ جس کی وجہ سے تہذیب مٹ جاتی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ مسلمانوں نے بھی یہودیوں کا طریقہ اختیار کر لیا ہے جو حکم ان کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور جو ان کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ معاملہ نکاح و طلاق کا ہو یا سیاسی نوعیت کا ہو۔ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے قانون کی پروا نہیں کرتے۔ عدل، احسان اور تقویٰ کو فراموش کر دیا ہے۔ محض نفسانی خواہشات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کا حشر بھی یہودیوں سے مختلف نہیں ہے۔ جب انگریز نے ہندوستان میں تسلط قائم کیا تو انہوں نے مسلمانوں سے بھی پوچھا تھا کہ تم اپنے معاملات میں شرعی قوانین کا اطلاق چاہو گے۔ یا مقامی رواج کے مطابق اپنے مسائل کا حل چاہتے ہو۔ کتنے ہی مسلمان ہیں جنہوں نے لکھ کر دے دیا تھا کہ ہمیں شریعت وراثت منظور نہیں ہے۔ ہمارا فیصلہ رواج کے مطابق کیا جائے۔ حالت آج بھی یہی ہے۔ دعویٰ یہی ہے کہ ہم قرآن و حدیث کو برحق مانتے ہیں۔ مگر ان کے احکام پر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ عبادات تو تھوڑی بہت کر لیتے ہیں مگر

تعزیرات کے قانون پر کیوں عمل نہیں کرتے۔ جہاد جیسی اہم چیز کو نہیں اپناتے۔ جس کے لئے قرآن وحدیث کے اوراق بھرے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں یہودی اور مسلمان برابر ہیں نہ ان کا اپنی شریعت پر عمل ہے۔ اور نہ مسلمانوں کو احکام کا پاس ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی دورخی کا نتیجہ سوائے تباہی وبربادی کے اور کیا ہوگا۔

وَمَا اللہُ بِغَافِلٍ: اور اللہ غافل نہیں، اس طرح کی آیات جن میں یہ مفہوم ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ان میں نافرمانوں کے لئے شدید وعید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے افعال سے بے خبر نہیں ہے، تمہاری نافرمانیوں پر شدید عذاب دے گا۔ یونہی ایسی آیات میں مؤمنین وصالحین کے لئے خوشخبری ہوتی ہے کہ انہیں اعمال حسنہ کی بہترین جزاء ملے گی۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے: فرمایا "وَمَا اللہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ" جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے۔ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔ وہ تمہارے دلوں میں مخفی ارادوں تک سے واقف ہے۔ اس لیے وہ اسی کے مطابق جزا دے گا۔ جب خدا تعالیٰ کی گرفت آئے گی تو سخت عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ (تفسیر کبیر، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۸۵، ۱ / ۵۹۴، روح البیان، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۸۵، ۱ / ۱۷۵-۱۷۶، ملتقطاً)

بہتر انجام اور دنیا وآخرت کی رسوائی سے بچنے کی دعا

اُولٰٓئِكَ	یہی لوگ ہیں	الَّذِيۡنَ	جنہوں نے	اشۡتَرَوُا	خرید لی
الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا	زندگی دنیا کی	بِالۡاٰخِرَةِ	آخرت کے بدلے		
فَلَا يُخَفَّفُ	پس نہ ہلکا کیا جائے گا	عَنۡهُمُ	ان سے		
الۡعَذَابُ	عذاب	وَلَا هُمۡ	اور نہ وہ	يُنۡصَرُوۡنَ	مدد کیے جائیں گے (86)

یہ شریعت کے کسی حکم کے مان لینے اور کسی کو نظر انداز کر دینے کی سزا بیان کی جارہی ہے۔ اس کی سزا دنیا میں عزت وسرفرازی کی جگہ (جو مکمل شریعت پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے) ذلت ورسوائی اور آخرت میں ابدی نعمتوں کے بجائے سخت عذاب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں وہ

اطاعت مقبول ہے جو مکمل ہو، بعض بعض باتوں کا مان لینا، یا ان پر عمل کر لینا اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ آیت ہم مسلمانوں کو بھی دعوت غوروفکر دے رہی ہے کہ کہیں مسلمانوں کی ذلت ورسوائی کی وجہ بھی مسلمانوں کا وہی کردار تو نہیں جو مذکورہ آیات میں یہودیوں کا بیان کیا گیا ہے؟ یعنی اس آیت میں فرمایا گیا اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی ان کرتوتوں کی وجہ سے آخرت کی دائمی زندگی کے بدلے دنیا کی عارضی اور حقیر زندگی کو خرید لیا ہے ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ جب وہ عذاب میں جکڑے جائیں گے" فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ " تو ان کے عذاب میں تخفیف بھی نہیں ہوگی" وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ " اور نہ ہی کسی طرف سے انہیں امداد پہنچ سکے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک راہوں پر چلائے اور یہود کی اختیار کردہ راہوں سے بچائے۔ بہتر انجام اور دنیا و آخرت کی رسوائی سے بچنے کے لیے یہ پڑھے: اَللّٰهُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْأُمُوْرِ كُلِّهَا وَأَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَةِ۔ اے اللہ! ہمارے سارے کاموں کا انجام بہتر کر اور دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب ہمیں بچا اور ہماری حفاظت فرما۔

بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہونے والے انبیاء/ یہود کا قول کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

انبیاورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ قرآن کریم میں

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	اٰتَيْنَا	ہم نے دی	مُوْسَى الْكِتٰبَ	موسیٰ کو کتاب
وَقَفَّيْنَا	اور ہم نے پے درپے بھیجے	مِنْۢ بَعْدِهٖ	اس کے بعد	بِالرُّسُلِ	(کئی) رسول

یعنی موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد آنے والے جن انبیاء و رسل کا نام قرآن مجید میں آیا ہے وہ ہارون، ذوالکفل، الیاس، الیسع، داؤد، سلیمان، عزیر، یونس، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں، حدیث میں یوشع بن نون علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر بھی آیا ہے۔ لقمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نبی ہونے میں اختلاف ہے۔ بہت سے رسولوں کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا گیا، قرآن پاک میں

حضرت زکریا (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا تذکرہ موجود ہے۔حدیث شریف میں تو ایسے سینکڑوں نبیوں کا ذکر آتا ہے۔جنہیں اسرائیلیوں نے قتل کیا۔کیونکہ وہ ان کی مرضی کے خلاف اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچاتے تھے۔جو بنی اسرائیل کے موافق نہیں تھے۔

کھلی نشانیاں	الْبَيِّنٰتِ	عیسیٰ بن مریم کو	عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ	اور ہم نے دیں	وَاٰتَيْنَا

عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ عیسیٰ بن مریم کو عیسیٰ عبرانی زبان کا لفظ ہے،عیسیٰ ،یسوع یا ایسوع کا معنی مبارک ہے۔حضرت عیسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی والدہ کا نام مریم تھا۔آپ کی نانی نے نذر مانی تھی۔کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے بیٹا عطا کریگا۔تو وہ اسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کردیگی۔مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کہ اس نے بیٹے کی بجائے بیٹی عطا کی۔آپ کو پریشانی لاحق ہوئی۔مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں بیٹی عطا کی ہے۔ہم نے اسے بہت برگزیدہ اور پاکیزہ بنایا ہے۔بیٹا اس کی برابری نہیں کرسکتا۔

حضرت مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام کی فضیلت

حضرت مریم کی فضیلت اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں بیان فرمائی ہے۔"يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" یعنی اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا۔اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھے برتری عطا کی۔اس آیت میں حضرت مریم رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہا کی شان کا بیان ہے۔اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سے فضائل کیلئے منتخب فرمالیا مثلاً: عورت ہونے کے باوجود بیتُ المقدس کی خدمت کے لیے انہیں نذر میں قبول فرمالیا حالانکہ صرف مردوں کو ہی منتخب کیا جاتا تھا۔لہٰذا یہ بات ان کے سوا کسی عورت کو مُیَسَّر نہ ہوئی۔آپ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہا کیلئے جنتی رزق بھیجا گیا،حضرت زکریا عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَام کو ان کا کفیل بنایا گیا،نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں یہ فضیلتیں فرشتوں کی زبان سے سنائی گئیں۔مزید حضرت مریم رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہا کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے اور مردوں کے ان پر قدرت پانے سے پاکیزہ بنایا اور انہیں سارے جہان کی عورتوں پر فضیلت عطا فرمائی کہ بغیر باپ کے بیٹا دیا اور ملائکہ کا کلام

سنوایا۔عفت و پارسائی: آپ کی پوری زندگی پاک دامنی تقویٰ اور عبادت میں گزری۔آپ کو اللہ کی طرف سے" صدیقہ" (سچی) کا بلند ترین درجہ عطا ہوا۔بے مثال معجزہ: بغیر کسی مرد کے چھوئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بننا اور گہوارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آپ کی پارسائی کی گواہی دینا آپ کے عظیم معجزات میں شامل ہے۔حضرت مریم علیہا الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام جہان کی عورتوں پر برتری اور فضیلت بخشی۔آپ وہ واحد خاتون ہیں جن کا نام قرآنِ مجید میں بار بار آیا ہے اور آپ کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے ایک مکمل سورت (سورۃ مریم) نازل فرمائی گئی ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن پاک میں جہاں بھی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر ہوگا۔عموماً عیسیٰ ابن مریم کا نام ہوگا۔آگے سورہ مائدہ میں آئے گا کہ آپ کے حواری بھی آپ کو عیسیٰ ابن مریم کے نام سے جانتے تھے۔اور اسی نام سے خطاب کرتے تھے۔وہ ابن اللہ کے نام سے یاد نہیں کرتے۔نہ وہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خود خدا تصور کرتے تھے، بلکہ یہ غلط عقیدہ تو بعد میں ایک عیسائی پادری پولس کا پیدا کردہ ہے۔کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) خود خدا، خدا کے بیٹے یا تینوں میں سے تیسرے ہیں۔یہ بالکل کفریہ عقیدہ ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات

فرمایا اَلْبَيِّنٰتِ کھلی نشانیاں 'نشانیوں' سے وہ کھلے ہوئے معجزات مراد ہیں جو حضرت مسیح کو دیئے گئے تھے۔مثلاً حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔کوڑھی اور اندھے کو فقط ہاتھ لگا کر تندرست کر دیتے تھے۔مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں پھونک مارتے تو وہ اڑنے لگتا تھا اور آپ لوگوں کو یہ بھی بتا دیتے تھے کہ وہ کیا کچھ کھا کر آئے ہیں اور کیا کچھ گھر میں چھوڑ کر آئے ہیں اور ان تمام کاموں میں روح القدس یعنی جبریل (علیہ السلام) کی تائید آپ کے شامل حال رہتی تھی۔

وَاَيَّدْنٰهُ	اور ہم نے اس کی مدد کی	بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط	روح القدس کے ذریعے

(بِرُوْحِ الْقُدُسِ) اس سے مراد جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ایک اور آیت میں حضرت

جبریل (علیہ السلام) کو »الرُّوحُ الأَمِينُ« فرمایا گیا ہے اور آنحضرت (ﷺ) نے حضرت حسان! کے متعلق فرمایا: »اللّٰهُمَّ! أَيِّدْهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ«۔ "اے اللہ روح القدس سے اس کی تائید فرما۔" ایک دوسری حدیث میں ہے »وَجِبْرِيلُ مَعَكَ«۔ "جبریل (علیہ السلام) تمہارے ساتھ ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے (2۔تفسیر ابن کثیر ج 1 ص 112، معالم التنزیل ج 1 ص 38) کہ روح القدس سے مراد اسم اعظم ہے یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے انسان کی دعا قبول ہو جاتی ہے اور اسی اسم اعظم کی برکت سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر معجزے کا اظہار ہوتا تھا۔ جب آپ مردے کو زندہ کرتے تھے۔ یا مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتے تھے تو یہ اسم اعظم کی برکت سے ہوتا تھا۔" اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ روح القدس سے مراد حضرت جبریل (علیہ السلام) ہی ہیں، یوں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر نبی کے لئے تائید وتقویت کا باعث تھے؛ کیوں کہ آپ ہی وحی الٰہی لے کر آیا کرتے تھے؛ لیکن اللہ کی طرف سے حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ روح القدس کی تائید کا خصوصی معاملہ رہا، جب حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے تو ''مس شیطانی'' (شیطان کے چھونے) سے حفاظت کی، جو ہر پیدا ہونے والے کو پیش آتا ہے اور آپ علیہ السلام کی خصوصیت ہے کہ آپ علیہ السلام کو اس سے محفوظ رکھا گیا، حضرت مریم علیہا السلام کو دم کیا تو حمل ٹھہرا اور اس سے حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے اور جب یہودی آپ علیہ السلام کے قتل کے درپے ہوئے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کو اُٹھا کر آسمان پر لے گئے، روح القدس سے تائید کا عیسائیوں کے اِس عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں کہ خدا تین اکائیوں کے مجموعہ کے نام ہے، جن میں ایک رُوح القدس ہیں۔ (العیاذ باللہ)

احکامِ الٰہی پر اپنی خواہشات کو ترجیح دینے والے

اَفَكُلَّمَا	کیا پھر جب	جَآءَكُمْ	آیا تمہارے پاس	رَسُوْلٌۢ	کوئی رسول		
بِمَا	اس کے ساتھ جو	لَا تَهْوٰٓى	نہیں چاہتے تھے				
اَنْفُسُكُمُ	تمہارے نفس	اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ	تم نے تکبر کیا				

بِمَا لَا تَهْوٰٓى آپ تمہارے دل پسند نہیں کرتے۔ یہودی لوگ پیغمبروں کے احکام اپنی خواہشوں کے خلاف پا کر انہیں جھٹلاتے اور موقع پاتے تو ان انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو قتل کرڈالتے تھے جیسا کہ انہوں نے حضرت زکریا علیہ الصلوٰۃ والسلام، حضرت یحیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے علاوہ بہت سے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو شہید کیا، حتّٰی کہ ہمارے آقا صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے بھی درپے رہے، کبھی آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ پر جادو کیا، کبھی زہر دیا اور ان کے علاوہ آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو شہید کرنے کیلئے طرح طرح کے فریب کرتے رہے۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ احکامِ الٰہی پر اپنی خواہشات کو ترجیح دینا یہودیوں جبکہ حکمِ الٰہی کے سامنے اپنے نفس کو کچل دینا کامل الایمان لوگوں کی نشانی ہے۔ اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ''تکبر'' تمام گناہوں، نافرمانیوں اور اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ گستاخیوں اور زیادتیوں کی جڑ ہے؛ اس لئے اس برائی سے اپنی خوب حفاظت کرنی چاہئے۔

یہود کا پیغمبروں کے ساتھ عام طرزِ عمل

فَفَرِيْقًا	ایک گروہ کو	كَذَّبْتُمْ	تم نے جھٹلایا
وَفَرِيْقًا	اور ایک گروہ کو	تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾	تم قتل کرتے ہو۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے تذکرے کے بعد بنی اسرائیل کے اپنے پیغمبروں کے ساتھ عام طرزِ عمل کا ذکر کیا۔ کہ اے بنی اسرائیل! "اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ "جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول ایسی چیز لے کر آئے جسے تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے" اسْتَكْبَرْتُمْ " تو تم نے تکبر کیا۔ تکبر کی بیماری اسرائیلیوں میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ احکام کی نافرمانی تکبر اور سرکشی کی وجہ سے ہی ہوتی ہے۔ فرمایا اے بنی اسرائیل! تم نے اسی تکبر کی وجہ سے" فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ " انبیاء (علیہم السلام) کے ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا"۔

انبیا و رسل علیہم الصلوٰۃ و السلام کو شہید کرنے والا گروہ

وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ "اور ایک گروہ کو قتل کیا۔ جیسے ان لوگوں نے سیدنا عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی جھٹلایا اور رسول اللہ ﷺ کو بھی اور سیدنا زکریا اور سیدنا یحییٰ (علیہما السلام) کو قتل کر دیا۔ سیدنا عیسیٰ (علیہ السلام) کو مروا ڈالنے کے در پے ہو چکے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مہربانی سے انہیں اوپر اپنے ہاں اٹھا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک لوگ نفسانی خواہشات کی اتباع اور خدائی قانون کی خلاف ورزی کرتے رہیں گے انہیں فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ الغرض! اسرائیلیوں میں یہ دو بیماریاں یعنی اتباع خواہشات اور تکبر پائی جاتی تھیں۔ جن کی وجہ سے انہوں نے بعض نبیوں کو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر دیا۔ یہ دراصل بنی اسرائیل (یہودیوں) کی ہٹ دھرمی، سرکشی اور نافرمانی کی طرف اشارہ ہے۔ جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی سچا نبی ان کی اصلاح کے لیے آتا اور ایسے احکامات سناتا جو ان کی ذاتی خواہشات یا خود ساختہ نظریات کے خلاف ہوتے، تو وہ حق کو تسلیم کرنے کے بجائے الٹا تکبر کرتے۔ بات صرف یہیں تک نہیں رہتی تھی، بلکہ ان انبیاء علیہم السلام کو جھوٹا قرار دیتے اور بعض کو شہید (قتل) بھی کر دیتے تھے۔

دین سے دوری کا بہانہ، قرآنی جواب اور حقیقت

وَقَالُوْا	اور انہوں نے کہا	قُلُوْبُنَا	ہمارے دل	غُلْفٌ ؕ	غلافوں میں ہیں
بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ	بلکہ لعنت کر دی ہے اُن پر اللہ نے	بِكُفْرِهِمْ	بوجہ ان کے کفر کے		
فَقَلِيْلًا	پس تھوڑے ہیں	مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾	جو ایمان لاتے ہیں۔		

غُلْفٌ یہ "أَغْلَفُ" کی جمع ہے، جیسے "اَحْمَرُ" کی جمع "حُمْرٌ" ہے، یعنی جو چیز غلاف (پردے) میں ہو، جیسے: "رَجُلٌ اَغْلَفُ" "وہ آدمی جس کا ختنہ نہ ہوا ہو" اور "سَيْفٌ اَغْلَفُ" وہ تلوار جو غلاف میں ہو۔ یہود کہا کرتے تھے کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں، ان پر تمہاری باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا، فرمایا: (وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْۤ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ) [حٰم السجدۃ: 5] "اور انھوں نے کہا ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔" بعض

علمائے تفسیر نے "غُلْفٌ" کے یہ معنی کیے ہیں کہ ہمارے دل علم وحکمت سے پر ہیں، کسی دوسرے علم کی ان میں گنجائش نہیں ہے۔ اس پر قرآن نے فرمایا کہ حق سے متاثر نہ ہونا فخر کی بات نہیں ہے، یہ تو اللہ کی لعنت کی نشانی ہے۔ (ابن کثیر) انسان کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی بری صفات کو بھی خوبصورت بنا کر دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور حقیقت کا اعتراف کر لینا اس کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ الا ماشاء اللہ یہی حالت یہودیوں کی تھی۔ یہودیوں کو غلط زعم یہ تھا کہ وہ صاحب علم ہیں۔ ان پر کسی بیرونی تبلیغ کا اثر نہیں ہوسکتا۔ قرآن پاک کے الفاظ میں ان کا دعویٰ تھا"

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ "کہ ہمارے دل غلافوں میں بند ہیں۔ یہ ان کی خودستائشی تھی کہ صاحب کتاب ہونے کی وجہ سے وہ ہر قسم کے اثرات سے محفوظ ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے دین پر پختہ ہیں۔ اس میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں کرسکتا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی بات ہمارے دلوں میں اترتی نہیں ہے کیونکہ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں (ہمیں سمجھ نہیں آتی)، بعض مفسرین کے مطابق اس سے ان کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہمارے دل پہلے ہی الہامی علوم اور شریعت کے غلافوں سے بھرے ہوئے ہیں، اس لیے ہمیں آپ کی نئی تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں، مقصد یہ کہ جس طرح غلاف میں بند کوئی چیز بیرونی اثرات اور تغیر وتبدل سے محفوظ ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے دل بھی غلاف میں بند ہیں۔ اور ان کے اختیار کردہ دین میں کسی قسم کا بگاڑ پیدا نہیں کیا جاسکتا ان کا یہ نظریہ واقعی بلند پایہ تھا۔ بشرطیکہ ان کے پاس صحیح علم ہوتا، ان کے عقائد درست ہوتے اور وہ اپنے صحیح دین کو محفوظ کرسکتے۔ مگر حقیقت اس کے برخلاف تھی وہ تو خود اپنا دین بگاڑ چکے تھے۔ غلط عقائد اختیار کر چکے تھے اور پھر ان پر اصرار کرتے تھے۔ جب بھی ان کے پاس حق بات لے کر انبیاء (علیہم السلام) آتے۔ وہ انہیں جھٹلا دیتے یا قتل کر دیتے۔ وہ دین اسلام کو برحق سمجھ لینے کے باوجود اسے قبول تو اس لیے نہیں کرتے تھے کہ اس طرح ان کا مذہبی تفوق واقتدار خطرہ میں پڑ جاتا تھا بلکہ چھن جاتا تھا مگر بظاہر اسے یوں پیش کرتے تھے کہ ہمارے عقائد اتنے مضبوط ہیں کہ وہ کوئی نیا عقیدہ قبول نہیں کرسکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دجل وفریب کی قلعی کھولتے ہوئے فرمایا: بات یوں نہیں بلکہ یہ اپنے کفر اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ملعون بن چکے ہیں اور یہ اس لعنت کا اثر ہے کہ ان

کے دل حق بات کو قبول نہیں کرتے۔حقیقت یہ ہے"بَل لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفۡرِهِمۡ" یعنی ان کے دلوں پر پردے نہیں ہیں بلکہ ان کے کفر اور نافرمانی کی وجہ سے اللہ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔چونکہ ان کے اعمال درست نہ تھے،اس لیے ان کی حق قبول کرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی"ان کے کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی ہے۔اور انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ان کے قلب معکوس ہو چکے ہیں۔اور فہم الٹ گئے ہیں۔یہ حق بات کو سمجھ نہیں سکتے۔یہی وجہ ہے "فَقَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ" ان کی بہت قلیل تعداد ایمان لائی ہے۔سورہ مائدہ میں اسی چیز کو فرمایا" وَاَنَّ اَكۡثَرَكُمۡ فٰسِقُوۡنَ " یعنی تم میں سے اکثر فاسق ہی ہیں۔اگرچہ سارے کے سارے نافرمان نہیں تھے۔پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔قرآنِ مجید کی سورہ آل عمران (آیت 113) کی یہ خوبصورت اور معنی خیز قرآنی عبارت لَيۡسُوۡا سَوَآءً ہے اس کا مطلب ہے:"یہ سب برابر نہیں ہیں یعنی "لَيۡسُوۡا سَوَآءً" مگر اکثریت ملعون ہی تھی۔ایمان کی دولت چند لوگوں کے پاس ہی ہوتی تھی۔جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے عقیدت مندوں کی جماعت،یعنی کہ تمام اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) ایک جیسے نہیں تھے۔ان میں سے کچھ لوگ حق پر قائم تھے،جو رات کی تنہائیوں میں اللہ کی آیات پڑھتے تھے اور سجدے کرتے تھے۔اور بعض علماء فَقَلِيۡلًا مَّا يُؤۡمِنُوۡنَ کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی کتاب تورات میں سے بھی بہت تھوڑی باتوں پر ایمان لاتے ہیں اور اکثر احکام کا انکار کر دیتے ہیں۔

یہود اور نزول قرآن/نظریہ توسل کی حقیقت

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَلَمَّا جَآءَھُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ
يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚۖ فَلَمَّا جَآءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ
مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَھُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ
بِمَا وَرَآءَهٗ ۤ وَھُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَھُمْ ۭ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ
وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

مصدق کتاب سے مراد قرآن پاک ہے

وَلَمَّا	اور جب	جَآءَھُمْ	ان کے پاس آئی	كِتٰبٌ	کتاب
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ	اللہ کے پاس سے	مُصَدِّقٌ	تصدیق کرنے والی	لِّمَا	اس کی جو
مَعَھُمْ	ان کے پاس ہے	وَكَانُوْا	اور وہ تھے	مِنْ قَبْلُ	اس سے پہلے

یَسۡتَفۡتِحُوۡنَ	فتح مانگتے		عَلَی الَّذِیۡنَ		ان پر جنہوں نے
کَفَرُوۡا	کفر کیا		فَلَمَّا		تو جب جَآءَھُمۡ آگیا انکے پاس
مَّا عَرَفُوۡا	جو وہ پہچانتے تھے	کَفَرُوۡا	انہوں نے انکار کردیا	بِہٖ	اس کا
فَلَعۡنَۃُ اللہِ	پس اللہ کی لعنت ہے		عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۸۹﴾		کافروں پر۔

اس آیت میں اس بات کا بیان ہے کہ جب قرآن پاک کا نزول ہوا تو اس کے ساتھ۔ لوگوں نے کیا رویہ اختیار کیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔ " وَلَمَّا جَآءَھُمۡ کِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللہِ" جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس وہ کتاب آگئی۔ " مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمۡ جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ جو ان کے پاس موجود ہیں۔ مصدق کتاب سے مراد قرآن پاک ہے۔ اور سابقہ کتب میں زبور، توراۃ، انجیل اور دیگر صحائف سماویہ ہیں۔ یعنی جب قرآن پاک نازل ہوا" کَفَرُوۡا بِہٖ " تو بنی اسرائیل نے اس کا بھی انکار کردیا۔ حالانکہ قرآن پاک ان کے پاس موجود سابقہ کتابوں کی تصدیق کررہا ہے۔ یَسۡتَفۡتِحُوۡنَ فتح ونصرت طلب کرتے تھے، یعنی نبی ﷺ کی بعثت سے پہلے جب یہودی عرب کے مشرکین سے مغلوب ہوتے تو وہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! نبی آخر الزمان جلد ظاہر ہوں، تاکہ ہم ان کے ساتھ مل کر ان کافروں پر غلبہ حاصل کریں۔ (طبری) "یَسۡتَفۡتِحُوۡنَ" کا دوسرا معنی ہے: "یَفۡتَحُوۡنَ عَلَی الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا" (فَتَحَ عَلَیۡہِ) کا معنی ہے خبر دینا اور سین اور تاء مبالغہ کے لیے ہے، یعنی کافروں کو خوب کھول کر بتاتے تھے۔ (زمخشری)

نظریہ توسل کی حقیقت

نظریہ توسل ہمارے مذہب میں بھی روا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی مقرب بندے کی برکت سے یا اس کے طفیل سے کوئی دعا مانگی جائے اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ مانگنا تو اللہ تعالیٰ ہی سے ہے۔ صاحب وسیلہ اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ ہے اس نے ہمیں راہ راست کی تعلیم دی ہے ہمیں اس سے محبت ہے۔ لہٰذا اس کے طفیل یا اس کی برکت سے خدا تعالیٰ ہماری دعا قبول کرے ہاں شرک اس وقت ہوگا۔ جب اس کے توسل کی بجائے خود اسی سے مانگنے لگے یا اس کو

مشرکوں کی طرح مختارِ مطلق سمجھے۔کہ اسے دعا کے قبول کرنے یا کرانے کا اختیار حاصل ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعاء مانگتے وقت اس کے نیک اور برگزیدہ بندوں کا واسطہ دینا توسل کہلاتا ہے اور یہ تب جائز ہے جب اللہ سے ہی مانگا جائے۔ باقی کسی کے مزار پر جا کر اس سے مانگنا یا اس کے مزار کے گرد چکر لگانا اور سجدہ کرنا سراسر حرام اور شرک کے زمرے میں آتا ہے اس کا توسل سے کوئی تعلق نہیں ہے، مزید تفصیل درکار ہو تو اس کے لئے ہمارے بزرگوں میں سے حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ نے اختلاف امت اور صراط مستقیم کے نام سے کتاب لکھی ہے، اس میں دیگر اختلافی مسائل کے ساتھ ساتھ توسل کے مسئلے کو بھی مناسب و مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔۔ بہر حال جب تک پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت نہیں ہوئی تھی، یہودیوں کو مشرکین سے کوئی اذیت پہنچتی تو کہتے تھے کہ عنقریب آخری نبی کا ظہور ہونے والا ہے، ان کی تشریف آوری کے بعد ہم ان کی پیروی کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ ہمیں تم پر غلبہ عطا فرمائے گا، انصارِ مدینہ چوں کہ بار بار یہودیوں سے یہ سن چکے تھے؛ اسی لئے انھوں نے بلا تامل آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا اور مسلمان ہو گئے؛ (سیرت ابن ہشام: ۲/ ۱۸۳) لیکن جب آپ ﷺ کی نبوت ظاہر ہوئی تو یہود مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے؛ بلکہ مخالفت میں بھی پیش پیش رہے، اسی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

یہود کے پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہ لانے کی اصل وجہ

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا	برا ہے جو انہوں نے بیچ ڈالا	بِهٖٓ	اسکے بدلے		
اَنْفُسَهُمْ	اپنے آپ کو	اَنْ يَّكْفُرُوْا	یہ کہ انہوں نے انکار کیا		
بِمَآ	اس سے جو	اَنْزَلَ اللّٰهُ	نازل کیا اللہ نے		
بَغْيًا	ضد میں آکر	اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ	کہ نازل کرتا ہے اللہ		
مِنْ فَضْلِهٖ	اپنے فضل سے	عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ	جس پر وہ چاہتا ہے		
مِنْ عِبَادِهٖ	اپنے بندوں میں سے	فَبَآءُوْ	پس وہ لوٹے		
بِغَضَبٍ	غضب کے ساتھ	عَلٰى غَضَبٍ	غضب پر		

وَلِلْكٰفِرِیْنَ	کافروں کے لئے	عَذَابٌ	عذاب ہے
مُّهِیْنٌ ۝٩٠		رسوا کرنے والا۔(90)	

یہود کے پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہ لانے کی اصل وجہ نسلی وخاندانی تعصب تھا، یہ حضرت اسحاق بن ابراہیم کی نسل سے تھے اور حضرت اسحاق سے حضرت مسیح تک جتنے پیغمبر آئے سب اسی خاندان سے تھے، جب کہ عرب حضرت اسماعیل کی اولاد تھے، اس طرح نبوت کے سلسلۃ الذہب کا اختتام ایک ایسے نبی پر ہوا جو حضرت اسماعیل کی نسل سے تھا، اسی خاندانی تعصب اور تنگ نظری کے باعث یہود ایمان سے محروم رہے، قرآن اسی کی تردید کر رہا ہے کہ نبوت ایک فضل خداوندی ہے اور یہ اللہ کی مرضی ہے کہ وہ جسے چاہے اس فضل سے نواز دے۔ یہود کے جرائم کی فہرست تو بہت طویل ہے جن میں سرفہرست ایک نبی کی موجودگی میں بچھڑے کی پرستش، انبیاء کا قتل اور دیدہ دانستہ نبی آخر الزمان ﷺ کی رسالت کا انکار ہے اور ایسے جرائم کی سزا تو جتنی بھی ہو وہ کم ہے۔ ضمناً اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر عذاب ذلت کے لیے نہیں ہوتا بلکہ گنہگار مسلمانوں کو جو عذاب ہوگا وہ انہیں گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوگا۔ ذلیل ورسوا کرنے کے لیے نہ ہوگا۔ البتہ کافروں کو جو عذاب دیا جائے گا وہ بغرض تذلیل ہوگا۔

حسد کی تعریف اور اس کی مذمت

اس آیت سے معلوم ہوا کہ منصب ومرتبے کی طلب انسان کے دل میں حسد پیدا ہونے کا ایک سبب ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حسد ایسا خبیث مرض ہے جو انسان کو کفر تک بھی لے جاسکتا ہے۔ حسد کی تعریف یہ ہے کہ کسی مسلمان بھائی کو ملنے والی نعمت چھن جانے کی آرزو کی جائے، اور ایسی آرزو کی برائی محتاج بیان نہیں۔ حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''آدمی کے دل میں ایمان اور حسد جمع نہیں ہوتے۔ (سنن نسائی، کتاب الجہاد، فضل من عمل فی سبیل اللہ۔۔۔الخ، ص ۵۰۵، الحدیث: ۳۶۱۰) حضرت معاویہ بن حیدہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، حضور انور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ

وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ’’حسد ایمان کو اس طرح تباہ کر دیتا ہے جیسے صَبِر (یعنی ایک درخت کا انتہائی کڑوا نچوڑ) شہد کو تباہ کر دیتا ہے۔(جامع صغیر، حرف الحاء، ص ۲۳۲، الحدیث: ۳۸۱۹) صَبِر کا معنی ہے کڑوا، سخت، تلخ چیز، اور وسیع تر معنی میں روک دینا، ضبط کرنا، تکلیف میں قابو پانا۔ حدیث میں "صَبِر" سے مراد وہ کڑوا مادہ ہے جو شہد کو خراب کر دیتا ہے، یعنی حسد بھی ایمان کو اسی طرح برباد کرتا ہے جیسے صبر شہد کو۔ یاد رہے کہ حسد حرام ہے اور اس باطنی مرض کے بارے میں علم حاصل کرنا فرض ہے۔اس سے متعلق مزید تفصیل جاننے کے لئے امام غزالی رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ کی مشہور کتاب ’’احیاء العلوم‘‘ کی تیسری جلد میں موجود حسد سے متعلق بیان مطالعہ فرمائیں۔ [فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ: تو یہ لوگ غضب پر غضب کے مستحق ہو گئے۔] حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا فرماتے ہیں: یہودی تورات کو ضائع کرنے اور اس کے احکامات کو تبدیل کرنے کی وجہ سے پہلے غضب کے مستحق ہوئے اور حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے ساتھ کفر کرنے کی وجہ سے دوسرے غضب کے حقدار ٹھہرے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اور انجیل کا انکار کرنے کی وجہ سے یہودی پہلے غضب کے مستحق ہوئے اور نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اور قرآن مجید کا انکار کرکے دوسرے غضب کے مستحق ہو گئے۔(خازن، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۹۰، ۱/ ۶۹)

ایمان لانے میں بڑی رُکاوٹ نسلی و خاندانی تعصب

وَاِذَا	اور جب	قِیْلَ لَهُمْ	کہا جاتا ہے انہیں	اٰمِنُوْا	تم ایمان لاؤ
بِمَآ	اس پر جو	اَنْزَلَ اللّٰهُ	نازل کیا اللہ نے	قَالُوْا	وہ کہتے ہیں
نُؤْمِنُ	ہم ایمان لاتے ہیں	بِمَآ	اس پر	اُنْزِلَ	جو نازل کیا گیا
عَلَیْنَا	ہم پر	وَیَكْفُرُوْنَ	اور انکار کرتے ہیں	بِمَا	اس سے جو
وَرَآءَهٗ	اس کے علاوہ	وَهُوَ الْحَقُّ	حالانکہ وہی حق ہے		
مُصَدِّقًا	تصدیق کرنے والا	لِّمَا	اسکی جو	مَعَهُمْ	ان کے پاس ہے

قُلْ	کہہ دو	فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ	تو کیوں قتل کرتے رہے
اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ	اللہ کے نبیوں کو	مِنْ قَبْلُ	اس سے پہلے
اِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم	مُّؤْمِنِیْنَ﴿۹۱﴾	مومن۔(91)

یہود کہتے تھے کہ ہم نبوت و وحی کے منکر نہیں ہیں؛ لیکن ہم صرف ان ہی انبیاء پر ایمان لائیں گے، جو ہماری قوم یعنی بنی اسرائیل میں آئیں، یہاں اُن کی فکر کی کوتاہی کو واضح کیا گیا ہے کہ اول تو ایمان لانے میں نسلی و خاندانی تعصب نہ ہونا چاہئے، حق اور سچائی جہاں بھی ہو، اس کو قبول کرنا چاہئے، اور قرآن کے حق ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ تورات کی تصدیق و تائید کرتی ہے نہ کہ تکذیب و تردید، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں کتابیں ایک ہی سرچشمہ سے تعلق رکھتی ہیں، دوسرے: اگر تم اور تمہارے آباء واجداد انبیاء بنی اسرائیل پر ایمان رکھتے تھے تو پھر تم لوگ اِنہیں انبیاء ورسل میں بعض کے قتل تک کے مرتکب ہوئے، کیا انبیاء پر ایمان رکھنے والا ان کے قتل کا مرتکب ہوسکتا ہے؟

گستاخوں کو اچھا سمجھنے والا خود بھی گستاخ ہی ہے

(1)......اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام آسمانی کتابوں پر اور حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے فرمانوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان میں سے ایک کا بھی انکار کفر ہے، یونہی تمام انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام پر ایمان لانا ضروری ہے اور ان میں سے ایک کا بھی انکار کرنا کفر ہے۔

(2)......انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی تعظیم ایمان کا رکن اعلیٰ ہے اور ان کی توہین کرنا کفر ہے۔

(3)......اللہ تعالیٰ کے نبی عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو شہید کرنا کفر ہے۔

(4)......کفر سے راضی ہونا بھی کفر ہے کیونکہ حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے زمانے کے بنی اسرائیل نے انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو شہید نہ کیا تھا مگر چونکہ وہ قاتلوں کی اِس حرکت سے راضی تھے اور ان کو اپنا بڑا مانتے تھے اور انہیں عظمت سے یاد کرتے تھے اس لئے

انہیں بھی قاتلوں میں شامل کیا گیا۔آج کل بھی اگر کوئی بذاتِ خود گستاخی نہ بھی کرے لیکن گستاخوں کو اچھا سمجھے، انہیں اپنا بڑا مانے تو وہ انہیں میں شامل ہے اور وہ بھی گستاخ ہی ہے۔حضرت عُرس رضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا ''جب زمین میں گناہ کیا جائے تو جو وہاں موجود ہے مگر اسے برا جانتا ہے، وہ اس کی مثل ہے جو وہاں نہیں ہے اور جو وہاں نہیں ہے مگر اس پر راضی ہے، وہ اس کی مثل ہے جو وہاں حاضر ہے۔(ابو داؤد)

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	جَآءَکُمْ	آئے تمہارے پاس	مُّوْسٰی	موسیٰ
بِالْبَیِّنٰتِ	کھلی نشانیوں کے ساتھ	ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ		پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو (معبود)	
مِنْۢ بَعْدِہٖ	اس کے بعد	وَاَنْتُمْ	اور تم	ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾	ظالم ہو۔92

یہ واضح معجزات صرف عصائے موسیٰ اور ید بیضا ہی نہ تھے۔بلکہ بیشمار دوسرے معجزات بھی تھے جیسے سمندر کا پھٹ جانا، اور فرعون کی غرقابی۔چٹان سے بارہ چشموں کا پھوٹ نکلنا، جنگل میں من وسلویٰ کا نزول وغیرہ وغیرہ۔اتنے واضح معجزات دیکھنے کے بعد بھی تم اللہ کی الوہیت پر ایمان نہ لائے اور موسیٰ کی غیر حاضری میں تمہیں تھوڑا سا موقعہ ملا تو فوراً پھر سے بچھڑے کی پرستش شروع کردی۔اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوسکتا ہے؟ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام بنی اسرائیل کے پاس روشن معجزات لے کر تشریف لائے اور جب حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کوہِ طور پر تشریف لے گئے تو آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے بعد بنی اسرائیل نے سامری کے بہکانے سے گائے کو معبود بنالیا اور گائے کی پوجا کر کے انہوں نے کفر کیا۔جب حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی روشن نشانیاں دیکھ کر بنی اسرائیل بچھڑے کی پوجا میں مبتلاء ہو گئے تو ان یہودیوں کا سید المُرسَلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کے ساتھ کفر کرنا ان کے لئے کونسی بڑی بات ہے؟ (جلالین)۔

ایمانی قوت معلوم کرنے کا طریقہ/موت کی آرزو/ یہود کی جینے کی ہوس

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ
قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ
بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً
مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛۚ وَمِنَ
الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ
يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

کفر و انکار کی انتہا

وَاِذْ	اور جب	اَخَذْنَا	ہم نے لیا	مِيْثَاقَكُمْ	تم سے پختہ عہد
وَرَفَعْنَا	اور ہم نے بلند کیا	فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ	تمہارے اوپر کوہ طور (پہاڑ)		
خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ	پکڑو جو ہم نے تمہیں دیا ہے	بِقُوَّةٍ	مضبوطی سے		

وَاسْمَعُوْا	اور سنو	قَالُوْا سَمِعْنَا	وہ بولے ہم نے سن لیا
وَعَصَيْنَا	اور ہم نے نافرمانی کی	وَاُشْرِبُوْا	اور پلا دیئے گئے
فِيْ قُلُوْبِهِمُ	اپنے دلوں میں	الْعِجْلَ	بچھڑے (کی محبت)
بِكُفْرِهِمْ		ان کے کفر کے سبب	

یہ کفر وانکار کی انتہا ہے کہ زبان سے تو اقرار کہ سن لیا، یعنی اطاعت کریں گے اور دل میں یہ نیت کہ ہم نے کون سا عمل کرنا ہے؟ ایک تو محبت خود ایسی چیز ہوتی ہے، کہ انسان کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ دوسرے، اس کو اُشْرِبُوا (پلا دی گئی) سے تعبیر کیا گیا، کیوں کہ پانی انسان کے رگ وریشہ میں خوب دوڑتا ہے جب کہ کھانے کا گزر اس طرح نہیں ہوتا۔ (فتح القدیر) یعنی عصیان اور بچھڑے کی محبت وعبادت کی وجہ وہ کفر تھا جو ان کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔

قُلْ	کہہ دیں	بِئْسَمَا	کیا ہی برا ہے جو	يَاْمُرُكُمْ	تمہیں حکم دیتا ہے
بِهٖٓ	اس کا	اِيْمَانُكُمْ	ایمان تمہارا	اِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾			ایمان لانے والے۔		

گؤ سالہ پرستی کے جراثیم

یعنی جب تم سے تمہارے سروں پر طور پہاڑ کو جھکا کر تورات کے احکام پر عمل پیرا ہونے کا عہد لیا جا رہا تھا۔ جس کا پہلا اور بنیادی حکم یہی تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو گے اور نہ کسی کو اللہ کا شریک بناؤ گے تو تمہارے اسلاف نے کہا تھا کہ ہم نے یہ احکام سن لیے ہیں، اس وقت بھی تمہارے دل میں چور موجود تھا۔ کیونکہ گؤ سالہ پرستی کے جراثیم تمہارے دلوں میں موجود تھے۔ اور تم نے تورات کے احکام کو دل سے قطعاً تسلیم نہیں کیا تھا۔ یعنی ایمان کا تقاضا تو یہ ہوتا ہے کہ انسان مشرکانہ اعمال وعقائد کو یکسر چھوڑ کر نیکی اور بھلائی کے کاموں کی طرف سبقت کرے۔ مگر تمہارا یہ ایمان کس قسم کا ایمان ہے جو مشرکانہ افعال، بدعہدیوں اور نافرمانیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ تمہارے اسلاف بھی یہی کچھ کرتے رہے اور تم بھی انہی کی ڈگر پر چل رہے ہو۔ (اِنْ كُنْتُمْ

مُّؤْمِنِيْنَ) یہ ان کے اس دعویٰ پر مزید چوٹ ہے کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا، یعنی حقیقت میں تم تورات پر بھی ایمان نہیں رکھتے، ورنہ تورات پر ایمان تمہیں "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" کہنے کا اور بچھڑے کی عبادت جیسے صریح شرک کا حکم کیسے دے سکتا ہے اور اگر دیتا ہے تو تمہارا ایمان تمہیں بہت بری باتوں کا حکم دیتا ہے۔

قرآنِ مجید پر ایمان لانے کا مطلب

قرآنِ مجید پر ایمان لانے کا مطلب اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے تمام احکام اور سب تقاضوں پر عمل کیا جائے اور ان کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ اس چیز کو سامنے رکھتے ہوئے ہر مسلمان کو غور کرنا چاہئے کہ وہ اپنی زبان سے قرآن مجید پر ایمان لانے کا جو دعویٰ کر رہا ہے، کیا اس کی عملی حالت اس دعوے کی تصدیق کر رہی ہے یا نہیں۔ ذرا غور کریں کہ قرآن مجید میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے، رمضان کے روزے رکھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا لیکن آج مسلمانوں کی اکثریت نمازوں سے دور ہے، فرض روزے نہ رکھنے کے مختلف حیلے بہانے تراش رہی ہے اور اپنے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا ان پر بہت بھاری ہے۔ قرآن پاک میں مسلمانوں کو باطل اور ناجائز طریقے سے کسی مسلمان کا مال کھانے سے منع کیا گیا، لیکن آج مال بٹورنے کا کونسا ایسا ناجائز طریقہ ہے جو مسلمانوں میں کسی نہ کسی طرح رائج نہیں۔ قرآن حکیم نے کسی کو ناحق قتل کرنے سے منع کیا لیکن آج مسلمانوں میں ناحق قتل و غارت گری ایسی عام ہے کہ نہ مرنے والے کو پتا ہے کہ مجھے کیوں مارا گیا اور نہ مارنے والے کو پتا ہے کہ میں نے کیوں مارا۔ قرآن شریف میں مسلمان عورتوں کو گھروں میں رہنے اور پردہ کرنے کا حکم دیا گیا لیکن آج ہمارے معاشرے کا وہ کونسا طبقہ ہے جس میں مسلمان عورت سج سنور کر اجنبی مردوں کے سامنے نہیں آ رہی بلکہ آج مسلمانوں میں ہی کچھ لوگ عورت کے پردہ کرنے کو دقیانوسی سوچ اور تنگ ذہنی قرار دے رہے ہیں۔ اے کاش کہ ہم بھی اپنے زبانی ایمان و محبت کے دعووں اور بے عملی و بد عملی کے درمیان کا تضاد اور فرق سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں اور ہمیں بھی اس بات پر غور کرنا نصیب ہو جائے

کہ ہمارے جیسے اعمال ہیں کیا ہمارا ایمان ہمیں ان اعمال کا حکم دیتا ہے یا ہمارے ایمان کے تقاضے کچھ اور ہیں؟

برائی کی لذت وحلاوت/ ایمان اور نیک اعمال کی شیرینی

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب تک دل میں برائی کی لذت وحلاوت موجود رہتی ہے تب تک ایمان اور نیک اعمال کی شیرینی اس میں داخل نہیں ہوسکتی اور گناہوں پر اصرار ایمان کی مٹھاس اور عبادت کی لذت محسوس نہیں ہونے دیتا۔ یاد رہے کہ نیکوں اور نیکیوں سے محبت ایمان کی علامت ہے جبکہ بروں اور برائیوں سے محبت ایمان کی کمزوری کی علامت ہے، لہٰذا ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ اپنی ایمانی قوت کو اپنے قلبی میلان سے معلوم کرے کیونکہ جن دلوں میں فلموں، ڈراموں، بے حیائیوں اور گانوں کی محبت ہو ان دلوں میں نماز، ذکر، درود اور تلاوت کی محبت نہیں سما سکتی۔

موت کی محبت اور اللہ کی ملاقات کا شوق مقبول بندوں کا طریقہ

قُلْ	آپ کہہ دیجیے	اِنْ كَانَتْ	اگر ہے	لَكُمُ	تمہارے لئے
الدَّارُ الْاٰخِرَةُ	آخرت کا گھر	عِنْدَ اللّٰهِ	اللہ کے پاس	خَالِصَةً	خاص طور پر
مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ	لوگوں کے سوا	فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ		تو تم تمنا کرو موت کی	
اِنْ كُنْتُمْ	اگر ہو تم	صٰدِقِيْنَ ﴿٩٤﴾		سچے۔(94)	

یہ یہود کی دنیا سے محبت پر ایک نہایت عمدہ پیرایہ میں تعریض ہے۔ کیونکہ جن لوگوں کو آخرت سے لگاؤ ہوتا ہے وہ دنیا پر اس قدر ریجھے ہوئے نہیں ہوتے اور نہ ہی موت سے ڈرتے ہیں۔ مگر یہودیوں کا حال اس کے بالکل برعکس تھا اور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دلیل سے یہود کے اس غلط دعویٰ کا رد فرمایا جو وہ کہتے تھے کہ آخرت کا گھر ہمارے ہی لیے مخصوص ہے۔ **فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ**: تو موت کی تمنا کرو۔

اس کے برعکس موت کی محبت اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا شوق مقبول بندوں کا طریقہ ہے۔

حضرت عمر فاروق رَضِيَ اللهُ تَعَالٰی عَنْہُ (ہر نماز کے بعد) دعا فرماتے ’’اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِی شَھَادَۃً فِي سَبِيْلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِي فِي بَلَدِ رَسُوْلِكَ صَلَّى اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ‘‘ یارب مجھے اپنی راہ میں شہادت اور اپنے رسول کے شہر میں مجھے وفات نصیب فرما۔ (بخاری، کتاب فضائل المدینۃ، ۱۳-باب، ۱ / ۶۲۲، الحدیث: ۱۸۹۰) عمومی طور پر تمام اکابر صحابہ اور بالخصوص شہدائے بدر واحد واصحابِ بیعت رضوان رَضِيَ اللهُ تَعَالٰی عَنْھُم راہِ خدا میں موت سے محبت رکھتے تھے، حضرت خالد بن ولید رَضِيَ اللهُ تَعَالٰی عَنْہُ نے ایران والوں کو جو خط بھیجا اس میں تحریر فرمایا تھا: ’’یعنی میرے ساتھ ایسی قوم ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو جانے کو اتنا محبوب رکھتی ہے جتنا ایرانی لوگ شراب سے محبت رکھتے ہیں۔ (معجم الکبیر، باب من اسمہ خالد، ۴ / ۱۰۵، الحدیث: ۳۸۰۶) اس میں لطیف اشارہ تھا کہ شراب کی ناقص مستی کو محبتِ دنیا کے دیوانے پسند کرتے ہیں اور اللہ والے موت کو محبوب حقیقی کے وصال کا ذریعہ سمجھ کر محبوب جانتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ اہلِ ایمان آخرت کی رغبت رکھتے ہیں اور اگر لمبی عمر کی تمنا بھی کریں تو وہ اس لیے ہوتی ہے کہ نیکیاں کرنے کے لیے کچھ اور عرصہ مل جائے جس سے آخرت کے لیے ذخیرۂ سعادت زیادہ کرسکیں اور اگر گزشتہ زندگی میں گناہ ہوئے ہیں تو ان سے توبہ واستغفار کرلیں البتہ دنیوی مصائب سے تنگ آ کر وہ کبھی موت کی تمنا نہیں کرتے۔ حضرت انس بن مالک رَضِيَ اللهُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، رسول کریم صَلَّى اللهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ’’کوئی دنیوی مصیبت سے پریشان ہو کر موت کی تمنا نہ کرے اور اگر موت کی تمنا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو یوں دعا کرے کہ اے اللہ! عَزَّ وَجَلَّ، جب تک زندہ رہنا میرے لئے بہتر ہے اس وقت تک مجھے زندہ رکھ اور جب میرے لئے وفات بہتر ہو اس وقت مجھے وفات دیدے۔ (بخاری، کتاب المرضی، باب تمنی الموت، ۴ / ۱۳، الحدیث: ۵۶۷۱) اور درحقیقت دنیوی پریشانیوں سے تنگ آ کر موت کی دعا کرنا صبر و رضا و تسلیم و توکل کے خلاف ہے اور ناجائز ہے۔

دعوت مباہلہ/ اور اسلامی اصطلاح میں مباہلہ کا مطلب

وَلَنۡ	اور ہرگز نہیں	يَّتَمَنَّوۡهُ	تمنا کریں گے اس کی	اَبَدًۢا	کبھی بھی
بِمَا	(اس) وجہ سے جو	قَدَّمَتۡ	آگے بھیجا	اَيۡدِيۡهِمۡ	ان کے ہاتھوں نے
وَاللّٰهُ	اور اللہ	عَلِيۡمٌ	خوب جاننے والا ہے	بِالظّٰلِمِيۡنَ ﴿٩٥﴾	ظالموں کو.(95)

حضرت ابن عباس (رضي الله عنه) نے اس کی تفسیر دعوت مباہلہ سے کی ہے، (مباہلہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا بنیادی معنیٰ" ایک دوسرے پر لعنت بھیجنا" یا" بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑا کر بددعا کرنا" ہے، اسلامی اصطلاح میں مباہلہ کا مطلب یہ ہے کہ جب دو فریقین کے درمیان کسی مذہبی، عقیدتی یا تاریخی مسئلے پر شدید اختلاف ہو اور دلائل و بحث سے فیصلہ نہ ہو رہا ہو، تو دونوں فریق اپنے اہل و عیال اور پیاروں کو ساتھ لے کر اللہ کے دربار میں حاضر ہوں اور یہ دعا مانگیں کہ، یا اللہ! ہم میں سے جو فریق حق پر ہے اسے فتح و کامرانی عطا فرما اور جو جھوٹا ہے، اس پر تیری لعنت ہو اور وہ تیری رحمت سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔)

یعنی یہودیوں کو کہا گیا کہ اگر تم نبوت محمدیہ کے انکار اور اللہ سے محبوبیت کے دعوے میں سچے ہو تو مباہلہ کرلو، یعنی اللہ کی بارگاہ میں مسلمان اور یہودی دونوں مل کر یہ عرض کریں کہ یا اللہ دونوں میں سے جو جھوٹا ہے، اسے موت سے ہمکنار کردے، یہی دعوت انہیں سورت جمعہ میں بھی دی گئی ہے۔ نجران کے عیسائیوں کو دعوت مباہلہ دی گئی تھی، جیسا کہ آل عمران میں ہے۔ لیکن چونکہ یہودی بھی، عیسائیوں کی طرح، جھوٹے تھے، اس لئے عیسائیوں ہی کی طرح یہودیوں کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ یہ ہرگز موت کی آرزو (یعنی مباہلہ) نہیں کریں گے۔ حافظ ابن کثیر نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) یعنی یہود کہتے تھے کہ جنت ان ہی کے لئے مخصوص ہے، اسی پر ان کو چیلنج کیا گیا کہ پھر تو موت کی تمنا کر کے دیکھ لو، قرآن مجید کے اس چیلنج کے جواب میں یہود کو کم سے کم ظاہری طور پر بھی موت کی آرزو کرنے کی ہمت نہ ہوئی؛ اس لئے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ اور قرآن مجید کی صداقت کا یقین رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ اگر ایسا کیا گیا تو فوراً اللہ

کی طرف سے پکڑ ہو سکتی ہے۔

قرآنی پس منظر

(مباہلہ کا حکم قرآن مجید کی سورہ آلِ عمران (آیت 61) میں نازل ہوا۔ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے وفد کے ساتھ بحث کے دوران نازل ہوئی تھی، جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ آپ اپنے اہل خانہ (حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم) کو ساتھ لائیں اور عیسائی بھی اپنے پادریوں اور عورتوں کو بلائیں تا کہ خدا کی بارگاہ میں جھوٹے پر عذاب کی دعا کی جائے۔ یہ تاریخی واقعہ 24 ذوالحجہ کو پیش آیا۔)

یہود کو دنیا کی زندگی کی ہوس

وَلَتَجِدَنَّهُمْ	اور البتہ آپ ضرور پائیں گے انہیں	اَحْرَصَ النَّاسِ	زیادہ حریص لوگوں میں سے		
عَلٰى حَيٰوةٍ	زندگی پر	وَمِنَ الَّذِيْنَ	اور (ان) میں سے جنہوں نے		
اَشْرَكُوْا	شرک کیا	يَوَدُّ اَحَدُهُمْ	چاہتا ہے ان کا ہر ایک	لَوْ	کاش
يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ	وہ عمر پائے ہزار سال	وَمَا هُوَ	اور نہیں وہ		
بِمُزَحْزِحِهٖ	بچا سکنے والا	مِنَ الْعَذَابِ	عذاب سے		
اَنْ يُّعَمَّرَ	یہ کہ وہ عمر دیا جائے	وَاللّٰهُ	اور اللہ	بَصِيْرٌ	خوب دیکھنے والا
بِمَا	(اس) کو جو	يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾	وہ عمل کرتے ہیں۔		

مشرکین نہ آخرت کے قائل تھے نہ عذاب وثواب کے اور نہ جنت و دوزخ کے لہذا ان کو مرنے کے بعد کوئی خطرہ نظر نہیں آتا تھا۔ جب کہ یہود روز جزا کے قائل تھے، اور اپنی بدکرداریوں کا حال بھی انہیں خوب معلوم تھا۔ لہذا وہ تادیر دنیا میں زندہ رہنے کے لیے مشرکوں کی نسبت بہت زیادہ حریص تھے اور آیت عَلٰى حَيٰوةٍ کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو بس دنیا کی زندگی کی ہوس ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہودیوں میں موت کا غیر معمولی خوف پایا جاتا ہے، اگر چند یہودی

بھی مارے جائیں تو پوری قوم بے چین ہو اُٹھتی ہے اور ان کے حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔ وہ زندگی خواہ عزت کی ہو یا ذلت کی۔ اس سے انہیں کچھ غرض نہیں۔ حالانکہ یہی لمبی زندگی آخرت میں انہیں بچانا تو درکنار ان کے لیے اور زیادہ عذاب کا سبب بن جائے گی۔ **وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ**: یعنی لمبی سے لمبی عمر بھی کسی کے اعمال کو خدا سے نہیں چھپا سکتی۔ خدا ان ساری چیزوں کو دیکھ رہا ہے جو یہ کر رہے ہیں اور جب دیکھ رہا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان کا بدلہ نہ دے۔

زندگی کی اصل قدر

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جس کی عمر لمبی ہو اور اس کے اعمال اچھے ہوں۔'' پھر پوچھا گیا کہ لوگوں میں سب سے برا کون ہے؟ فرمایا: "وہ جس کی عمر لمبی ہو لیکن اس کے اعمال برے ہوں۔" حوالہ: جامع ترمذی، حدیث نمبر: 2330

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے زندگی کی اصل قدر کو واضح فرمایا ہے، یعنی لمبی عمر بذاتِ خود فضیلت نہیں بلکہ اس کی اصل خوبی نیک اعمال میں ہے، اگر کسی کو زیادہ عمر ملے اور وہ اسے عبادت، خدمتِ خلق اور تقویٰ میں گزارے تو وہ اللہ کے نزدیک بہترین انسان بن جاتا ہے، لیکن اگر وہی عمر گناہوں، ظلم یا غفلت میں گزاری جائے تو وہی لمبی زندگی وبال بن سکتی ہے، اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ اصل کامیابی وقت کے صحیح استعمال میں ہے، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص ساٹھ یا ستر سال کی عمر تک پہنچ کر نماز، صدقہ، حسنِ اخلاق اور خدمت میں لگا رہے تو اس کی لمبی عمر اس کے درجات کو بلند کرتی ہے، جبکہ اگر کوئی شخص لمبی عمر پا کر بھی برے اعمال میں مبتلا رہے تو اس کے گناہوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، یہ حدیث ہمیں یہ یقین دلاتی ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہے اور اصل بھلائی نیک اعمال کے ساتھ لمبی عمر پانے میں ہے۔

یہود کی جبریل دشمنی کی وجہ/مقربین کا عنادی لعنتی ہے کتاب اللہ سے روگردانی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ
وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِیْلَ
وَمِیْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ۚ وَمَا یَكْفُرُ بِهَآ
اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾
وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

نزول وحی کی مختلف صورتیں

قُلْ	آپ کہہ دیجئے	مَنْ كَانَ	جو ہے	عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ	دشمن جبرئیل کا
فَاِنَّهٗ	تو بیشک اس نے	نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ	نازل کیا ہے آپ کے دل پر		

نزول وحی کی مختلف صورتیں ہیں۔عام صورت تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبرائیل علیہ السلام حضور نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر نازل کرتے تھے۔جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی

لاتے تھے ۔تو حضور ﷺ کے قلب کے ساتھ رابطہ قائم ہو جاتا تھا ۔ بالکل اسی طرح جس طرح آج کل موبائل یا ٹیلیفون کا کنکشن مل جاتا ہے یہ خاص قسم کی رو ہوتی تھی جس کے ذریعے پیغمبر (علیہ السلام) اپنے کانوں سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے ۔ اور اسے خوب سمجھتے تھے اور اس کے الفاظ کو جانتے تھے ۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کوئی بات آنحضرت ﷺ کو بذریعہ خواب بتادی جاتی تھی یا بعض دفعہ فرشتہ کسی شکل میں متشکل ہو کر آتا تھا ۔ اور کلام الٰہی پیش کرتا تھا تاہم عام طور پر پہلی صورت میں یعنی قلب مبارک سے رابطہ قائم ہوتا تھا ۔ ایک دفعہ حضور ﷺ نے جبرائیل (علیہ السلام) سے فرمایا (1 ۔ بخاری ج 2 ص 691) کہ ہم آپ کی آمد کے منتظر رہتے ہیں ۔ آپ کثرت سے کیوں نہیں آتے تو جبرائیل (علیہ السلام) نے فرمایا، وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ہم تو صرف آپ کے رب کے حکم سے نازل ہوتے ہیں ۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے ہم حاضر ہو جاتے ہیں ہم اپنی مرضی سے نہیں آسکتے ۔

ضد، حسد اور فرقہ سازی کا جنون

بِإِذْنِ اللهِ	اللہ کے حکم سے	مُصَدِّقًا	تصدیق کرنیوالا ہے

لِّمَا	اس کی جو	بَيْنَ يَدَيْهِ	اس سے پہلے ہے	وَهُدًى	اور ہدایت

وَّبُشْرٰى	اور خوشخبری ہے	لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝97	ایمان والوں کے لئے ۔

یہودیوں کے ایک گروہ نے حضور سید المرسلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے کہا: آپ کے پاس آسمان سے کون فرشتہ آتا ہے؟ نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا "میرے پاس حضرت جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام آتے ہیں ۔ ابن صوریا یہودی پیشوا نے کہا: وہ ہمارا دشمن ہے، عذاب، شدت اور زمین میں دھنسانا وہی اتارتا ہے اور پہلے بھی کئی مرتبہ ہم سے دشمنی کر چکا ہے اگر آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے پاس حضرت میکائیل عَلَیْہِ السَّلَام آتے تو ہم آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ پر ایمان لے آتے ۔ (قرطبی، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۹۷، ۱ / ۲۸، الجزء الثانی، خازن، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۹۷، ۱ / ۷۱)

یہودیوں کی یہ بات سراسر جہالت تھی کیونکہ حضرت جبرئیل عَلَیۡہِ السَّلَام تو جو چیز بھی لائے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھی تو حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ سے دشمنی تھی، بلکہ اگر یہودی انصاف کرتے تو حضرت جبریل امین عَلَیۡہِ السَّلَام سے محبت کرتے اور ان کے شکرگزار ہوتے کہ وہ ایسی کتاب لائے جس سے ان کی کتابوں کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود، قرآن اور نبی ﷺ کی ضد میں جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا مخالف ظاہر کرنے لگے تھے۔ ممکن ہے یہود کے علماء اور لیڈروں کو جب یہ اندیشہ ہوا ہو کہ قرآن کی دعوت ان کے عوام کو کہیں متاثر نہ کردے تو انہوں نے یہ شوشہ چھوڑا ہو کہ محمد ﷺ کے پاس ان کے اپنے بیان کے مطابق جبریل فرشتہ آتا ہے اور یہ فرشتہ ہمارا دیرینہ مخالف ہے ہمارے اوپر فلاں فلاں آفتیں اسی کے ہاتھوں آئیں۔ اس وجہ سے ہم کسی ایسے شخص پر ایمان نہیں لاسکتے جس کی ہمارے مخالف فرشتہ سے ساز باز ہے۔ اگرچہ یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ یہود حماقت کی اس حد کو پہنچ جائیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگ جائیں لیکن انسان جب ضد، حسد اور فرقہ سازی کے جنون میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس سے کوئی بات بھی بعید نہیں رہ جاتی۔ روافض کے ایک فرقہ کا بھی عقیدہ ہے کہ قرآن دراصل اترنا تو تھا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر لیکن جبریل غلطی سے محمد ﷺ کے پاس اس کو لے کر چلے گئے۔ اس فرقہ کے لوگ اس گناہ پر، نعوذ باللہ، حضرت جبریل امین پر لعنت بھی کرتے ہیں۔

فرشتۂ رحمت اور فرشتۂ عذاب

مَنۡ كَانَ	جو ہے	عَدُوًّا لِّلّٰهِ	دشمن اللہ کا	وَمَلٰٓئِكَتِهٖ	اور اس کے فرشتوں کا		
وَرُسُلِهٖ	اور اس کے رسولوں کا	وَجِبۡرِيۡلَ	اور جبرئیل	وَمِيۡكٰلَ	اور میکائیل کا		
فَاِنَّ اللّٰهَ	تو بیشک اللہ	عَدُوٌّ	دشمن ہے	لِّلۡكٰفِرِيۡنَ ۹۸	کافروں کا۔		

یہودی حضرت میکائیل کو حضرت جبرئیل سے افضل جانتے تھے اور کہتے تھے کہ میکائیل فرشتۂ رحمت ہیں اور جبرئیل فرشتۂ عذاب، ان کا خیال تھا کہ بنی اسرائیل پر جو کچھ ابتلائیں اللہ کی طرف سے

آئیں، وہ حضرت جبرئیل ہی لے کر آئے، اس لئے بہانہ کرتے کہ اگر محمد ﷺ پر جبرئیل کے بجائے میکائیل وحی لے کر آتے تو ہم ایمان لانے کے بارے میں غور کرتے، یہاں اسی باطل خیال کی تردید ہے کہ فرشتہ کوئی بھی ہو اور وہ رحمت لے کر آیا ہو یا عذاب، جب وہ اللہ کی طرف سے مامور ہے اور جو کچھ لایا ہے اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے لایا ہے، تو اس پر اعتراض بے معنی ہے، پھر قرآن مجید نے ایک اُصول بتایا کہ اللہ، اس کے رسول، اس کے ملائکہ، جن میں جبرئیل بھی ہیں، میکائیل بھی، سے محبت وعداوت ایک دوسرے سے مربوط ہے، یہ ممکن نہیں کہ ان میں سے ایک سے نفرت و عداوت ہو اور دوسرے سے محبت و دوستی؛ اس لئے کسی فرشتہ یا رسول کے دشمن دراصل خود اللہ کے دشمن ہیں اور اس لئے اللہ بھی ان کا دشمن ہے۔

فرشتوں سے دشمنی کفر اور غضبِ الٰہی کا سبب

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اور فرشتوں سے دشمنی کفر اور غضبِ الٰہی کا سبب ہے اور محبوبانِ حق سے دشمنی خدا عَزَّ وَجَلَّ سے دشمنی کرنا ہے۔ حضرتِ جبریل عَلَیْہِ السَّلَام انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے خادم ہیں، ان کا دشمن رب تعالیٰ کا دشمن ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک فرشتے سے عداوت سارے فرشتوں سے عداوت ہے۔ یہی حال انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اور اولیاء عظام رَحْمَۃُ اللہِ تَعَالٰی عَلَیْہِم سے عداوت رکھنے کا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”جو میرے کسی ولی سے دشمنی کرے، اسے میں نے لڑائی کا اعلان کر دیا۔ (بخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع، ۴ / ۲۴۸، الحدیث: ۶۵۰۲)، گویا اللہ کے کسی ایک ولی سے دشمنی سارے اولیاء اللہ سے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے بھی دشمنی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اولیاء اللہ کی محبت اور ان کی تعظیم نہایت ضروری اور ان سے بغض وعناد اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے خلاف اعلان جنگ فرماتا ہے۔

محبت اور تعظیم کا صحیح مطلب

لیکن محبت اور تعظیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی قبروں پر گنبد اور

قبے بنائے جائیں، ان کی قبروں پر سالانہ عرس کے نام پر میلوں ٹھیلوں کا اہتمام کیا جائے، ان کے نام کی نذر و نیاز اور قبروں کو غسل دیا جائے اور ان پر چادریں چڑھائی جائیں اور انہیں حاجت روا، مشکل کشا، نافع وضار سمجھا جائے، ان کی قبروں پر دست بستہ قیام اور ان کی چوکھٹوں پر سجدہ کیا جائے وغیرہ، جیسا کہ بدقسمتی سے "اولیاء اللہ کی محبت" کے نام پر یہ کاروبار لات ومنات فروغ پذیر ہے۔ حالانکہ یہ "محبت" نہیں ہے، ان کی عبادت ہے، جو شرک اور ظلم عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس فتنۂ عبادت قبور سے محفوظ رکھے۔

معجزات اور واضح نشانیاں

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	اَنْزَلْنَآ	ہم نے نازل کیں	اِلَيْكَ	آپ کی طرف
اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ	نشانیاں واضح	وَمَا يَكْفُرُ	اور نہیں وہ انکار کرتے		
بِهَآ	اس کا	اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾	مگر نافرمان۔		

یعنی کھلی نشانیاں، جن میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا واضح ثبوت موجود ہے، واضح نشانیوں میں قرآن مجید بھی ہے، قرآن کی فطرتِ انسانی سے مطابقت اور عقل و دانش سے ہم آہنگ تعلیمات بھی، اور وہ بہت سے معجزات بھی جو آپ ﷺ کے ذریعہ ظاہر ہوئے۔ ابن صوریا نے نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے کہا کہ آپ کوئی ایسی چیز لے کر نہیں آئے جسے ہم پہچانتے ہوں اور آپ پر ایسی کوئی روشن آیت نازل نہیں ہوئی جس کی وجہ سے ہم آپ کی پیروی کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے حبیب! صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ، ہم نے آپ کی طرف روشن آیتیں نازل فرمائی ہیں جن میں حلال، حرام اور حدود وغیرہ کے احکام واضح اور تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور ان آیتوں کا انکار وہی کرتا ہے جو ہمارے احکامات کی اطاعت نہیں کرتا۔ (خازن، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۹۹، ۱/ ۷۲)

فسق کا اصلی مفہوم

فسق کا اصلی مفہوم خدا کی نافرمانی ہے۔ نافرمانی چھوٹی بھی ہوسکتی ہے، بڑی بھی ہوسکتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ بڑی سے بڑی نافرمانیوں کے لئے استعمال ہوا ہے ہمارے نزدیک اس کا یہی مفہوم یہاں بھی ہے سیاق سباق سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے مطلب ہے کہ اگر بات دلائل وشواہد کی ہو تب قرآن کی صداقت واضح ہے لیکن جو لوگ خدا کے عہد و پیمان کو توڑ ڈالنے کا فیصلہ کر چکے ہوں ان کے نزدیل دلائل وشواہد کی کیا اہمیت ہے۔

یہودیوں کا تورات پر ایمان ہی نہیں

اَوَ كُلَّمَا	اور کیا جب بھی	عٰهَدُوْا	انہوں نے عہد کیا	عَهْدًا	کوئی عہد
نَّبَذَهٗ	توڑ دیا اس کو	فَرِيْقٌ	ایک گروہ نے	مِّنْهُمْ	ان میں سے
بَلْ اَكْثَرُهُمْ	بلکہ اکثر ان کے	لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٠﴾	ایمان نہیں رکھتے۔		

حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُما فرماتے ہیں: جب حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے یہودیوں کو اللہ تعالیٰ کے وہ عہد یاد دلائے جو حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ پر ایمان لانے کے متعلق تھے تو مالک بن صیف نے کہا: خدا کی قسم! آپ کے بارے میں ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی اور فرمایا گیا کہ یہودیوں نے جب کبھی کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک گروہ نے اس عہد کو ویسے ہی پیٹھ پیچھے پھینک دیا بلکہ ان میں سے اکثر یہودیوں کو تورات پر ایمان ہی نہیں اسی لئے وہ عہد توڑنے کو گناہ نہیں سمجھتے اور نہ ہی اس بات کی کوئی پرواہ کرتے ہیں۔ عہد سے عام باتوں کے علاوہ خاص طور پر وہ عہد بھی مراد ہے، جو آئندہ پیغمبر پر ایمان لانے سے متعلق لیا جاتا تھا اور حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام اور پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کر کے یہود نے اس عہد کی خلاف ورزی کی تھی۔ یعنی ان میں سے اکثر وہ ہیں جن کو اس کا بھی یقین نہیں کہ عہد و پیمان کو پورا کرنا ضروری ہے، یا یہ کہ ان سے تورات کے ذریعہ جو عہد لیا گیا، اسی کا یقین نہیں ہے، تو جو لوگ عہد و پیمان کے معاملہ میں اتنے کمزور ہیں، ان سے وعدہ پورا کرنے کی کیا اُمید رکھی جا سکتی ہے؟

کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دینے والا گروہ

وَلَمَّا	اور جب	جَآءَهُمْ	آیا اُن کے پاس	رَسُوْلٌ	کوئی رسول
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ	اللہ کی طرف سے	مُصَدِّقٌ	تصدیق کرنے والا	لِّمَا	اسکی جو
مَعَهُمْ	ان کے پاس ہے	نَبَذَ	پھینک دیا	فَرِيْقٌ	ایک فریق نے
مِّنَ الَّذِيْنَ	(اُن لوگوں) سے جو	اُوْتُوا الْكِتٰبَ	دیئے گئے کتاب		
كِتٰبَ اللّٰهِ	اللہ کی کتاب کو	وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ	اپنی پیٹھ پیچھے		
كَاَنَّهُمْ	گویا کہ	لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾	وہ جانتے ہی نہیں۔		

وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ "پس پشت یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب توراۃ سے روگردانی اختیار کرلی۔ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو کسی درجے میں بھی تسلیم کرتے تو خاتم النبیین ﷺ کی تصدیق کرتے اور قرآن پاک کو بھی مان لیتے۔ مگر انہوں نے کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا یعنی اس میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ اس کے الفاظ کو تبدیل کر دیا۔ یا الفاظ کے معنی الٹ دے اور یہ سب کچھ انہوں نے اس طرح کیا" كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ "گویا وہ جانتے ہیں نہیں کہ کتاب اللہ میں کیا پیش گوئیاں ہیں۔ اور کون سی علامتیں بتائی گئی ہیں۔ جن کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اور آخری رسول (علیہ السلام) کی پہچان ہو سکتی ہے۔ اگر ان میں کوئی بھی منصف مزاج آدمی ہوتا! تو وہ دونوں چیزوں کو بلا شک وشبہ پہچان لیتے۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو اطمینان دلایا جارہا ہے کہ اہل کتاب کے ایمان نہ لانے سے رنجیدہ خاطر نہ ہوں؛ اس لئے کہ انبیاء اور آسمانی کتابوں کا انکار اور جان بوجھ کر انجان بن جانا ان کا پرانا وصف ہے اور کتنے ہی پیغمبر ہیں جو ان کی بے توجہی وبے رخی کا زخم کھا چکے ہیں اور دکھ اُٹھا چکے ہیں بعض مفسرین نے اس آیت میں ُرسول ٗ سے خاص طور پر پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات مراد لی ہے، اس کی بھی گنجائش ہے۔

جادو کے ذریعہ میاں بیوی میں جدائی ڈالنا / جادو کی حقیقت قرآن وسنت کی روشنی میں اور اُس کا علاج

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ ۚ وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ
کَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ
وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَۃٌ فَلَا تَکْفُرْ ؕ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْھُمَا مَا
یُفَرِّقُوْنَ بِہٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِہٖ ؕ وَمَا ھُمْ بِضَآرِّیْنَ بِہٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ
وَیَتَعَلَّمُوْنَ مَا یَضُرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىہُ مَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ
خَلَاقٍ ۛ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِہٖٓ اَنْفُسَھُمْ ؕ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا
لَمَثُوْبَۃٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ خَیْرٌ ؕ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

یہودیوں میں جادو ٹونا کرنے کی بیماری

وَاتَّبَعُوْا	اور انہوں نے پیروی کی	مَا تَتْلُوا	اس کا جو پڑھتے تھے
الشَّیٰطِیْنُ	شیاطین	عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ	سلیمان کی بادشاہت میں
وَمَا کَفَرَ	حالانکہ نہیں کفر کیا	سُلَیْمٰنُ	سلیمان نے

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ	اور لیکن شیاطین	كَفَرُوْا	انہوں نے کفر کیا
يُعَلِّمُوْنَ	وہ سکھاتے ہیں	النَّاسَ السِّحْرَ	لوگوں کو جادو

یہودیوں میں جادوٹونے کا بڑا ذوق تھا، بائبل میں اسی لئے کثرت سے جادو اور جادوگروں کا ذکر ملتا ہے، حضرت سلیمان کے زمانہ میں یہودیوں میں یہ فاسد ذوق بہت پروان چڑھ گیا تھا؛ اس لئے خاص طور پر اس عہد کا ذکر کیا گیا، شیاطین سے مراد جنات شیاطین بھی ہوسکتے ہیں، جن کو جادوگر عام طور پر اپنی فاسد اغراض کے لئے استعمال کرتے ہیں اور شیاطین انسان، یعنی بدکارو بدطینت اور فن جادوگری کے ماہر انسان بھی مراد ہوسکتے ہیں۔

وَمَآ اُنْزِلَ	اور جو نازل کیا گیا		عَلَى الْمَلَكَيْنِ		دو فرشتوں پر
بِبَابِلَ	بابل (شہر) میں	هَارُوْتَ	ہاروت	وَمَارُوْتَ	اور ماروت پر

شہر بابل کا جغرافیائی محل وقوع

قدیم اور تاریخی شہر بابل (Babylon) موجودہ دور کے عراق میں دریائے فرات کے کنارے واقع تھا۔اس کا جغرافیائی محل وقوع کچھ اس طرح ہے، یہ دارالحکومت بغداد سے تقریباً 90 کلومیٹر جنوب میں اور جدید شہر حلہ سے 10 کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔ یہ شہر دریائے فرات کے زرخیز میدانی علاقے میں آباد تھا، جس نے اسے زراعت اور تجارت کا مرکز بنایا۔ بابل ایک زمانہ میں علاقہ کا بڑا متمدن اور ترقی یافتہ شہر رہا تھا، یہیں بنی اسرائیل کی بڑی تعداد قیدی بنائی گئی تھی، ان پر فن جادوگری کا ایسا غلبہ تھا کہ اپنے قید ہونے کے زمانہ میں بھی وہ اس سے باز نہ تھے اور جادو سیکھنے سکھانے میں سرگرم تھے، جادو بعض اوقات پیغمبروں کے معجزات کو بھی مشتبہ کردیتا ہے؛ کیوں کہ ظاہر بیں نگاہوں میں دونوں صورتیں خلافِ عادت ہوتی ہیں؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو یہاں انسانی صورت میں بھیجا، ان کو جادو کا علم دیا گیا؛ تاکہ لوگوں کو ایک ماہر فن کی طرح جادو کی حقیقت اور اُصول بتا کر جادو اور معجزہ کا فرق بتائیں، ان فرشتوں کا مقصد تو صرف اِس خاص غرض کے لئے جادو کے بارے میں اُصول وقواعد کا بتلانا تھا؛ لیکن بعض کج فکر لوگ جادو کے

اُصول اور طریقے پوچھ کر اس کا استعمال اپنی فاسد اغراض کے لئے کیا کرتے تھے؛ اس لئے یہ فرشتے جادو کی تفصیل بتاتے ہوئے لوگوں کو متنبہ بھی کرتے جاتے تھے کہ ہمیں خدا نے امتحان و آزمائش کے لئے بھیجا ہے، ہم بتا تو دیں گے؛ لیکن اگر تم اس کو غلط استعمال کی نیت سے سیکھو گے تو اپنے آپ ہی کو برباد کرو گے، ہاروت و ماروت کے سلسلہ میں تفسیر کی کتابوں میں بعض اور واقعات بھی ذکر کئے گئے ہیں، وہ سب اسرائیلی روایات پر مبنی ہیں، غیر معتبر ہیں اور اسلامی تعلیمات سے مناسبت نہیں رکھتے۔ لفظی معنی ہیں 'ہاروت و ماروت پر اتارا گیا' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جیسے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل کی جاتی ہے، اسی طرح ان پر فن جادوگری نازل کیا گیا ہو، مقصد صرف اتنا ہے کہ من جانب اللہ فرشتوں کو اس کا علم دیا گیا، قرآن مجید میں متعدد مواقع پر 'انزال' کا لفظ محض عطا کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نبی برحق

وَمَا يُعَلِّمٰنِ	اور نہیں وہ سکھاتے تھے	مِنۡ اَحَدٍ	کسی ایک کو
حَتّٰى	یہاں تک کہ	يَقُوۡلَا	وہ کہہ دیتے
اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٌ	ہم صرف آزمائش ہیں	فَلَا تَكۡفُرۡ ؕ	تو مت تم کفر کرو

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نبی برحق تھے؛ لیکن یہودیوں نے ان کی طرف مختلف بے ہودہ باتیں منسوب کر دی تھیں، انھیں میں سے یہ تھا کہ وہ جادو کا علم بھی ان کی طرف منسوب کرتے؛ حالاں کہ جادوگر عہد سلیمان کے شیاطین تھے نہ کہ خود حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام اس سے بھی بڑا بہتان یہ تھا کہ کہتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی غیر اسرائیلی بیویوں سے متاثر ہو کر شرک میں مبتلا ہو گئے تھے اور دوسرے معبودوں کی پرستش کرنے لگے تھے، بائبل کے صحیفہ سلاطین کے باب نمبر: ۱۱ میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر ہے، قرآن مجید نے ایک نبی معصوم کی حیاتِ طیبہ پر بنی اسرائیل کی طرف سے ڈالے جانے والے اس غبار کو یہاں صاف کر دیا ہے۔

میاں بیوی کے درمیان تفریق کرانا گناہِ کبیرہ ہے

فَيَتَعَلَّمُوْنَ	پھر وہ سیکھ لیتے تھے	مِنْهُمَا	ان دونوں سے
مَا يُفَرِّقُوْنَ	وہ جدائی ڈالتے تھے	بِهٖ	اسکے ذریعے سے
بَيْنَ الْمَرْءِ	درمیان خاوند	وَزَوْجِهٖ	اوراس کی بیوی کے

شیطان کوشوہر وبیوی کے درمیان تفریق بہت محبوب ہے؛اس لئے کہ معاشرہ کا استحکام اور اس کا صحیح خطوط پر قائم رہنا اور چلنا ازدواجی زندگی کے استحکام پر مبنی ہے، حدیث میں بھی آیا ہے کہ شیطان اپنے اُن کارندوں سے بہت خوش ہوتا ہے جو میاں بیوی میں تفریق کرادیں؛ (مسلم، باب تحریش الشیطان الخ، حدیث نمبر:۷۱۰۶) اس لئے خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔حدیث میں ہے کہ:"وہ شخص ہم میں سے نہیں جو عورت کو اس کے شوہر کے خلاف بھڑکائے۔" (ابوداؤد ج:۱ص:۲۹۶) اس سے معلوم ہوا کہ میاں بیوی کے درمیان منافرت پھیلانا اور ایک دوسرے سے بدظن کرنا گناہِ کبیرہ ہے،اور ایسا کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ:"وہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل نہیں" جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا یہ فعل مسلمانوں کا نہیں۔اس آیت میں میاں بیوی کے درمیان تفریق پیدا کرنے کو یہودی جادُوگروں کا فعل بتایا ہے۔

جادو ایک حقیقت ہے

وَمَا هُمْ	اور نہیں تھے وہ	بِضَآرِّيْنَ	نقصان پہنچانے والے
بِهٖ	اس جادو کے ساتھ	مِنْ اَحَدٍ	کسی ایک کو
اِلَّا بِاِذْنِ اللهِ	مگر اللہ کے حکم سے	وَيَتَعَلَّمُوْنَ	اور وہ سیکھتے ہیں
مَا يَضُرُّهُمْ	جو انہیں نقصان پہنچائے	وَلَا يَنْفَعُهُمْ	اور انہیں نفع نہ دے

بے شک جادو ایک حقیقت ہے،اور بعض بدبخت لوگ جادو کرتے بھی ہیں،اور سبب کے درجے میں اس کا اثر بھی ظاہر ہوتا ہے،لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ پوری کائنات کے خالق و

مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں، ان کے حکم کے بغیر دنیا میں ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرسکتا، اسباب کے خالق بھی وہی ہیں اور اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والے بھی وہی ہیں۔ اس آیت میں فرمایا گیا: وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ: وہ لوگ کسی کو جادو کے ذریعے نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے مگر اللہ کے حکم سے۔

عموماً شیطانی وساوس، انسانی نفسیات، نظر بد اور حسد کے اثرات وغیرہ اور بعض اوقات پیشہ ور حضرات لوگوں کو جادو کے وہم میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ان شیطانی حملوں سے بچنے کے لئے درج ذیل طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس کی تعلیم ہمیں دین نے دی ہے:

1۔ سب سے بنیادی بات کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور ان کی صفات پر کامل ایمان اور یقین ہو، اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ ہو تو قوتِ ایمانی سے ہی ان شاء اللہ بہت سی شیطانی قوتیں اور نفسیاتی حملے پسپا ہو جاتے ہیں۔

2۔ پنج وقتہ نمازوں کی پابندی، ان کی شرائط واحکام کی رعایت رکھ کر ادا کرنے کا اہتمام، جو درحقیقت خالق ومالک سے تعلق مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے، اور جب بندے کا تعلق اللہ سے مضبوط ہوتا ہے تو شیطان کا بس اس پر نہیں چلتا۔

3۔ ہر وقت پاکی کا اہتمام کرنا، باوضو رہنا، اور تلاوتِ قرآنِ کریم کی کثرت، نیز ذکر کی پابندی۔

4۔ صبح وشام کی حفاظت کی مسنون دعائیں پڑھنے کا اہتمام، (جو مختلف مستند علماءِ کرام نے جمع کرکے شائع کر دی ہیں، کسی بھی دینی کتب خانے سے حاصل کی جا سکتی ہیں) نیز درج ذیل اذکار صبح وشام سات سات مرتبہ پابندی سے یقین کے ساتھ پڑھ کر دونوں ہاتھوں میں تھتکار کر سر سے پیر تک اپنے پورے جسم پر پھیر دیں ان شاء اللہ ہر قسم کے سحر، آسیب اور نظرِ بد کے اثراتِ بد سے حفاظت رہے گی:

درود شریف، سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی، سورہ الم نشرح، سورہ کافرون، سورہ اخلاص، سورہ فلق، سورہ ناس اور درود شریف

ایک روایت میں ہے کہ حضرت کعب احبار رحمہ اللہ جو پہلے یہود کے بڑے علماء میں سے تھے

، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمان ہو گئے تھے، انہوں نے بیان کیا کہ اگر میں یہ چند کلمات نہ پڑھا کرتا تو یہود جادو سے مجھے گدھا بنا دیتے وہ الفاظ یہ ہیں:

أَعُوذُ بِوَجْهِ اللهِ الْعَظِيمِ الَّذِي لَيْسَ شَيْءٌ أَعْظَمَ مِنْهُ، وَبِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ، وَبِأَسْمَاءِ اللهِ الْحُسْنٰى كُلِّهَا مَا عَلِمْتُ مِنْهَا وَمَا لَمْ أَعْلَمْ، مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ۔

سزائیں دینا صرف اسلامی حکومت کا کام ہے

وَلَقَدْ	اور البتہ تحقیق	عَلِمُوْا	جان لیا انہوں نے	لَمَنِ	البتہ جس نے
اشْتَرٰىهُ	خریدا اس (جادو) کو	مَا لَهٗ	نہ ہوگا اس کیلئے	فِي الْاٰخِرَةِ	آخرت میں
مِنْ خَلَاقٍ	کوئی حصہ	وَلَبِئْسَ	اور البتہ برا ہے	مَا شَرَوْا	جو انہوں نے بیچ دیا
بِهٖٓ	اس کے بدلے	اَنْفُسَهُمْ	اپنی جانوں کو	لَوْ	کاش کہ
كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾			وہ جانتے ہوتے۔		

شیطان انسان کو جن راہوں سے گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، ان میں جادو وہ ذریعہ اور عمل ہے، جسے خالصتاً شیطانی عمل قرار دیا گیا۔ جادو کے لیے عربی زبان میں ''سحر'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے، قرآن وسنّت میں سحر (جادو) ایسے امر کو کہا جاتا ہے جس میں شیاطین کو خوش کر کے ان کی مدد حاصل کی گئی ہو، پھر شیاطین کو راضی کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ کبھی ایسے منتر اختیار کئے جاتے ہیں جن میں کفر وشرک کے کلمات ہوں اور شیاطین کی مدح سرائی کی گئی ہو، جس سے شیطان خوش ہوتا ہے۔ کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کر کے اس کا خون استعمال کرنا، یا ناپاکی ونجاست کی حالت میں رہنا وغیرہ۔ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''شریعت میں سحر، جادو ہر اس کام کے ساتھ مخصوص ہے جس کا سبب مخفی ہو، اسے اس کی اصل حقیقت سے ہٹ کر پیش کیا جائے اور دھوکا دہی اس میں نمایاں ہو''۔ غرض سحر جادوگر اور شیطان کے درمیان ہونے والے ایک معاہدے کا نام ہے، جس کی بناء پر جادوگر کچھ حرام اور شرکیہ امور کا

ارتکاب کرتا ہے اور شیطان اس کے بدلے جادوگر کی مدد کرتا اور اس کے مطالبات پورے کرتا ہے ۔رسول اللہ ﷺ پر یہودیوں کا سحر کرنا اور اس کی وجہ سے آپ ﷺ پر بعض آثار کا ظاہر ہونا اور بذریعہ وحی اس جادو کا پتا لگنا اور اس کا ازالہ کرنا احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے۔صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے جو دوسری حدیث کی کتابوں میں بھی درج ہے کہ ایک موقع پر نبی اکرم ﷺ بھی جادو کے اثر میں رہے۔حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نے نبی اکرم ﷺ پر جادو کیا، جب آپ ﷺ نے اس کے اثرات کو اپنے اوپر محسوس کیا تو جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور سورۃ الفلق اور سورۃ الناس جن کو ''معوذتین'' کہتے ہیں، وحی کی گئیں ۔پھر جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے کہا: ''یقیناً ایک یہودی نے آپ ﷺ پر جادو کیا ہے اور اس کا طلسم فلاں کنویں میں رکھا ہوا ہے۔'' نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا کہ وہاں سے طلسم لے آئیں۔جب وہ اسے لے کر واپس آئے تو آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ اس کی گرہوں کو ایک ایک کر کے کھولیں اور ہر گرہ کے ساتھ ان سورتوں میں سے ایک ایک آیت پڑھیں۔جب انہوں نے ایسا کیا تو آپ ﷺ یوں اٹھ کھڑے ہوئے، گویا وہ پہلے بندھے ہوئے تھے۔(صحیح بخاری) آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص نجومی کے پاس جا کر اس سے کوئی بات پوچھے، تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہ ہوگی''۔(صحیح مسلم) صحیح مسلم ہی کی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان اپنے ایجنٹوں کے بڑے بڑے کارناموں پر خوش نہیں ہوتا لیکن اس بات پر بہت خوش ہوتا ہے کہ اس کا کوئی پیروکار میاں بیوی کے درمیان تفریق کروا دے۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کسی کاہن کے پاس آیا اور اس کی بات کی تصدیق کی تو اس نے اس چیز کا انکار کیا جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی''۔(سنن ابو داؤد) اسلام میں جادو سیکھنا اور جادو کرنا دونوں کو کفر قرار دیا گیا ہے، اس لیے جو کوئی بھی جادو کرتا ہو، اس کے لیے شریعت میں بہت سخت سزا رکھی گئی ہے۔اگر کوئی جادو پر عمل کرتا ہوا پکڑا جائے اور وہ توبہ نہ کرے اور جادو کرنا نہ چھوڑے تو اس کی سزا موت ہے۔اس قانون کی بنیاد اللہ کے رسول ﷺ کی یہ حدیث ہے جس کے راوی حضرت جندب ابن کعب رضی اللہ عنہ ہیں۔نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جادوگر کے لیے مقرر کردہ سزا یہ ہے کہ اسے تلوار سے قتل کردیا جائے۔''اس قانون پر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہ نے سختی سے عمل کیا۔ یاد رہے کہ یہاں جادوگر کے بارے میں جو سزائیں بیان کی گئیں یہ سزائیں دینا صرف اِسلامی حکومت کا کام ہے، عوامُ النَّاس کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں، البتہ ہر ایک کو چاہئے کہ جادو کرنے والوں سے دور رہے۔ جادو کا اثر تب واقع ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو۔ کیونکہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کی محتاج ہے۔ جادو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی کیا گیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے شر سے محفوظ رکھا اور امت کے لیے یہ آسانی ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل امت کو جادو کا علاج بتادیا گیا۔ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا، ایک شخص پر اگر جادو ہو یا اس کی بیوی تک پہنچنے سے اسے باندھ دیا گیا ہو، اس کا دفعیہ کرنا اور جادو کے باطل کرنے کے لیے عمل کرنا درست ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا، اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جادو کا توڑ کرنے والوں کی نیت تو اچھی ہوتی ہے اور اللہ پاک نے اس بات سے منع نہیں فرمایا جس سے فائدہ ہو۔ (صحیح بخاری) انسان جادو کی وجہ سے بڑے بڑے خطرات سے دوچار ہوسکتا ہے، اس لیے کسی بھی دن معوذات اور مسنون دعاؤں سے سستی اور کاہلی نہ برتی جائے، حتیٰ کہ بعض اوقات انسان کو جادو کے ذریعے قتل تک کردیا جاتا ہے۔ کالے جادو کرنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو جیتے جاگتے انسان کو موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے اور وہ اسی وقت مِقررہ پر ہی آئے گی، لیکن جس طرح ظاہری طور پر انسان کا قتل ہوجانا سبب کا درجہ رکھتا ہے، اسی طرح جادو کے ذریعے بھی سبب کے درجے میں قتل کیا جاسکتا ہے۔

از روئے شریعت جادو کرنا یا کرانا کفر ہے

از روئے شریعت کسی پر جادو کرنا یا کرانا کفر ہے اور اس کا کرنے والا اور کرانے والا دونوں دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ اگر کسی مسلمان نے یہ عمل کیا یا کرایا تو اسے چاہیے کہ فوراً اپنے ایمان کی تجدید کرے اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو اپنے نکاح کی بھی تجدید کرے۔ مختصر یہ کہ جادو

خالصتاً ایک شیطانی عمل ہے، جس سے بچنا، دور رہنا اور مکمل اجتناب کرنا ایمان اور شریعت دونوں کا بنیادی تقاضا ہے۔

دنیا کی عارضی زندگی اور متاعِ قلیل

وَلَوۡ	اور اگر	اَنَّهُمۡ	بیشک وہ	اٰمَنُوۡا	ایمان لاتے	وَاتَّقَوۡا	اور پرہیزگار بن جاتے		
لَمَثُوۡبَةٌ	البتہ ثواب پاتے	مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ	اللہ کی طرف سے	خَيۡرٌ	بہتر ہے				
لَوۡ	کاش کہ	كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۳﴾	وہ جانتے ہوتے۔						

فرمایا گیا کہ اگر یہودی حضور، سیدِ کائنات صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اور قرآنِ پاک پر ایمان لاتے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں کا ثواب ان کیلئے بہت اچھا ہوتا کیونکہ آخرت کی تھوڑی سی نعمت دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت سے اعلیٰ ہے۔ دوستو! کھانے پینے کے لیے ہمیں نہیں پیدا کیا گیا، یہ کھانا پینا تو ہماری زندگی کے لیے دیا ہے، مگر زندگی اپنی بندگی کے لیے دی، بعض لوگ اپنے جسم کو امپورٹ ایکسپورٹ کا آفس سمجھتے ہیں، یعنی ادھر سے روٹی ڈالی اور نیچے سے صبح لیٹرین میں ایکسپورٹ کر دیا تو گویا آپ لوگ دفتر ہیں، نعوذ باللہ! امپورٹ ایکسپورٹ آفس بنے ہوئے ہیں، ارے بھائی! یہ جو کھا رہے ہو اس رزق روٹی سے جو خون بنے اور خون سے جو طاقت بنے اُس طاقت کو اللہ پر فدا کر دو، آنکھوں میں جو روشنی آئی خدا پر فدا کر دو، اُس سے نامحرموں اور امردوں کو مت دیکھو، کان میں جو سننے کی طاقت آئی قرآن شریف سنو، اللہ والوں کی باتیں سنو، زبان میں جو طاقت آئی سبحان اللہ پڑھو، اللہ کے گیت گاؤ، ٹانگوں میں جو طاقت آئی اس سے مسجد جاؤ، عمرہ کرو، روضۂ مبارک کی زیارت کرو، ہاتھوں میں جو طاقت آئی علماء سے مصافحہ کرو، اللہ والوں اور حجرِ اسود کا بوسہ دو، یعنی ہر چیز کا حق ادا کرو، سر میں جو طاقت آئی سر کو اللہ کے قدموں میں رکھ دو۔ قرآنِ مجید میں واضح طور پر ارشاد ہے کہ آخرت کی زندگی نہ صرف بہتر اور پائیدار ہے، بلکہ سورۃ الاعلیٰ کے مطابق اس کا موازنہ دنیا کی عارضی زندگی اور متاعِ قلیل سے ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔

مشتبہ الفاظ کے استعمال کی ممانعت/تنسیخ آیات کی وجوہات

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ
اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ
خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۰۵﴾ مَا
نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ
قَدِیْرٌ ﴿۱۰۶﴾

رَاعِنَا کے بجائے ''اُنْظُرْنَا'' کہنے کا حکم

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ	اے لوگو جو	اٰمَنُوْا	ایمان لائے ہو	لَا تَقُوْلُوْا	مت تم کہو
رَاعِنَا	ہماری رعایت کیجئے	وَ قُوْلُوا	اور تم کہو	انْظُرْنَا	ہمیں دیکھئے
وَ اسْمَعُوْا	اور تم سنو	وَ لِلْكٰفِرِیْنَ	اور کافروں کے لئے		
عَذَابٌ	عذاب ہے	اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾	دردناک۔		

جب حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ صحابہ کرام رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُم کو کچھ تعلیم و تلقین فرماتے تو وہ کبھی کبھی درمیان میں عرض کیا کرتے۔ ''رَاعِنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہ اس کے یہ معنی تھے

کہ یارسول اللہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ ، ہمارے حال کی رعایت فرمائیے یعنی کلامِ اقدس کو اچھی طرح سمجھ لینے کا موقع دیجئے ۔راعنا'' کے معنی ہیں ُہماری رعایت کیجئے!'اس معنی کے اعتبار سے یہ کوئی گستاخانہ لفظ نہیں ؛لیکن یہود اس لفظ کو ایک خراب معنی میں بھی استعمال کرتے تھے اور جب آپ ﷺ کو درمیانِ گفتگو اپنی طرف متوجہ کرنا ہوتا تو اسی بدنیتی کے ساتھ آپ ﷺ کو مخاطب کرتے تھے، بھولے بھالے مسلمانوں کو ان کی اس بدتمیزی کا علم نہیں تھا؛اس لئے دیکھا دیکھی ایسے مواقع پر وہ بھی ''راعنا'' کہہ کر آپ ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے ،اسی پس منظر میں قرآن مجید نے یہودیوں کی اس بے ہودہ حرکت کا پردہ فاش کیا اور ہدایت کی کہ اگر حضور ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہو تو بجائے ''راعنا'' کے بجائے ''انظرنا'' کہیں ،اس کے معنی بھی وہی ہیں ہمارا لحاظ فرمائیے!'، مگر اس میں گستاخانہ معنی مراد لینے کی گنجائش نہیں اور فرمایا گیا کہ خوب احترام سے آپ ﷺ کے ارشادات کو سنا کریں ،اس سے معلوم ہوا کہ خدا، رسول اور دین وشریعت کے ذکر میں ایسے الفاظ سے بھی احتیاط برتنی چاہئے ،جس کے گو درست معنی بھی ہوں اور نیت بھی بولنے والے کی بری نہ ہو؛لیکن اس میں خلافِ ادب معنی کی بھی گنجائش نکلتی ہو،اسی طرح ایسے مباح کام سے بھی منع کیا جائے گا ،جس کے بارے میں خطرہ ہو کہ دوسرے فاسد فکروذہن کے لوگ اس کو اپنی غلط کاریوں کے لئے ڈھال بنالیں گے ۔ایسے الفاظ جن میں بے ادبی یا گستاخی کا شبہ بھی پیدا ہوتا ہو، وہ استعمال کرنا درست نہیں ۔

یہودیوں کی ایک اور کمینگی

یہودیوں کی اسی طرح کی ایک اور کمینگی کا ذکر حدیث میں آیا ہے کہ وہ ''السلام علیکم'' کے بجائے ''اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ'' کہتے ،جس کا معنی ہے تم پر موت ہو ۔رسول اللہ ﷺ نے ان کے جواب میں صرف ''عَلَیْكَ'' کہنے کا حکم دیا کہ وہ تمہیں پر ہو ۔(مسلم) اس آیت سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی تعظیم وتوقیر اور ان کی جناب میں ادب کا لحاظ کرنا فرض ہے اور جس کلمہ میں ترکِ ادب کا معمولی سا بھی اندیشہ ہو وہ زبان پر لانا ممنوع ہے ۔ایسے الفاظ کے

بارے میں حکمِ شرعی یہ ہے کہ جس لفظ کے دو معنی ہوں اچھے اور برے اور لفظ بولنے میں اس برے معنیٰ کی طرف بھی ذہن جاتا ہو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ اور حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے لئے استعمال نہ کئے جائیں۔

کلمہ کفر کہنے والوں کیلئے دردناک عذاب

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی بارگاہ کا ادب ربُّ العالمین خود سکھاتا ہے اور تعظیم کے متعلق احکام کو خود جاری فرماتا ہے۔ الغرض فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے متعلق کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کرو جو آپ کی شان کے خلاف ہو اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یاد رکھو"وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ "۔کلمہ کفر کہنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یعنی جو یہودی سید المرسلین صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی توہین کر رہے ہیں اور ان کے بارے میں بے ادبی والے الفاظ استعمال کر رہے ہیں ان یہودیوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔(روح البیان، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۱۰۴، ۱/ ۹۷) یاد رہے کہ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی جناب میں بے ادبی کفر ہے۔

رحمت سے مراد نبوت

مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ	نہیں چاہتے جنہوں نے	كَفَرُوْا	کفر کیا				
مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	اہل کتاب میں سے	وَ لَا الْمُشْرِكِیْنَ	اور نہ شرک کرنے والے				
اَنْ یُّنَزَّلَ	یہ کہ نازل کی جائے	عَلَیْكُمْ	تم پر	مِّنْ خَیْرٍ	کوئی بھلائی		
مِّنْ رَّبِّكُمْ	تمہارے رب کی طرف سے	وَ اللّٰهُ	اور اللہ	یَخْتَصُّ	وہ خاص کرلیتا ہے		
بِرَحْمَتِهٖ	اپنی رحمت کے ساتھ	مَنْ یَّشَآءُ	جس کو وہ چاہتا ہے				
وَ اللّٰهُ	اور اللہ	ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۰۵﴾	بڑے فضل والا (ہے)				

وَ اللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ُ مشرکین عرب کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عام آدمی تھے اور وہ اپنے کسی عظیم سردار کے بجائے ایک عام آدمی پر وحی کا نزول ماننے کے لیے تیار

نہ تھے۔ دیکھیے الزخرف (31) اور اہل کتاب اللہ کی اس رحمت کو اپنی نسل سے باہر نہیں دیکھ سکتے تھے۔فرمایا کہ اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہے خاص کرے۔ یہاں رحمت سے مراد نبوت ہے، جو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے، وہ نہ کسی کی عظمت کی بنیاد پر ملتی ہے، نہ نسل پر اور نہ کسی کے کسب، محنت اور چلہ کشی پر۔ یہودیوں کو اصل تکلیف تو یہ تھی کہ نبی آخر الزمان ﷺ ان میں کیوں مبعوث نہیں ہوئے۔ آپ ﷺ اولاد اسماعیل سے اور ایسی قوم میں پیدا ہوئے جنہیں یہود اپنے سے بہت کمتر اور حقیر سمجھتے تھے اور مشرکوں کو یہ تکلیف تھی کہ آپ خالصتاً ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے تھے۔ جس کی زد ان پر، ان کے معبودوں پر، ان کے آباؤ اجداد پر اور ان کی چودھراہٹ پر پڑتی تھی۔ لہذا یہود اور مشرکین دونوں ہی پیغمبر اسلام، اسلام اور مسلمانوں کے شدید دشمن تھے۔ وہ مسلمانوں کے لیے کوئی بھلائی کی بات کیسے گوارا کر سکتے تھے، اور یہاں بھلائی اور رحمت سے مراد بالخصوص وہ احکام الٰہی ہیں جو مسلمانوں کی طرف نازل کئے جا رہے تھے۔ لہذا یہ دونوں فریق مسلمانوں کے خلاف متحد ہو جاتے تھے۔ یہودیوں کو اصل حسد اس بات سے تھا کہ نبوت کا شرف بجائے بنو اسحاق کے بنی اسماعیل کو کیوں حاصل ہو رہا ہے؟ اس آیت میں اسی کا جواب دیا گیا ہے کہ نبوت سے سرفراز کیا جانا اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے اور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کہ جسے چاہے اپنے فضل سے سرفراز فرمائیں۔

نَسخ کا معنیٰ و مفہوم اور نَسخ کے منکر لوگ

مَا نَنۡسَخۡ	جو ہم منسوخ کرتے ہیں	مِنۡ اٰيَةٍ	کوئی آیت
اَوۡ نُنۡسِهَا	یا ہم بھلا دیتے ہیں اسے	نَاۡتِ	ہم لے آتے ہیں
بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ	بہتر اس سے	اَوۡ مِثۡلِهَا	یا اس جیسی
اَلَمۡ تَعۡلَمۡ	کیا نہیں تو جانتا	اَنَّ اللّٰهَ	کہ بیشک اللہ
عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ	ہر شے پر	قَدِيۡرٌ ۞ ١٠٦	خوب قدرت والا ہے۔

نَسخ کا معنیٰ ہے بعد میں آنے والے حکم کے ساتھ پہلے کسی حکم کو ختم کر دینا، جیسے پہلے بیت

المقدس قبلہ مقرر رہوا، پھر بیت اللہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا اور جیسے ہماری شریعت میں پہلی شریعتوں کے بہت سے احکام منسوخ کر دیے گئے ۔یہودی نسخ کے منکر تھے، اسی لیے انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جھٹلایا کہ انھوں نے تورات کے بعض احکام کیوں منسوخ کیے ۔قرآن پر بھی انھوں نے اعتراض کیا کہ جب پہلا حکم اللہ تعالیٰ کا تھا اور درست تھا تو وہ منسوخ کیوں ہوا؟

نسخ کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے حکم غلط تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حکم ایک مقررہ وقت تک نافذ تھا، بعد میں نئی حکمت کے تحت دوسرا حکم دیا گیا۔ یہ تبدیلی اللہ کے علم اور حکمت کے مطابق ہوتی ہے اور شریعت کی لچک کو ظاہر کرتی ہے۔

یعنی نسخ کا لغوی معنی ختم کرنا، زائل کرنا، یا بدل دینا ہے ۔اصطلاح میں، اس سے مراد کسی پہلے سے موجود شرعی حکم کو بعد میں آنے والے شرعی حکم کے ذریعے منسوخ (ختم) کرنا ہے ۔یہ عمل قرآن یا حدیث میں ایک حکم کی جگہ بہتر یا مناسب حکم لانے کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔سابقہ حکم کو کسی بعد والی دلیل شرعی سے اٹھا دینا۔(خازن، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۱۰۶، ۱/ ۷۷) اور یہ حقیقت میں سابقہ حکم کی مدت کی انتہاء کا بیان ہوتا ہے ۔اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ قرآن کریم نے گزشتہ شریعتوں اور کتابوں کو منسوخ فرمایا تو کفار کو بڑی وحشت ہوئی اور انہوں نے اس پر اعتراضات کئے، اس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی اور بتایا گیا کہ منسوخ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ناسخ بھی، دونوں عین حکمت ہیں اور ناسخ کبھی منسوخ سے زیادہ آسان اور نفع بخش ہوتا ہے لہٰذا قدرت الٰہی پر یقین رکھنے والے کو اس میں تَرَدُّد کی کوئی گنجائش نہیں ۔کائنات میں مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دن سے رات کو، گرما سے سرما کو، جوانی سے بچپن کو، بیماری سے تندرستی کو، بہار سے خزاں کو منسوخ فرماتا ہے ۔یہ تمام نسخ وتبدیل اس کی قدرت کے دلائل ہیں تو ایک آیت اور ایک حکم کے منسوخ ہونے میں کیا تعجب؟ نسخ حقیقت میں سابقہ حکم کی مدت کا بیان ہوتا ہے کہ وہ حکم اس مدت کے لیے تھا اور اب وہ مدت پوری ہوگئی ۔صرف یہ تھا کہ ہمیں وہ مدت معلوم نہ تھی اور ناسخ کے آنے سے معلوم ہوگئی ۔کفار کا اعتراض تو جہالت و ناسمجھی کی وجہ سے تھا لیکن اہلِ کتاب کو تو کسی بھی صورت یہ اعتراض نہیں

کرنا چاہیے تھا کیونکہ حضرت آدم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی شریعت کے بہت سے احکام تو وہ بھی منسوخ مانتے ہیں جیسے بہن بھائی کا آپس میں نکاح، یونہی یہودیوں سے پہلے ہفتہ کے دن دنیوی کام حرام نہ تھے، ان پر حرام ہوئے، نیز توریت میں ہے کہ حضرت نوح عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی امت کے لئے تمام جانور حلال تھے جبکہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام پر بہت سے حرام کر دیئے گئے۔ ان تمام چیزوں کے ہوتے ہوئے نسخ کا انکار کس طرح ممکن ہے۔

نسخ کے چند احکام

(1)......جس طرح کوئی آیت دوسری آیت سے منسوخ ہوتی ہے اسی طرح حدیثِ متواتر سے بھی آیت منسوخ ہوتی ہے۔

(2)......کبھی صرف تلاوت منسوخ ہوتی ہے اور کبھی صرف حکم منسوخ ہوتا ہے اور کبھی تلاوت وحکم دونوں منسوخ ہوتے ہیں۔ بیہقی شریف میں ہے کہ ایک انصاری صحابی رات کو تہجد کے لیے اٹھے اور سورۂ فاتحہ کے بعد جو سورت ہمیشہ پڑھا کرتے تھے اس کو پڑھنا چاہا لیکن وہ بالکل یاد نہ آئی اور سوائے بسم اللہ کے کچھ نہ پڑھ سکے۔ صبح کو دوسرے اصحاب سے اس کا ذکر کیا تو ان حضرات نے فرمایا: ہمارا بھی یہی حال ہے، وہ سورت ہمیں بھی یاد تھی اور اب ہمارے حافظہ میں بھی نہ رہی۔ سب نے بارگاہِ رسالت میں واقعہ عرض کیا تو حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا: آج رات وہ سورت اٹھالی گئی۔ اس کے حکم وتلاوت دونوں منسوخ ہوئے جن کاغذوں پر وہ لکھی گئی تھی ان پر نقش تک باقی نہ رہے۔ (دلائل النبوہ للبیہقی، باب ما جاء فی ءالیف القرآن۔۔۔ الخ، ۷/ ۱۵۷، ملخصاً)

نَاْتِ بِخَیْرٍ: ہم بہتر لے آئیں گے۔ فرمایا کہ ہم کسی آیت کو منسوخ فرمادیں یا بھلا دیں تو اس کی جگہ زیادہ آسان اور زیادہ ثواب والا یا کم از کم پہلے والے حکم کے برابر حکم لے آئیں گے۔ پہلے سے زیادہ سہولت والے کی مثال ہے جیسے پہلے دس گنا تک کے لشکر سے جہاد کا حکم تھا پھر صرف دوگنا تک کے لشکر سے جہاد میں ڈٹے رہنے کا حکم نازل ہوا۔ زیادہ ثواب کی مثال ہے جیسے پہلے ایک

قول کے مطابق روزے کی طاقت رکھنے والے کو بھی فدیہ دینے کی اجازت تھی لیکن بعد میں اس پر روزے کا حکم ہی متعین کر دیا جو فدیہ سے زیادہ ثواب والا حکم ہے۔سہولت میں برابر کے حکم کی مثال ہے جیسے بیت المقدس سے پھیر کر خانہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا گیا حالانکہ دونوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے میں برابر درجے کی سہولت ہے۔

مختلف شرائع میں بعض اختلافات

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ دین تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے یہ کبھی منسوخ نہیں ہوا البتہ مختلف شرائع میں بعض اختلافات رونما ہوتے رہے ہیں، مثلاً کسی شریعت میں اونٹ کا گوشت حرام تھا ہماری شریعت میں حلال ہے۔کسی شریعت میں دو سگی بہنیں ایک نکاح میں آسکتی تھیں ہمارے ہاں حرام ہے وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ"۔البتہ دین کے بنیادی اصول کبھی منسوخ نہیں ہوئے۔تنسیخ آیات کو ایک دوسری مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے، کہ تکوینی امور میں جوں جوں حالات بدلتے ہیں احکام بھی بدلتے رہتے ہیں جب انسان بچہ ہوتا ہے تو اس کی ضروریات اس کی عمر اور اس کے حالات کے مطابق ہوتی ہیں جب جوان ہوتا ہے، تو اس پر دوسرے احکام نافذ ہوتے ہیں پھر جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو حالات کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکام بھی اقوام عالم کے حالات کے تقاضوں کے مطابق تبدیل ہوتے رہے ہیں، یہ ایسی اعتراض والی بات نہیں ہے۔

کثرت سوالات کی ممانعت/حسد بدترین بیماری ہے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا
نَصِیْرٍ ﴿۱۰۷﴾ اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَکُمْ کَمَا سُئِلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ
الْکُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ کَثِیْرٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَکُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِکُمْ کُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِھِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْحَقُّ ۚ
فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۰۹﴾

شرعی قانون میں بھی تبدیلی

اَلَمْ تَعْلَمْ	کیا تو نہیں جانتا	اَنَّ اللّٰہَ	کہ بیشک اللہ	لَہٗ	اس کے لئے
مُلْکُ	بادشاہت ہے	السَّمٰوٰتِ	آسمانوں کی	وَالْاَرْضِ	اور زمین کی
وَمَا	اور نہیں	لَکُمْ	تمہارے لئے	مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ	اللہ کے سوا
مِنْ وَّلِیٍّ	کوئی دوست	وَّلَا	اور نہ کوئی	نَصِیْرٍ ﴿۱۰۷﴾	مددگار۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ اپنے ملک میں جو چاہے جب چاہے قانون جاری کرے، جب کائنات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، دن جاتا ہے

رات آتی ہے اور سارے جہان میں ہر طرح تبدیلی ہوتی رہتی ہے تو شرعی قانون میں بھی تبدیلی ہو سکتی ہے اور یہ تبدیلی مخلوق کی مصلحت کی وجہ سے ہے۔ جب وہ مالک الملک ہے، تو کیا اسے یہ اختیار حاصل نہیں کہ کسی حکم کو منسوخ کر دے یا تبدیل کر دے، معاذ اللہ کیا وہ مجبور ہے کہ ہر حالت میں ایک ہی حکم کو جاری رکھے، اگر ایسا تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کی حاکمیت کو ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا، لہٰذا وہ تنسیخ احکام پر پوری طرح قادر ہے اور یہ اس کا حق بھی ہے۔ فرمایا یاد رکھو! کہیں بھٹک نہ جانا وَمَا لَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۰۷﴾۔ اس کے سوا تمہارا کوئی حمائتی اور مددگار نہیں ہے، ولی کا معنی عام طور پر سرپرست ہوتا ہے امام بیضاوی رحمہ اللہ (تفسیر بیضاوی ص 72۔ 30) فرماتے ہیں کہ بعض اوقات سرپرست کمزور بھی ہوتا ہے جو کہ مدد کرنے کے قابل نہیں ہوتا، مگر نصیر وہ ہوتا ہے جو فی الواقع مدد کے قابل ہو، دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ولی وہ ہوتا ہے جو زبانی طور پر مدد کرتا ہے، اور نصیر وہ ہے جو عملی طور پر مددگار ثابت ہو، گویا اللہ تعالیٰ ان دونوں صفات کا مالک ہے وہ اپنی مخلوق کا ہر طرح مددگار ہے وہ قادر مطلق بھی ہے اور علیم کل بھی ہے جونسا حکم چاہے، نافذ کر دے اور جسے چاہے منسوخ کر دے اس کے ارادہ اور قدرت میں کوئی دوسرا مخل نہیں ہو سکتا، وہ خود ہی احکام جاری کرتا ہے اور اپنی مشیت سے بعض کو منسوخ کر دیتا ہے اس پر اعتراض نامناسب ہے۔

یہود کا اسلام سے متنفر کرنے کا ایک اور طریقہ

اَمۡ تُرِیۡدُوۡنَ	کیا تم چاہتے ہو	اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا	یہ کہ تم سوال کرو				
رَسُوۡلَکُمۡ	اپنے رسول سے	کَمَا	جس طرح	سُئِلَ	سوال کئے گئے		
مُوۡسٰی	موسیٰ	مِنۡ قَبۡلُ	(اس) سے پہلے				
وَمَنۡ یَّتَبَدَّلِ الۡکُفۡرَ	اور جو اختیار کرلے کفر	بِالۡاِیۡمَانِ	ایمان کے بدلے				
فَقَدۡ ضَلَّ	تو تحقیق وہ بھٹک گیا	سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ﴿۱۰۸﴾	سیدھے راستے سے۔				

اسلام سے متنفر کرنے کا ایک اور طریقہ جو یہود نے اختیار کیا وہ یہ تھا کہ موشگافیاں کر کے طرح

طرح کے سوالات مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے اور انہیں کہتے کہ اپنے نبی سے یہ بات بھی پوچھ کر بتاؤ اور وہ بھی اور یہ بھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا کہ یہود کی تو عادت ہی یہ رہی ہے انہوں نے تو موسیٰ (علیہ السلام) کو مسلسل سوالات اور مطالبے کر کر کے تنگ کر دیا تھا۔ اس طرح کی موشگافیاں کافرانہ روش ہے اور یہ کام ایسے لوگ کرتے ہیں جو اطاعت و فرمانبرداری پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بارہا متنبہ فرمایا کہ قیل و قال اور بال کی کھال اتارنے کی وجہ سے پچھلی امتیں تباہ ہوئیں۔ لہٰذا تم ایسی باتوں سے پرہیز کرو اور جن باتوں کو اللہ اور اس کے رسول نے نہیں چھیڑا ان میں خواہ مخواہ کرید نہ کرو۔ یہود حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بے ہودہ سوالات بھی کرتے اور نامناسب مطالبات بھی، اس آیت میں مسلمانوں کو متنبہ فرمایا گیا کہ جیسے تم یہودیوں کا دیکھا دیکھی اپنی سادگی اور سادہ لوحی میں حضور اقدس حضور ﷺ کو 'راعنا' کہہ کر مخاطب کرنے لگے، ایسا نہ ہو کہ انھیں کی طرح پیغمبر سے سوالات اور مطالبہ بھی شروع کر دو، یہودیوں کو قرآن مجید کے الفاظ و احکام میں 'نسخ' کے واقع ہونے پر بھی اعتراض تھا، تو ایسا نہ ہو کہ ان کے بے جا اعتراضات و شبہات کا تم بھی شکار ہو جاؤ؛ کیوں کہ وہ چاہتے ہی ہیں کہ تم کو دین کی نعمت سے محروم کر دیں، اس تشریح کے مطابق اس آیت کے مخاطب مسلمان ہیں، زیادہ تر مفسرین کی رائے یہی ہے۔ یعنی مشرف بہ ایمان ہونے کے بعد رسول کی شان میں کوئی گستاخی یا اعتراض کر گیا، تو یہ راہِ راست پا کر پھر اس سے محروم ہو جانا ہے۔

بے مقصد اور فضول سوالات سے بچو

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر 152۔ج 1) کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین بہت کم سوال کیا کرتے تھے، کیونکہ سورہ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے کثرت سوال سے منع فرمادیا۔ لَا تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡ اَشۡيَآءَ اِنۡ تُبۡدَ لَـكُمۡ تَسُؤۡكُمۡ ۚ وَاِنۡ تَسۡـَٔلُوۡا عَنۡهَا حِيۡنَ يُنَزَّلُ الۡقُرۡاٰنُ تُبۡدَ لَـكُمۡ ۔ یعنی نزول وحی کے زمانے میں سوال نہ کیا کرو اگر بعض چیزوں کے متعلق سوال کرو گے تو وہ ظاہر کر دیا جائے گا اور تم کو

ناگوار گزرے گا تمہارے لیے بدنامی کا باعث ہوگا، اس لیے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کثرت سوال سے اجتناب کرتے تھے۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ" اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں، اور اگر تم اس وقت پوچھو گے جب قرآن نازل ہو رہا ہے، تو وہ تمہارے لیے ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے بہت سی چیزوں کو مباح (جائز) رکھا ہے یا ان کا ذکر نہیں فرمایا۔ اگر انسان خود کھود کرید کر کے ان کے بارے میں ایسے احکامات پوچھ لے جو سختی پر مبنی ہوں، تو وہ خود اپنے لیے تنگی کا باعث بن سکتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہی کا بیان ہے وہ فرماتے ہیں کہ (تفسیر ابن کثیر ص30) کہ میں نے اصحاب محمد ﷺ سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی، وہ حضور ﷺ سے سوال نہیں کیا کرتے تھے، ایسا کرنے سے ڈرتے تھے، ان کی خواہش ہوتی تھی کہ باہر کا کوئی اعرابی سوال کرے تو وہ بھی مستفید ہوں، خود سوال کرنے میں بہت محتاط ہوتے تھے، قرآن پاک میں کل بارہ (12) سوالات کا ذکر آتا ہے، جو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے حضور ﷺ سے کیے، ان میں " یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ "۔ اور یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰى ۔ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ "۔ وغیرہ ایسے سوالات شامل ہیں، حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے (2) (مسلم ص262۔ ج2) اے لوگو فضول اور بے مقصد سوال نہ کیا کرو، کیونکہ پہلی امتیں بھی اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں" ۔کثرت سوال کی وجہ سے انہوں نے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام سے اختلاف کیا اور ہلاک ہوئے، لہذا کثرت سوال سے بچو۔

کسی مسئلہ کی تحقیق کیلئے سوال کرنے کی ممانعت نہیں

ہاں! کسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے یا کسی کام کے جواز یا عدم جواز کے لیے سوال کرنے کی ممانعت نہیں، زیادہ سوال کرنے میں قباحت یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس سوال کا جواب تمہیں ناگوار گزرے یا بدنامی کا باعث ہو، اکثر سوال محض نکتہ چینی یا ایذارسانی کے لیے کیے جاتے ہیں اس لیے منع کیا کہ اے اہل ایمان! تم یہود کی روش پر نہ چلنا اور کثرت سوال سے اپنے آپ کو

بچانا۔مسلمانوں کو سوالات کی ممانعت کی ایک وجہ یہ تھی کہ اہل کتاب مسلمانوں کو اکساتے تھے کہ اپنے نبی سے یہ سوال پوچھو!اوراس سے ان کا مقصد فتنہ پردازی ہوتا تھا اہل ایمان کو یہ بھی نصیحت ہے،کہ وہ یہودیوں کی باتوں پر اعتماد نہ کریں،پہلے گذر چکا ہے کہ یہ لوگ سحر کرتے تھے،اس کے علاوہ اور بھی فضول باتیں کرتے تھے جس سے مسلمانوں کے دلوں میں شبہ ڈالنا مقصود تھا،تا کہ اہل ایمان اسلام سے دستبردار ہو جائیں،ان کی سازشوں سے محفوظ رہنے کے لیے فرمایا کہ ان پر اعتماد کرتے ہوئے بے معنی سوال نہ پوچھا کرو۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی صحیح مقصد کے بغیر سوال کرنا ممنوع ہے نیز فضول سوال کرنا بھی ممنوع ہے۔لہٰذا عوام الناس کو چاہئے کہ اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ علماء اور مفتیانِ کرام سے وہی سوال کئے جائیں جن کی حاجت ہو،زمین پر بیٹھ کر خواہ مخواہ چاند پر رہائش کے سوال نہ کئے جائیں۔بعض لوگ علماء کو پریشان کرنے یا ان کا امتحان لینے یا ان کی لاعلمی ظاہر کرنے کیلئے سوال کرتے ہیں،یہ سب ناجائز ہے۔حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے،سرکارِ دوعالم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا’’میں تمہیں جس کام سے منع کروں اس سے رک جاؤ اور جس کام کا حکم دوں اسے اپنی طاقت کے مطابق کرو،تم سے پہلے لوگوں کو محض ان کے سوالات کی کثرت اور اپنے انبیاء عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے اختلاف کرنے نے ہلاک کیا۔(مسلم،کتاب الفضائل،باب توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم،ص ۱۲۸۲، الحدیث: ۱۳۰(۱۳۳۷)اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسئلہ معلوم کر کے عمل کرنے کی بجائے خواہ مخواہ بال کی کھال اتارتے رہنا اور اپنے من پسند حکم کا مطالبہ کرنا یہودیوں اور مشرکوں کا طریقہ ہے۔ہمارے معاشرے میں بھی لوگوں کی ایک تعداد ایسی ہے جن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ معاملات یا عبادات میں جو صورت انہیں درپیش ہے اس میں فتویٰ ان کی مرضی اور پسند کے عین مطابق ملے اور اگر انہیں کہیں سے کوئی ایک ایسی دلیل مل جاتی ہے جو ان کے مقصد و مفاد کو پورا کر رہی ہوتی ہے تو وہ اسی پر اڑ جاتے ہیں اگرچہ اس کے خلاف ہزار دلائل موجود ہوں لیکن وہ چونکہ ان کی مراد کے خلاف ہوتے ہیں اس لئے انہیں قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے اور ان کے بارے میں طرح طرح کی الٹی سیدھی تاویلیں پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت عطا فرمائے۔

یہودیوں کا مسلمانوں کے کفر وارتداد کی تمنا کرنا

وَدَّ كَثِيْرٌ	چاہتے ہیں بہت سے	مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ	اہل کتاب میں سے
لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ	کاش وہ لوٹا دیں تمہیں	مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ	تمہارے ایمان لانے کے بعد
كُفَّارًا	کفر کی حالت میں	حَسَدًا	حسد (ہے)
مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ	ان کے دلوں کی طرف سے	مِّنْۢ بَعْدِ	(اس کے) بعد
مَا تَبَيَّنَ	جبکہ واضح ہوگیا	لَهُمُ الْحَقُّ	ان پر حق ہے

فَاعْفُوْا	پس تم معاف کردو	وَاصْفَحُوْا	اور درگزر کردو	حَتّٰى	یہاں تک کہ
يَاْتِيَ اللّٰهُ	لائے اللہ	بِاَمْرِهٖ	اپنا حکم	اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	ہر چیز پر	قَدِيْرٌ ﴿١٠٩﴾	قادر ہے۔

اسلام کی حقانیت جاننے کے بعد یہودیوں کا مسلمانوں کے کفر وارتداد کی تمنا کرنا اور یہ چاہنا کہ وہ ایمان سے محروم ہوجائیں حسد کی وجہ سے تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حسد بہت بڑا عیب ہے اور اس کی وجہ سے انسان نہ صرف خود بھلائی سے رک جاتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی بھلائی سے روکنے کی کوشش میں مصروف ہوجاتا ہے لہٰذا ہر مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اس سے بچنے کی خوب کوشش کرے۔ حضرت ابوہریرہ رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، رسول اللہ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ''حسد سے دور رہو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو'' یا فرمایا: ''گھاس کو کھا جاتی ہے۔'' (ابوداؤ، باب فی الحسد، ۴/ ۳۶۱، الحدیث)

کفار کے نزدیک انسان فُحاشی وبیحیائی کے بغیر مہذب نہیں کہلاسکتا

مستشرقین جنہیں محقق اور ریسرچ سکالر کا نام دیا جاتا ہے، انہوں نے قرآن پاک اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی نکتہ چینی کی ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح مسلمان اپنے دین سے بدظن ہوجائیں، گلیڈسٹون نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں برملا کہا تھا کہ محمد کی کتاب قرآن اور ان کی تلوار انسانیت کی دشمن ہیں (العیاذ باللہ) اس نے قرآن پاک ہاتھ میں لیکر کہا تھا جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود

ہے یہ دنیا مہذب نہیں بن سکتی، لہٰذا اس کی عزت وتوقیر لوگوں کے دلوں سے مٹانا ہوگی، اس کا مطلب یہی تھا کہ قرآن پاک ایک ایسی کتاب ہے جو فحاشی سے روکتی ہے، اور فحاشی اور عیاشی کے بغیر تہذیب نہیں آسکتی ان کفار کے نزدیک انسان فُحاشی وبیحیائی کے بغیر مہذب نہیں کہلا سکتا، لہٰذا ان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے، کہ کسی طرح قرآن پاک کو دنیا سے مٹادیا جائے، مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کرنے اور ان کے دلوں میں شکوک وشبہات کے کانٹے چبھونے کی یہ خواہش آپ ﷺ کے عہد میں تو یہودیوں کو تھی ہی، آج تک وہ اسی سازش میں لگے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان کھل کر مرتد نہ ہوں تو کم سے کم ان میں تشکیک اور اپنے دین کی تئیں بے اعتمادی وبے اعتباری پیدا کردی جائے، مستشرقین کی تمام مساعی کا خلاصہ اس کے سوا اور کیا ہے؟ قرآن مجید نے متنبہ کردیا کہ مسلمان ہمیشہ اس سازش کے بارے میں اپنے کان کھڑے رکھیں اور ان کے مکرو فریب سے اپنا دامن بچائے رکھیں۔

نماز ادا کرنے کے آداب واحکام/ نیکی کا بدلہ نیکی/ رجااور اُمْنِيَّة کی تحقیق وتفسیر

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ
عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ
هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾
بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

نماز اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں شامل ہے

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ	اور تم قائم کرو نماز	وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ	اور تم ادا کرو زکوۃ				
وَمَا تُقَدِّمُوْا	اور جو آگے بھیجو گے	لِاَنْفُسِكُمْ	اپنے نفسوں کیلئے				
مِّنْ خَيْرٍ	کوئی بھلائی	تَجِدُوْهُ	تم اسے پالو گے	عِنْدَ اللّٰهِ	اللہ کے پاس		
اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ	بِمَا	جو کچھ	تَعْمَلُوْنَ	تم عمل کرتے ہو		
بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾	خوب دیکھنے والا ہے۔						

نماز دین اسلام کی سب سے اہم عبادتوں میں سے ایک ہے۔قرآنِ کریم میں بار بار اس کی تاکید کی گئی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ مفسرین نے اس حکم کی مختلف جہات سے وضاحت کی ہے۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا مطلب ہے:" نماز کو اس کے پورے ارکان، شرائط اور آداب کے ساتھ ادا کرو، بعض مفسرین نے نماز کے صحیح قیام کو یوں بیان کیا ہے:" اسے وقت پر ادا کرنا، خشوع کے ساتھ ادا کرنا، ارکان کی تکمیل کرنا اور مسلسل اسے قائم رکھنا، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نماز قائم کرنے کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: یعنی" نماز کو قائم کرنا اس کے رکوع، سجود، تلاوت، خشوع اور پوری توجہ کے ساتھ ادا کرنا ہے۔علمائے کرام کے مطابق نماز نہ صرف بندے اور پروردگار کے درمیان ایک مضبوط تعلق کا ذریعہ ہے بلکہ یہ تمام نیکیوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ابو منصور ماتریدی کے مطابق نماز میں بندگی اور عاجزی کی معراج ہے، جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ نماز میں بندہ" اللہ کے لئے کامل خضوع اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے، نماز کی شرعی حیثیت بھی واضح ہے۔ یہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں شامل ہے اور دین کی بنیادوں میں سے ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو ایمان اور کفر کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا ہے۔نماز کے ظاہری اور باطنی آداب دونوں اہم ہیں؛ ظاہری آداب میں طہارت، قبلہ رخ ہونا، وقت کی پابندی اور ارکان کی درست ادائیگی شامل ہے، جبکہ باطنی آداب میں خشوع، اللہ کی یاد اور دل کی حاضری شامل ہیں۔جس طرح اللہ تعالیٰ کے حضور نماز ادا کرنا فرض ہے' اسی طرح ہر نمازی پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ نماز کی ادائیگی کے دوران قرآن وسنت کے احکام کی پابندی کرے۔صلوٰۃ (نماز) کے معنی ہیں: کسی کی جانب رخ کرکے آگے بڑھنا' اس کے قریب ہوجانا اور دعاء کرنا

نماز کی لفظی ومعنوی حقیقت

لہذا نماز کی لفظی ومعنوی حقیقت تین نکات پر مشتمل ہے۔ ا:- یہ کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں شعوری طور پر بڑھ کر حاضر ہوجانا۔ ۲:- اللہ تعالیٰ کے حضور ہمہ تن متوجہ ہوجانا۔ ۳:- اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوجانا۔نماز کے ان تینوں بنیادی لوازمات کے ساتھ نماز میں اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کے طریقے

کے لئے قرآن وسنت کے احکام کی پابندی بھی لازم وواجب ہے۔ "فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (الماعون: ۴، ۵)" پس تباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے غفلت (عدم توجہی) برتتے ہیں"۔ یہ قرآنی فرمان انتہائی عبرت انگیز اور عبرت آموز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقررہ آداب واحکام سے غفلت والی نمازیں بیکار ہی نہیں، بلکہ نمازیوں کے لئے باعث تباہی بھی ہیں، مثلاً: نمازوں میں غفلت اس بات سے کہ اللہ کے حضور حاضر بھی ہیں اور اس سے مخاطب بھی ہیں، لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے۔ غفلت اس بات سے کہ اپنے رب سے بہت کچھ مانگ رہے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ کیا مانگ رہے ہیں۔ غفلت اس بات سے کہ اللہ کے روبرو عہد وپیمان تو باندھ رہے ہیں لیکن اس کے معنی ومفہوم سے بے خبر ہیں۔ پھر غفلت اس بات سے بھی کہ اپنے آقا کے سامنے مجسم سرنگوں اور سر بسجود تو ہیں مگر خود سپردگی کی اصل روح سے محروم ہیں۔ مختصراً یہ کہ ایسی بے جان اور بے روح نمازیں جو غفلت اور لاپرواہی سے ادا کی جاتی ہیں، وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور توہین کے مترادف ہو جاتی ہے اور بالآخر تباہی کا باعث بن جاتی ہے، اس سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ اپنی نمازوں کا جائزہ لیا جائے پھر جتنی کمی یا کسر پائی جائے اسے پورا کرنے کی کوشش فوراً شروع کی جائے، تاکہ رفتہ رفتہ حق نماز پورا ادا کیا جائے، صرف اس طرح ہی سارے مومنین اس دینی اور دنیوی کامیابی کے حقدار ہو سکیں گے۔

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن

فرمایا: وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ: زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن ہے اور دین اسلام کی بنیادی عبادات میں سے ایک اہم مالی عبادت ہے۔ کتبِ فقہ وحدیث میں اس کی عظمت، فرضیت اور حکمت کو بڑے وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بارہا نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر کیا، یہاں تک کہ بعض اہلِ علم کے مطابق یہ دونوں عبادتیں قرآن میں" بیاسی مقامات" میں اکٹھے آئی ہیں، قرآن میں بھی زکوٰۃ کا مقصد واضح کیا گیا ہے، جیسا کہ آیتِ مبارکہ میں ارشاد ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ۔ یعنی زکوٰۃ انسان کے مال اور نفس دونوں کو پاک

کرتی ہے۔اسی لیے بعض اہلِ علم نے لکھا ہے کہ زکوٰۃ مال میں برکت اور اضافہ کا ذریعہ ہے۔خلاصہ یہ کہ زکوٰۃ: اسلام کا بنیادی رکن ہے۔انسان کے مال اور نفس کو پاک کرتی ہے۔معاشرے سے غربت کم کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔مسلمانوں میں محبت، تعاون اور عدل کو مضبوط کرتی ہے۔مال میں برکت اور اللہ کی رضا کا سبب بنتی ہے زکوٰۃ کا صحیح فہم اور اس کی باقاعدہ ادائیگی ایک مسلمان کی دینی ذمہ داری بھی ہے اور اجتماعی بھلائی کا ذریعہ بھی۔اس آیت میں اہل کتاب کی طرف سے چوکس رہنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے فرائض پر کاربند رہنے کی تلقین بھی فرمائی وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔نماز کو قائم رکھو اور زکوۃ ادا کرتے رہو، تمہاری طاقت کا منبع یہی دو چیزیں ہیں، انہیں مضبوطی سے تھام لو، تمہاری تمام تر قوت کا دارومدار تعلق باللہ پر ہے، اور نماز زکوۃ اس کا مظہر ہے نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں، اسے وقت پر ادا کرتے رہو، اور اگر صاحب نصاب ہو تو زکوۃ ادا کرو، بخل جیسی قبیح بیماری کا یہ بہترین علاج ہے، اسے کبھی نظر انداز نہ کرو، غیر مسلم اقوام مادی ترقی میں پیش پیش ہیں اس معاملہ میں وہ تمہیں اپنے برابر نہیں آنے دیں گی، لہذا تمہاری طاقت کا سرچشمہ مادی وسائل کی بجائے صلوۃ وزکوۃ ہے، انہیں کے ذریعے، اندر ایمان اور روحانیت پیدا ہوگی تعلق باللہ قائم ہوگا جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہے۔

جنت میں داخلے کے زبانی دعوے کرنا جہالت وحماقت ہے

وَقَالُوا	اور انہوں نے کہا	لَنۡ یَّدۡخُلَ	ہرگز نہیں داخل ہوگا	الۡجَنَّۃَ	جنت میں
اِلَّا مَنۡ کَانَ	سوائے جو ہو	ھُوۡدًا	یہودی	اَوۡ نَصٰرٰی	یا نصرانی
تِلۡكَ اَمَانِیُّھُمۡ	یہ ان کی تمنائیں ہیں	قُلۡ	آپ کہہ دیجئے		
ھَاتُوۡا	تم لاؤ	بُرۡھَانَکُمۡ	اپنی دلیل	اِنۡ کُنۡتُمۡ	اگر ہو تم
صٰدِقِیۡنَ ⑪⑪	سچے۔				

لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّۃَ: ہرگز جنت میں داخل نہ ہوں گے۔یہودی مسلمانوں سے کہتے تھے کہ جنت میں صرف یہودی جائیں گے اور عیسائی کہتے تھے کہ صرف وہی جنت میں داخل ہوں گے۔

یہ گفتگو مسلمانوں کو بہکانے کے لئے تھی، ان کی تردید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، جس میں فرمایا گیا کہ ان کی یہ بات ان کی اپنی رائے سے ہے، توریت وانجیل میں ایسا کچھ نہیں فرمایا گیا، اگر وہ سچے ہیں تو اپنی اس بات پر کوئی دلیل لائیں۔

اَمَانِيُّهُمْ : ان کی من گھڑت تمنائیں۔ بغیر کسی بنیاد کے جنت میں داخلے کے زبانی دعوے کرنا جہالت وحماقت ہے۔ ایک امید ہے جسے عربی میں ''رجا'' کہتے ہیں اور ایک خام خیالی ہے جسے عربی میں ''اُمْنِيَّة'' کہتے ہیں۔ امام غزالی رَحْمَةُ اللهِ تَعَالٰی عَلَيْهِ نے اس موضوع پر بڑا پیارا کلام ارشاد فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ آپ رَحْمَةُ اللهِ تَعَالٰی عَلَيْهِ فرماتے ہیں: رجا یعنی امید دل کی اس راحت کا نام ہے جو محبوب چیز کے انتظار سے حاصل ہوتی ہے لیکن یہ محبوب جس کی توقع کی جارہی ہے اس کا کوئی سبب ہونا چاہئے لہٰذا اگر اس کا انتظار اکثر اسباب کے ساتھ ہے تو اسے ''رجا'' یعنی امید کہتے ہیں اور اگر اسباب بالکل نہ ہوں یا اضطراب کے ساتھ ہوں تو اسے امید نہیں بلکہ دھوکہ اور بیوقوفی کہا جائے گا اور اگر اسباب کے ہونے یا نہ ہونے کا علم نہ ہو تو اس انتظار کو ''تمنا'' کہتے ہیں۔ اہلِ دل حضرات جانتے ہیں کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور دل زمین کی طرح ہے، ایمان اس میں بیج کی حیثیت رکھتا ہے اور عبادت زمین کو الٹ پلٹ کرنے، صاف کرنے اور نہریں کھودنے اور ان زمینوں میں پانی جاری کرنے کی طرح ہیں اور دل جو دنیا میں غرق اور ڈوبا ہوا ہے اس بنجر زمین کی طرح ہے جس میں بیج کوئی پھل نہیں لاتا اور قیامت کا دن فصل کاٹنے کا دن ہے اور ہر شخص وہی کاٹے گا جو اس نے بویا ہوگا اور کھیتی کا بڑھنا ایمان کے بیج کے بغیر ناممکن ہے اور جب دل میں خباثت اور برے اخلاق ہوں تو ایمان بہت کم نفع دیتا ہے جیسے بنجر زمین میں بیج سے فصل پیدا نہیں ہوتی تو مناسب یہی ہے کہ آدمی کے مغفرت کی امید رکھنے کو کھیتی والے پر قیاس کیا جائے یعنی جو شخص اچھی زمین حاصل کرتا ہے اور اس میں عمدہ بیج ڈالتا ہے جو نہ تو خراب ہوتا ہے اور نہ ہی بدبودار اور پھر اس کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ ضروریات سے مراد وقت پر پانی دینا، زمین کو کانٹوں اور گھاس پھونس نیز ان تمام خرابیوں سے پاک کرنا جو بیج کو بڑھنے سے روکتی ہیں یا خراب کر دیتی ہیں۔ تو جو یہ سب کام کرے پھر اللہ تعالٰی

کے فضل کا منتظر ہو کر بیٹھ جائے کہ وہ زمین کو بجلی کی گرج اور دیگر آفات سے بچائے گا یہاں تک کہ کھیتی اپنی تکمیل کو پہنچ جائے تو اس انتظار کو رجا یعنی امید کہتے ہیں اور اگر سخت زمین میں بیج ڈالے جو شور زدہ ہو اور بلندی پر ہو جس تک پانی نہیں پہنچ سکتا اور بیج کی پروا بھی نہ کرے اور پھر اس کے کٹنے کا انتظار کرے تو اس انتظار کو بیوقوفی اور دھوکہ کہتے ہیں امید نہیں کہتے اور اگر اچھی زمین میں بیج ڈالا لیکن اس میں پانی نہیں ہے اب وہ بارش کے انتظار میں ہے اور یہ ایسا وقت ہے جس میں عام طور پر بارش نہیں برستی تو اس انتظار کو تمنا کہتے ہیں "رجا" نہیں کہتے تو گویا رجا کا لفظ کسی ایسی پسندیدہ چیز کے انتظار پر صادق آتا ہے جس کے لئے وہ تمام اسباب تیار کر دیئے گئے ہوں جو بندے کے اختیار میں ہیں، صرف وہی اسباب باقی رہ گئے جو بندے کے اختیار میں نہیں ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کی وجہ سے تمام نقصان دہ اور فاسد کرنے والے اسباب کھیتی سے دور ہو جاتے ہیں پس جب بندہ ایمان کا بیج ڈالتا ہے اور اس کو عبادات کا پانی پلاتا ہے، دل کو بداخلاقی کے کانٹوں سے پاک کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کا مرتے دم تک منتظر رہتا ہے، مغفرت تک پہنچانے والے اچھے خاتمے کا انتظار کرتا ہے تو یہ انتظار حقیقی رجا (امید) ہے یہ ذاتی طور پر قابل تعریف ہے اور اگر ایمان کے بیج کو عبادات کا پانی نہ دیا جائے یا دل کو برے اخلاق سے ملوث چھوڑ دیا جائے اور دنیاوی لذت میں منہمک ہو جائے اور پھر مغفرت کا انتظار کرے تو اس کا انتظار ایک بیوقوف اور دھوکے میں مبتلا شخص کا انتظار ہے۔ نبی اکرم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے فرمایا "اَلْاَحْمَقُ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَہٗ ھَوَاھَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللہِ الْاَمَانِیَّ" بے وقوف وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کے پیچھے لاتا ہے اور (اس کے باوجود) اللہ تعالیٰ سے تمنائیں کرتا ہے (کہ وہ بڑا کریم اور غفور و رحیم ہے، اس سے اور اس کے اعمال سے بے پرواہ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اسے کوئی سزا نہیں دے گا بلکہ جنت میں داخل کر دے گا اور وہ اس کی من چاہی چیزیں اسے دے گا)۔

آخرت کی کامیابی اور جنت میں جگہ پانے کا اُصول

بَلٰی	ہاں کیوں نہیں	مَنْ اَسْلَمَ	جس نے جھکا دیا	وَجْھَہٗ	اپنا چہرہ

لِلّٰهِ	اللہ کے لئے	وَهُوَ	اور وہ	مُحْسِنٌ	نیکی کرنے والا (ہو)
فَلَهٗٓ	تو اس کے لئے	اَجْرُهٗ	اس کا اجر		
عِنْدَ رَبِّهٖ	اس کے رب کے پاس ہے	وَلَا خَوْفٌ	اور نہ کوئی خوف ہوگا		
عَلَيْهِمْ	ان پر	وَلَا هُمْ	اور نہ وہ	يَحْزَنُوْنَ ﴿١١٢﴾	غمگین ہوں گے۔

یعنی جنت میں جانے کے لیے کسی گروہ کا فرد ہونا کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ اپنا چہرہ اللہ کے تابع کردے، چہرہ تابع ہوگیا تو پورا جسم تابع ہوگیا، پھر جو عمل کرے اسی کے لیے کرے، کسی دوسرے کا اس میں دخل نہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ عمل حسن (یعنی نیک) ہو، اس کی طرف اشارہ "وَهُوَ مُحْسِنٌ" کے ساتھ ہے۔ نیک عمل وہی ہے جو قرآن وسنت کے مطابق ہو۔

پہلی شرط نہ ہوگی تو منافقت اور ریاکاری ہے، دوسری نہ ہوگی تو بدعت اور گمراہی ہے۔ اس آیت میں للہ تعالیٰ نے آخرت کی کامیابی اور جنت میں جگہ پانے کا اُصول بیان فرمادیا کہ جو بھی اخلاص کے ساتھ اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے، وہ جنت میں جائے گا، اللہ کے احکام کے سامنے سر جھکانے میں یہ بات داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں پر ایمان لائے، یہودی حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان نہیں لائے اور عیسائی پیغمبر اسلام ﷺ پر ایمان نہیں لائے، تو اب اسلام کے آنے کے بعد نہ یہودیت میں نجات باقی رہی نہ عیسائیت میں، نیز ایمان میں ''اخلاص'' بھی ضروری ہے؛ اس لئے منافقین کا ایمان بھی معتبر نہیں کہ یہ اخلاص سے خالی اور محض دیکھاوے کے طور پر ہے، گویا اب اخلاص کے ساتھ مسلمان ہونا ہی جنت میں جانے کی کلید اور دوزخ سے نجات کا ذریعہ ہے۔

یہود ونصاریٰ آمنے سامنے/ بڑا ظالم کون ہے؟/ مسجد کے آداب

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ لَیْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَیْسَتِ الْیَھُوْدُ عَلٰی
شَیْءٍ وَّھُمْ یَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِھِمْ ۚ فَاللّٰہُ
یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ
اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِھَا ؕ اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَھُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْھَآ اِلَّا
خَآئِفِیْنَ ؕ لَھُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَھُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ
وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾

تین گمراہ کُن فرقے

وَقَالَتِ	اور کہا	الْیَھُوْدُ	یہودیوں نے	لَیْسَتِ	نہیں
النَّصٰرٰی	نصاریٰ	عَلٰی شَیْءٍ	کسی چیز پر	وَقَالَتِ	اور کہا
النَّصٰرٰی	نصاریٰ نے	لَیْسَتِ	نہیں ہیں	الْیَھُوْدُ	یہودی
عَلٰی شَیْءٍ	کسی چیز پر	وَھُمْ	حالانکہ وہ	یَتْلُوْنَ	پڑھتے ہیں

الْکِتَابَ	کتاب	کَذٰلِکَ	اسی طرح	قَالَ الَّذِیْنَ	کہا (ان لوگوں نے) جو

لَا يَعْلَمُوْنَ	علم نہیں رکھتے	مِثْلَ قَوْلِهِمْ	ان جیسی بات

فَاللّٰهُ	تو اللہ	يَحْكُمُ	وہ فیصلہ کرے گا	بَيْنَهُمْ	ان کے درمیان

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن	فِيْمَا	جس میں	كَانُوْا	وہ تھے

فِيْهِ	اس میں	يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾	اختلاف کرتے۔

تورات میں مسیح علیہ الصلوٰۃ السلام کی نبوت کا ذکر موجود تھا اور یہودی اسے پڑھتے اور جانتے تھے، اسی طرح انجیل میں موسیٰ علیہ الصلوٰۃ السلام کی نبوت کا ذکر اور تورات پر عمل کا حکم موجود تھا اور نصاریٰ اسے پڑھتے اور جانتے تھے، مگر تعصب اور ضد میں آکر ہر ایک نے دوسرے کے بارے میں کہا کہ وہ سرے سے کسی بھی چیز پر نہیں۔ افسوس! مسلمان بھی جب فرقوں میں تقسیم ہوئے تو ہر ایک نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ دوسرے فرقے کی بات قرآن وسنت کے مطابق ہے، اسے غلط اور اپنے فرقے کی بات کو غلط جانتے ہوئے بھی درست قرار دیا۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

لَا يَعْلَمُوْنَ: علم سے مراد وحی کا علم ہے اور اس سے مراد مشرکین عرب ہیں جو وحی الٰہی کا کچھ علم نہیں رکھتے تھے، یہ لوگ اگرچہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ تاہم اپنے آپ کو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا پیروکار سمجھتے تھے، نماز، روزہ، اپنے دستور کے مطابق بجالاتے تھے صدقات وخیرات کرتے تھے، حج کرتے تھے، حاجیوں کی خدمت کرتے اور ان کے لیے پانی کا بندوبست کرتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ تمام لوگ جو آسمانی ہدایت سے بے بہرہ ہیں، اس میں شامل ہیں، مثلاً دہریے اور بت پرست وغیرہ، ان سب نے بھی یہود ونصاریٰ کی طرح اپنے سوا سب کو سرے ہی سے غلط قرار دیا۔ آخرت کے فیصلہ سے مراد ثواب وعذاب ہے، ورنہ حق وباطل کا فیصلہ تو دنیا میں ہو چکا ہے، اسی کے لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے پیغمبروں کو بھیجا ہے اور ان کے ذریعہ اپنی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ فرمایا، اب ان کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ تینوں فرقے یعنی یہود ونصاریٰ اور مشرک جو ایک دوسرے کو گمراہ کہتے ہیں یہ خود سارے کے سارے گمراہ ہیں، یہودیوں نے حضرت مسیح (علیہ السلام) کو ماننے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ انہیں دجال کہا اور جب

قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) دوبارہ دنیا میں نزول فرمائیں گے، تو اصفہان کے ستر ہزار یہودی جن میں ان کے بڑے بڑے علماء بھی ہوں گے اور پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو ماننے کی بجائے دجال کے پیچھے لگیں گے اور اس کو مسیح سمجھیں گے یہی لوگ حضرت مسیح (علیہ السلام) کو (العیاذ باللہ) دجال سمجھ کر انہیں سولی پر لٹکانے کیلئے لے گئے، ان کم بختوں کا یہ حال ہے یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب کو بتلا دے گا کہ دین میں گمراہی کے کون کون سے امور تم نے شامل کر رکھے تھے۔ گو آج بحث اور مناظروں سے کوئی فرقہ بھی اپنی گمراہی تسلیم کرنے کو آمادہ نہیں ہے۔

اللہ کی مساجد کی رونق اور آبادی کے بجائے ان کو ویران کرنے والے

وَمَنۡ	اور کون	اَظۡلَمُ	بڑا ظالم ہے	مِمَّنۡ مَّنَعَ	اُس سے جو۔ روکے
مَسَاجِدَ اللّٰهِ	اللہ کی مسجدوں سے	اَنۡ	یہ کہ	يُّذۡكَرَ	ذکر کیا جائے
فِيۡهَا	اُن میں	اسۡمُهٗ	اس کا نام	وَسَعٰى	اور وہ کوشش کرے
فِىۡ خَرَابِهَا	اُن کو ویران کرنے میں	اُولٰٓئِكَ	یہی (لوگ ہیں)		
مَا كَانَ	نہیں تھا	لَهُمۡ	ان کے لئے	اَنۡ يَّدۡخُلُوۡهَا	یہ کہ وہاں داخل ہوتے
اِلَّا	مگر	خَآئِفِيۡنَ	ڈرتے ہوئے	لَهُمۡ	ان کے لئے
فِى الدُّنۡيَا	دنیا میں	خِزۡىٌ	رسوائی ہے	وَلَهُمۡ	اور ان کے لئے
فِى الۡاٰخِرَةِ	آخرت میں	عَذَابٌ عَظِيۡمٌ	بڑا عذاب ہے (114)		

جب نصاریٰ یہود پر غالب ہوئے تو انہوں نے یہود کو بیت المقدس میں داخل ہونے اور عبادت کرنے سے روک دیا تھا اور دور نبوی ﷺ میں مشرکین مکہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو کعبہ میں نماز ادا کرنے سے روکتے رہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر عمرہ سے روک دیا۔ اس طرح یہ لوگ اللہ کی مساجد کی رونق اور آبادی کے بجائے ان کی بربادی کے درپے ہوئے اور یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کو قطعاً گوارا نہیں۔ چنانچہ فتح مکہ کے بعد مشرکین مکہ کی یہ پابندی ختم ہوئی اور بیت المقدس کو عہد فاروقی میں مسلمانوں نے عیسائیوں سے آزاد کرا لیا۔ اللہ تعالیٰ کا اس حکم سے منشا یہ

ہے کہ عبادت گاہوں کے متولی خالصتاً اللہ تعالیٰ کی پرستش کرنے والے اور اسی سے ڈرنے والے ہونے چاہئیں تاکہ شریر لوگ اگر وہاں جائیں تو انہیں خوف ہو کہ اگر شرارت کریں گے تو سزا پائیں گے۔ اپنے گروہ کو حق پر اور اپنے سوا سب کو غلط قرار دینے والے یہ سب لوگ غور کریں کہ ظلم کے ناجائز ہونے پر تو سب کا اتفاق ہے، پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے منع کرے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے اور انھیں ویران کرنے کی کوشش کرے۔ یہ کام مشرکین مکہ نے کیا کہ مسلمانوں کو پہلے مکہ سے نکالا، پھر ان کا مکہ میں داخلہ حتیٰ کہ حج و عمرہ کے لیے آنا بند کر دیا۔ ان سے پہلے نصاریٰ کا ٹائٹس کے زمانے میں بیت المقدس پر قبضہ ہوا تو انھوں نے یہودیوں کا داخلہ بیت المقدس میں بند کر دیا، یہ کیسی حق پرستی ہے؟ اَنۡ یُّذۡکَرَ : کہ ذکر کیا جائے۔ ذکر میں نماز، خطبہ، تسبیح ،وعظ، ذکر مصطفےٰ ﷺ نعت شریف اور صالحین کے حالات کا بیان سب داخل ہیں۔ ذکر اللہ کو منع کرنا ہر جگہ ہی برا ہے لیکن مسجدوں میں خصوصاً زیادہ برا ہے کہ وہ تو اسی کام کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ مسجد کو کسی بھی طرح ویران کرنے والا ظالم ہے۔ بلا وجہ لوگوں کو مسجد میں آنے یا مسجد کی تعمیر سے روکنے والا، مسجد یا اس کے کسی حصے پر قبضہ کرنے والا، مسجد کو ذاتی استعمال میں لے لینے والا، مسجد کے کسی حصے کو مسجد سے خارج کرنے والا یہ سب لوگ اس آیت کی وعید میں داخل ہیں۔ البتہ یہ یاد رہے کہ جنبی (یعنی جس پر غسل فرض ہو)، منہ کی بدبو والے، لہسن پیاز وغیرہ بدبودار چیزوں کی بو جس کے منہ سے آ رہی ہو اسے روکنا اس میں داخل نہیں کہ یہ حقیقت میں مسجد سے تکلیف دہ یا نامناسب چیزوں کو دور کرنے کے حکم میں آتا ہے۔

اسی طرح س آیت سے معلوم ہوا کہ کسی جگہ کے مسجد قرار پانے کے لئے اذن عام ضروری ہے کہ ہر مسلمان کو اس میں نماز ادا کرنے کی اجازت ہو کسی کے لئے رکاوٹ نہ ہو؛ البتہ مسجد کی حفاظت و صیانت یا کسی خاص ضرورت و مصلحت کے تحت کچھ اوقات کے لئے مسجدیں بند رکھی جائیں، تو اس میں حرج نہیں، کہ اس کا مقصد اللہ کے ذکر سے منع کرنا نہیں ہے، بلکہ مسجد کی حفاظت وصیانت ہے۔

(اِلَّا خَآئِفِیۡنَ) یعنی ایسے ظالم لوگوں کا اللہ کی مساجد کا متولی ہونا تو درکنار، ان کا تو داخلہ بھی ڈرتے ہوئے ہونا چاہیے کہ انھوں نے کوئی شرارت کی تو سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔ ان کے لیے

دنیا ہی میں ایک رسوائی ہے۔اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سچ ثابت ہوا،یہود ونصاریٰ اور مشرکین تینوں نے اپنے کیے کی سزا پائی،کعبہ اور بیت المقدس کی تولیت مسلمانوں کے قبضے میں آ گئی۔

اللہ کی عبادت سے روکنا بہت بڑا گناہ ہے۔

مسجد میں ادب وتعظیم اور خوف خدا کے ساتھ داخل ہونا چاہیے،نڈر و بیباک ہو کر اور آداب مسجد کو پامال کرتے ہوئے داخل ہونا مسلمان کا کام نہیں۔فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ: دنیا میں رسوائی۔بیت المقدس ویران کرنے والوں کو دنیا میں یہ رسوائی پہنچی کہ قتل کئے گئے،گرفتار ہوئے،جلا وطن کئے گئے۔خلافت فاروقی وعثمانی میں ملک شام ان کے قبضہ سے نکل گیا اور بیت المقدس سے ذلت کے ساتھ نکالے گئے۔مسجدوں اور مسجدوں سے تعلق رکھنے والوں سے نفرت کرنے والوں کو یہ وعید اپنے پیش نظر رکھنی چاہیے۔چونکہ مسجدیں اللہ کی ہیں اور حق یہ ہے کہ ان میں صرف اللہ کا نام لیا جائے،اس لیے تمام مشرکین کو مسجد حرام کے قریب آنے سے روک دیا گیا،خواہ وہ بت پرست ہوں یا عزیر ومسیح پرست،کیونکہ وہ اکیلے اللہ کی عبادت نہیں کرتے۔اب مسلمانوں میں وہی پہلی قوموں والے مشرکانہ عقائد واعمال پھیل گئے اور وہ بدعمل ہو کر جہاد چھوڑ بیٹھے،تو بیت المقدس پھر ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دوبارہ توحید وسنت اور جہاد فی سبیل اللہ پر گامزن فرمائے اور بیت المقدس کی تولیت کا شرف عطا فرمائے۔جو لوگ خلوص نیت سے عبادت کے لیے مساجد میں داخل ہوں۔انہیں کسی وقت بھی مساجد میں داخل ہونے سے روکنا نہیں چاہیے۔کیونکہ اللہ کی عبادت سے روکنا بہت بڑا گناہ ہے۔

اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات سے لاپرواہی

مسجد اللہ کا گھر ہے،جہاں بندہ اپنے رب کے سامنے حاضر ہوتا ہے،ذکر وعبادت کرتا ہے اور سکون پاتا ہے۔اسی وجہ سے علما نے مساجد کے لیے ایسے آداب بیان کیے ہیں جن کا مقصد ان مقدس مقامات کی حرمت،صفائی،وقار اور روحانیت کو برقرار رکھنا ہے۔مسجد اللہ کا گھر اور انتہائی مقدس جگہ ہے، جس کے آداب میں پاکیزہ لباس،دائیں پاؤں سے داخل ہو کر دعا پڑھنا،بلند آواز سے گریز،خاموشی،

تحیۃ المسجد (دو نفل) ادا کرنا، بدبو دار چیزیں (پیاز/لہسن) کھا کر نہ جانا، اور صفائی کا خیال رکھنا شامل ہے۔ مسجد کا احترام ایمان کا حصہ ہے۔ مسجد میں ہم احکم الحاکمین کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں، لہٰذا لازم ہے کہ نہایت باادب رہیں۔ ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہیں۔ کوئی ممنوع کام نہ کریں یعنی دنیاوی معاملات، خرید و فروخت، ہنسی مذاق، شور و غل وغیرہ نہ کریں۔ بلند آواز سے دنیاوی بات چیت تو کسی طرح بھی مسجد کے شایانِ شان نہیں۔ اس سے نہ صرف اللہ و رسول ﷺ کی حکم عدولی ہوتی ہے بلکہ حاضرین مسجد کی عبادت میں خلل پڑتا ہے اور مسجد کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ رویہ اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات سے لاپرواہی کے مترادف ہے۔

سمت کا تعین، مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی

وَلِلّٰهِ	اور اللہ کے لیے	الْمَشْرِقُ	مشرق	وَالْمَغْرِبُ	اور مغرب
فَاَيْنَمَا	پس جس طرف	تُوَلُّوْا	تم منہ کرو	فَثَمَّ	تو اس طرف
وَجْهُ اللّٰهِ	اللہ کی ذات (ہے)	اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ		
وَاسِعٌ	وسعت والا	عَلِيْمٌ	بہت جاننے والا۔(115)		

اس آیت کا مطلب یہ نہیں کہ نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری نہیں، بلکہ مراد خاص صورتوں میں قبلہ کی پابندی ختم کرنا ہے، کیونکہ اس سے پہلے ان ظالموں کا ذکر ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکتے ہیں، یعنی ان ظالموں کی اللہ کی مسجدوں سے روکنے اور انھیں ویران کرنے کی کوشش اللہ تعالیٰ کی عبادت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے، سو انسان کو قبلہ کی طرف رخ کرنے میں اگر کوئی دشواری ہو، دشمن کا خوف ہو یا قبلہ معلوم نہ ہو سکے تو جس طرف منہ کر کے نماز پڑھ لے درست ہے۔ (سنن ابی داوٗد، کتابُ صلٰوۃِ السَّفَرِ) اس آیت میں بتلانا یہ مقصود ہے کہ کوئی بھی سمت اپنی ذات میں کسی تقدس کی حامل نہیں، کسی بھی جگہ یا کسی بھی سمت میں اگر کوئی تقدس آتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے آتا ہے، مشرق و مغرب سب اللہ کی مخلوق اور اسی کی تابع فرمان ہیں، اللہ تعالیٰ کسی ایک جہت میں محدود نہیں وہ ہر جگہ

موجود ہے؛ چنانچہ وہ جس سمت کی طرف رخ کرنے کا حکم دیدے بندوں کا کام ہے کہ اسی حکم کی تعمیل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جگہ ہو جہاں قبلے کی صحیح سمت پتہ نہ چل رہی ہو تو وہاں وہ اپنے اندازے سے جس سمت کو قبلہ سمجھ کر نماز پڑھے گا اس کی نماز ہو جائے گی یہاں تک کہ اگر بعد میں پتہ چلے کہ جس رخ پر نماز پڑھی ہے وہ صحیح رخ نہیں تھا تب بھی نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس شخص نے اپنی طاقت کے مطابق اللہ کے حکم کی تعمیل کرلی۔ مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی ہے۔ اگر آئندہ اللہ تعالیٰ دوبارہ بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیدے تو یہ بات نہ قابل تعجب ہونی چاہیے نہ قابل اعتراض۔

اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے / سُبۡحٰنَہٗ کی تحقیق وتفسیر

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ○ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○
وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ۙ سُبۡحٰنَہٗ ؕ بَلۡ لَّہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ کُلٌّ لَّہٗ
قٰنِتُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ
فَیَکُوۡنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ لَوۡلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ اَوۡ تَاۡتِیۡنَاۤ اٰیَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ
الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِہِمۡ ؕ تَشَابَہَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ قَدۡ بَیَّنَّا الۡاٰیٰتِ لِقَوۡمٍ
یُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾

اہل کتاب کے غلط عقائد کی بحث

وَقَالُوا	اور انھوں نے کہا	اتَّخَذَ	بنالیا ہے	اللّٰہُ	اللہ نے
وَلَدًا	بیٹا	سُبۡحٰنَہٗ	وہ پاک ہے اس سے	بَلۡ لَّہٗ	بلکہ اسی کے لیے ہے
مَا	جو	فِی السَّمَاوَاتِ	آسمانوں میں (ہے)	وَالۡاَرۡضِ	اور زمین (میں ہے)
کُلٌّ لَّہٗ	سب اسی کے لئے	قَانِتُوۡنَ	فرمانبردار۔(116)		

اہل کتاب کے غلط عقائد کی بحث مسلسل چلی آرہی ہے ان آیات میں ان کی ایک اور بدعقیدگی کا بیان ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا ہے" وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا ۔اس غلط عقیدے میں یہ تینوں گروہ شامل ہیں یعنی یہود، نصاری اور مشرکین" قَالُوا "کی ضمیر ان تینوں کی طرف لوٹتی ہے

یعنی یہودیوں نے حضرت عزیر عَلَيْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو خدا کا بیٹا مانا جبکہ مشرکین عرب نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا جیسا کہ تینوں چیزیں قرآن پاک میں مذکور ہیں۔اس باطل عقیدے کے رد میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "سُبْحٰنَهٗ" اللہ کی ذات پاک ہے مبرا اور منزہ ہے، بیٹے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا دو وجوہ سے معیوب ہے اگر بیٹا غیر جنس کا ہو تو یہ انسان کے لیے عیب ہے اور اگر ہم جنس ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے عیب ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور یگانگت کے خلاف ہے۔مخلوق کے لیے اولاد کا ہونا اس لیے معیوب نہیں کہ مخلوق عاجز ہے اسے اولاد کی ضرورت ہے، خاص طور پر انسان اولاد کے بڑے مشتاق ہوتے ہیں اولاد کی عدم موجودگی میں انہیں سلسلہ نسب منقطع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ وہ آخری عمر میں خدمت سے محروم ہوتے ہیں، برخلاف اس کے اللہ تعالیٰ تو "اَحَد" ہے، اس کی صفت تو غنی ہے، وہ "صَمَد" ہے وہ ہر ایسی چیز سے بے نیاز ہے لہذا اس کی طرف اولاد کی نسبت کرنا بہت بری بات ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے

یہ حقیقت بھی قابل غور ہے کہ اولاد کی پیدائش اس کے باپ کے مادہ سے ہوتی ہے جو اس کے جسم سے الگ ہو کر رحم مادر میں منتقل ہوتا ہے اور پھر وہ بچے کی صورت میں ماں کے جسم سے علیحدہ ہوتا ہے تو اس قسم کی تولید کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا بہت قبیح حرکت ہے کیونکہ اللہ جل شانہ ہر ایسی چیز سے منزہ ہے "سُبْحٰنَهٗ" سے یہی مراد ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت کیا کہ حضرت اللہ اکبر "۔کا معنی تو ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا ہے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ"۔کا مطلب بھی سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں "اَلْحَمْدُ لِلّٰه" کا معنی یہ ہے کہ سب حمد وثنا اور تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے حضرت سُبْحٰنَهٗ کا مطلب آپ سمجھا دیں، آپ نے جواب دیا یہ کون سی مشکل بات ہے۔"سُبْحٰنَ اللہ" ایک ایسا کلمہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے منتخب فرمایا ہے اور فرشتوں کو بھی حکم دیا ہے کہ اس کلمے کے ساتھ میری تعریف کیا کرو،

الغرض، یہ چاروں کلمات یعنی" اللہ اکبر ، لا الہ الا اللہ "۔ الحمد للہ اور سبحن اللہ" ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف کے لیے مقرر فرمائے ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے تمام تعریفیں اسی ذات کے لیے ہیں۔

زمین وآسمان کی ہر مخلوق خدا کی مملوک

دوسرے یہ کہ اللہ آسمان وزمین کا مالک ہے، جس میں عزیرؑ مسیح علیہما السلام اور فرشتے سب شامل ہیں۔ مالک اور مملوک باپ بیٹا کیسے ہو سکتے ہیں! بیٹا تو باپ کا مملوک بن بھی جائے تو خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔ تیسرا یہ کہ بیٹا سرکشی بھی کرسکتا ہے، جب کہ آسمان وزمین میں رہنے والے سب اللہ کے فرمان کے تابع ہیں، ان کا سانس بھی اس کے حکم کے بغیر نہیں چلتا۔ ایک حدیث صحیح قدسی میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بنو آدم نے مجھے جھٹلایا اور گالی دی۔ اس کا جھٹلانا تو یہ ہے کہ میں اسے دوبارہ پیدا نہ کرسکوں گا اور اسکا گالی دینا یہ ہے جو اس نے میرے لیے بیوی اور بیٹا تجویز کیا۔ (بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورہ اخلاص) الغرض! زمین وآسمان کی ہر مخلوق خدا کی مملوک اور ہر چیز اس کی ملکیت ہے خواہ انبیا ہوں یا ملائکہ۔ خواہ اللہ کے نیک بندے اور دیگر اشیا۔ لہذا یہ سب خدا کے مملوک ہوئے تو پھر اس کے بیٹے کس طرح بن سکتے ہیں۔ نیز بیٹے کی ضرورت تو اس کو ہوتی ہے جو محتاج ہو اور فانی ہوتا کہ اس کا نام زندہ رہے اور اس کا کوئی وارث ہو سکے تو اللہ تعالیٰ تو محتاج نہیں اور نہ وہ فانی ہے وہ زمین وآسمان کا تنہا مالک اور بادشاہ ہے۔ زمین وآسمان کے تمام اختیارات اس کے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ " بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ "۔ آسمان وزمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، یعنی یہ تمام چیزیں مملوک ہیں اور اللہ جل شانہ ان کا مالک ہے گویا اللہ تعالیٰ اور انسان میں باپ اور بیٹے کی نسبت نہیں ہے بلکہ مالک اور مملوک کی نسبت ہے اور پھر مالک بھی ایسا ہے جسے ہر قسم کا اختیار حاصل ہے اور اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔

تکوینی حکم کی خلاف ورزی کی کسی میں مجال نہیں

"كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ"۔سب اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں اس کے تکوینی حکم کی خلاف ورزی کی کسی میں مجال نہیں وہ کسی کو بیمار کردے، بیمار کو تندرست کردے کسی پر موت طاری کردے، اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا کائنات کی ہر چیز کو اس کی فرمانبرداری کرنا ہوگی،(اسلامی اور قرآنی اصطلاح میں تکوینی حکم سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ حتمی اور تخلیقی فیصلہ ہے جو کائنات کے نظام، پیدائش، موت اور طبعی قوانین کو چلانے سے متعلق ہے، یہ حکم کائنات میں براہِ راست نافذ ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کے ہونے کا ارادہ فرماتا ہے تو تکوینی حکم کے تحت وہ چیز فوراً وجود میں آجاتی ہے) ہاں شریعت کے احکام ایسے ہیں جسے انسان ٹال سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے نماز پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو، جہاد کرو، انسان ان احکام پر عملدرآمد میں کوتاہی کرسکتا ہے سستی کرسکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے تکوینی حکم کے سامنے سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑے گا جب موت کے فرشتے آجاتے ہیں تو پھر کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو ٹال سکے، خود مرنے والا اور اس کے سارے حمایتی دیکھتے، رہ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا تکوینی حکم پورا ہو جاتا ہے، گویا یہاں پر اللہ تعالیٰ کی دو صفات کا ذکر ہوا، اول یہ کہ وہ ہر چیز کا مالک ہے اور دوسری یہ کہ وہ ہر چیز کا متصرف بھی ہے جو چاہے کرے اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔ اس لیے اسے کسی نائب یا وارث کی ضرورت نہیں كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۔زمین وآسمان کی ساری مخلوق جن میں حضرت عزیر حضرت مسیح اور ملائکہ کرام بھی شامل ہیں سب خدا کے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔

بے پناہ قدرت، لامحدود اختیار اور مطلق حاکمیت

بَدِيْعُ	پیدا کرنے والا	السَّمٰوٰتِ	آسمانوں	وَالْاَرْضِ	اور زمین کو
وَاِذَا	اور جب	قَضٰٓى	وہ فیصلہ کرلے	اَمْرًا	کسی کام کا
فَاِنَّمَا	تو بیشک	يَقُوْلُ	وہ کہتا ہے	لَهٗ	اس کو
كُنْ	ہوجا	فَيَكُوْنُ		تو وہ ہوجاتا ہے۔(117)	

بَدِيْعُ بمعنی "مُبْدِعٌ"، یعنی ایسی چیز کو وجود میں لانے والا جس کی پہلے کوئی نظیر موجود نہ ہو، نہ

اس کا وجود موجود ہوا ور نہ کوئی نمونہ اور یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ہو سکتی ہے۔ یہ محض سمجھانے کا طریقہ ہے، ورنہ اللہ کسی چیز کو وجود میں لانے کے لئے کسی کلمہ کے کہنے کے بھی محتاج نہیں جس چیز کا ارادہ فرماتے ہیں، وہ وجود میں آجاتی ہے۔ " وَاِذَا قَضٰٓى اَمۡرًا "۔ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے " فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ"۔ تو وہ کہتا ہے ہو جا "فَيَكُوۡنُ پس وہ ہو جاتی ہے، یہ آیتِ مبارکہ اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قدرت، لامحدود اختیار اور مطلق حاکمیت کو بیان کرتی ہیں کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہوتا ہے، وہ محض اس کے حکم اور ارادے کا محتاج ہے یہ کن ایسا لفظ ہے جس میں سرعت اور تیزی کا حکم پایا جاتا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ کن فرماتے ہیں تو کسی چیز کے معرض وجود میں آنے کے لیے نہ کسی مادے کی ضرورت پڑتی ہے نہ ڈیزائن مطلوب ہوتا ہے اور نہ کسی کاریگر یا مددگار کی مدد درکار ہوتی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم صادر ہوتے ہی کام ہو جاتا ہے، دراصل یہ کن کا لفظ بھی محض تعبیر کے لیے ہے ورنہ اس کی بھی ضرورت نہیں جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرمالیتے ہیں کہ کون سی چیز کس سطح پر مطلوب ہے تو وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ اور اس آیت سے اصل مراد یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی شے کا ارادہ فرمائے اور وہ نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ قطعی طور پر نافذ ہوتا ہے اور کسی شے کو وجود میں لانے کیلئے اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی طرح محنت و مشقت کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا اس چیز کے وجود کا ارادہ فرمالینا ہی کافی ہے۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی کام میں کسی کا محتاج نہیں اور اللہ تعالیٰ کا مختلف کاموں کیلئے فرشتوں کو مقرر کرنا حکمت ہے حاجت نہیں۔

جاہل لوگوں کے مطالبات

وَقَالَ	اور کہا	الَّذِيۡنَ	(اُن لوگوں نے) جو		
لَا يَعۡلَمُوۡنَ	نہیں علم رکھتے	لَوۡلَا	کیوں نہیں		
يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ	بات کرتا ہم سے اللہ	اَوۡ تَاۡتِيۡنَآ	یا (کیوں نہیں) آتی ہمارے پاس		
اٰيَةٌ	کوئی نشانی	كَذٰلِكَ	اسی طرح		
قَالَ الَّذِيۡنَ	کہا (تھا) (ان لوگوں نے) جو	مِنۡ قَبۡلِهِمۡ	ان سے پہلے تھے		

مِّثْلَ قَوْلِهِمْ	مانندان کے قول کے	تَشَابَهَتْ	ایک جیسے ہو گئے
قُلُوْبُهُمْ	ان کے دل	قَدْ بَيَّنَّا	تحقیق ہم نے بیان کر دیں
الْاٰيٰتِ	نشانیاں	لِقَوْمٍ	قوم کے لئے	يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾	(جو) یقین رکھتے ہیں۔

اس آیت کی ایک تفسیر یہ ہے کہ یہودیوں نے حضور پرنور صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے کہا کہ اگر آپ اپنے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ سے فرمایئے کہ وہ ہم سے کلام کرے تاکہ ہم خود اس کا فرمان سن لیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان سے پہلے یہودیوں نے بھی حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے ایسی ہی بات کہی تھی۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ نے حضور اقدس صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ جس طرح فرشتوں اور انبیاء کرام عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے کلام فرماتا ہے اس طرح خود ان سے آپ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی نبوت کے متعلق کیوں کلام نہیں فرماتا تاکہ ہمیں یقین ہو جائے کہ آپ نبی ہیں اور ہم آپ پر ایمان لے آئیں یا ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی کیوں نہیں آجاتی جس سے ہمیں آپ کی صداقت معلوم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان مشرکوں سے پہلے کفار نے بھی اپنے رسولوں سے ایسی ہی بات کہی تھی۔ (درمنثور)

زمانہ قدیم کے گمراہ اور موجودہ دور کے گمراہوں میں فرق

یعنی اس قسم کے مطالبات جاہل لوگ کیا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود ہمارے پاس آ کر بتائے کہ یہ واقعی میرا رسول ہے یا کوئی ایسی واضح علامت یا معجزہ ہمیں دکھلائے جس سے ہمیں یقین آجائے۔ اسی صورت میں ہم ایمان لا سکتے ہیں۔ یہ سب جہالت کی باتیں ان میں سے اکثر ناممکن العمل ہیں۔ پہلے لوگ بھی ایسے مطالبے کرتے رہے اور آج بھی جاہل لوگ اسی طرح کے مطالبے کر رہے ہیں۔ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ: ان کے دل آپس میں مل گئے۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے اقوال کا گزشتہ منکرین کے اقوال کے مطابق ہونا ان کے دلوں کی سختی اور کفر کے ایک دوسرے سے مشابہ ہونے کی علامت ہے۔ اس میں نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو تسلی دی گئی کہ آپ

جاہلوں کی سرکشی اور معاندانہ انکار سے رنجیدہ نہ ہوں۔ پچھلے کفار بھی اپنے انبیاء علیہم الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے ساتھ ایسا ہی کرتے تھے، جیسے یہودیوں نے حضرت موسیٰ عَلَيْهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے کہا تھا کہ ہم آپ کی بات نہ مانیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو اعلانیہ نہ دیکھ لیں۔ مطلب یہ ہے کہ مزاج کے لحاظ سے پہلے زمانہ کے گمراہوں اور ان گمراہوں میں کچھ فرق نہیں۔ ایسے جاہل لوگ ایک ہی قسم کے اعتراضات اور مطالبات پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے ایمان لانا ہو ان کے لیے تو ہماری نشانیوں کی کوئی کمی نہیں۔ ایک ایک آیت پر ان کا ایمان پختہ سے پختہ تر ہوتا جاتا ہے اور جو لوگ کفر پر اڑے رہنا چاہتے ہیں انہیں البتہ کوئی نشانی نظر نہیں آتی۔ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ آیات کے معنیٰ 'دلائل' بھی ہیں اور 'نشانیاں' بھی، دونوں طرح ترجمہ کیا گیا ہے، 'دلائل' کا لفظ علمی دلائل اور حسی معجزات دونوں کو شامل ہے۔

حسی معجزات کا معنیٰ ومطلب

حسی معجزات معنیٰ ومطلب: یہ وہ غیر معمولی اور مافوق الفطرت واقعات ہوتے ہیں جو قوانین فطرت کے خلاف انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد انسانی حواس (دیکھنے، سننے یا چھونے) کو براہ راست متاثر کر کے عجز پیدا کرنا اور یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ یہ قوت عام انسانی بس سے باہر ہے۔ اہمیت: یہ ابتدائی دور کے انسانوں اور مادی ذہن رکھنے والوں کے لیے فوری اور اٹل ثبوت کے طور پر کام کرتے ہیں۔ مثال: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا کا اژدہا بننا، یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مادرزاد اندھوں کو بینائی دینا۔

علمی دلائل معنیٰ ومطلب

علمی دلائل معنیٰ ومطلب ایسے ٹھوس اور عقلی دلائل جو منطق، فلسفہ، مشاہدے اور سائنسی حقائق پر مبنی ہوں ان کا مقصد انسان کے دل و دماغ کو مطمئن کرنا، شبہات کا ازالہ کرنا اور حقائق کو براہِ راست عقل کی عدالت میں ثابت کرنا ہے۔ اہمیت: ان کا دائرہ کار ہمیشہ باقی رہنے والا ہوتا ہے۔ یہ دلیل اور شعور کی بنیاد پر کسی نظریے کی سچائی کو منواتے ہیں۔ مثال: قرآنِ مجید کی آیات اور فلسفیانہ وکلامی

براہین جو کائنات کی تخلیق، توحید اور اخلاقیات پر عقلی دلائل دیتے ہیں۔

حسی معجزات آنکھوں دیکھے سحر کی طرح فوری اور عارضی اثر رکھتے ہیں، جبکہ علمی دلائل دیرپا اور فکری تبدیلی لاتے ہیں۔ روایتی مذہبی تاریخ میں ابتدائی طور پر حسی معجزات کا سہارا لیا گیا تاکہ مخالفین کو فوری طور پر قائل کیا جاسکے لیکن بعد ازاں انسانی شعور اور ارتقاء کے ساتھ علمی دلائل کو فوقیت دی گئی تاکہ انسان عقل و فہم کی بنیاد پر حق کو قبول کرے۔

بہرحال یہ نشانیاں ان لوگوں کو نظر آتی ہیں، جو یقین رکھتے ہیں اور جن کے دل میں ایمان کی دولت موجود ہے وہ سمجھ چکے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں۔ یاد رہے کہ کفار سے معاشرت، لباس اور وضع قطع میں بھی مشابہت کرنا منع ہے کہ ظاہر باطن کی علامت ہوتا ہے اور ظاہر کا باطن پر اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا کفار کے طور طریقے سے بالکل دوری اختیار کی جائے تاکہ ان کا ظاہر مسلمان کے باطن کو متاثر نہ کرے۔

ہدایت الٰہی ہی اصل ہدایت ہے/ تلاوتِ قرآن کے ظاہری اور باطنی آداب

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ
تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ
هُوَ الْهُدٰى ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ
اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۗ أُولٰٓئِكَ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

کفار کی ایذا رسانیوں اور مشکلات کے موقعوں پر دلی تسلی

اِنَّآ	بیشک ہم نے	اَرْسَلْنٰكَ	بھیجا آپ کو	بِالْحَقِّ	حق کے ساتھ
بَشِيْرًا	خوشخبری دینے والا	وَّنَذِيْرًا	اور ڈرانے والا	وَّلَا	اور نہیں
تُسْـَٔلُ	آپ سے پوچھا جائے گا	عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾	دوزخ والوں کے بارے میں		

جب کوئی شخص تمام تر نشانیاں دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لائے تو یقینا دل میں افسوس پیدا ہوگا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ یہی معاملہ تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا ”اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ

بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا "۔اے پیغمبر ﷺ ہم نے آپ کو حق کے ساتھ نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے آپ اپنی امت کے لیے بشیر اور نذیر ہیں یعنی آپ اہل ایمان کو جنت کی خوشخبری سناتے ہیں اور منکرین کو دوزخ کی وعید بھی سناتے ہیں جو لوگ آپ کا انکار کرتے ہیں وہ لازماً اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے آپ ان کی حرکات پر غمگین نہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں مختلف مقامات پر اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کو کفار کی ایذا رسانیوں اور مشکلات کے موقعوں پر دلی تسلی اور حوصلہ عطا فرمایا۔اس کا بنیادی مقصد آپ ﷺ کے قلبِ مبارک کو اطمینان دلانا اور مشکلات پر صبر کی تلقین کرنا تھا، اور نہ ہی ان کے دوزخ میں جانے پر کوئی قلق محسوس کریں، کیونکہ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ "۔آپ سے دوزخیوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا کہ یہ لوگ جہنم میں کیوں گئے، بلکہ الٹا ان سے سوال ہوگا، "مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ اللہ تعالیٰ پوچھے گا تمہاری جہنم رسید ہونے کی کیا وجہ تھی پھر وہ خود ہی اس کا جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے مسکین سے ہمدردی نہیں کرتے تھے فضولیات میں لگے رہتے تھے اور روز قیامت کی تکذیب کرتے تھے، لہذا آپ ان کی حرکات سے دل برداشتہ نہ ہوں۔الغرض! حضور پرنور صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ جنت کی خوشخبری دینے والے اور دوزخ سے ڈرانے کی خبریں دینے والے ہیں۔آپ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ کی تبلیغ کے باوجود اگر کوئی جہنم کی راہ جاتا ہے تو اس کے متعلق آپ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ سے سوال نہ ہوگا کہ وہ کیوں ایمان نہ لایا، اس لیے کہ آپ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ نے اپنا فرضِ تبلیغ پورے طور پر ادا فرما دیا۔

لفظ "ملت" کی وضاحت

وَلَنْ تَرْضٰى	اور ہرگز نہیں راضی ہوں گے	عَنْكَ الْيَهُوْدُ	آپ سے یہودی				
وَلَا النَّصٰرٰى	اور نہ عیسائی	حَتّٰى	یہاں تک کہ	تَتَّبِعَ	آپ پیروی کریں		
مِلَّتَهُمْ	ان کے دین کی	قُلْ	آپ کہ دیجئے	اِنَّ	بیشک		
هُدَى اللّٰهِ	اللہ کی ہدایت	هُوَ الْهُدٰى	وہی ہدایت ہے				

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ	اور البتہ اگر آپ نے پیروی کی	اَھْوَآءَھُمْ	ان کی خواہشات کی
بَعْدَ الَّذِیْ	(اس کے) بعد جو	جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ	آگیا آپ کے پاس علم
مَا لَكَ	نہیں ہوگا آپ کیلئے	مِنَ اللّٰهِ	اللہ سے (بچانے والا)
مِنْ وَّلِیٍّ	کوئی حمایتی	وَّلَا نَصِیْرٍ ⑫⓪	اور نہ کوئی مددگار۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی"۔ یہودی اور نصرانی آپ پر ہرگز راضی نہیں ہوں گے "حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ"۔ جب تک کہ آپ ان کی ملت کا اتباع نہ کریں ان کا مذہب اختیار نہ کریں، ان کا طریقہ نہ اپنائیں لفظ لَنْ تاکید نفی کے لیے آتا ہے، یعنی ہرگز راضی نہیں ہوں گے اہل کتاب کو حق بات سے کوئی سروکار نہیں ہے یہ تو مسلمانوں کو اپنے دین سے منحرف کرنا چاہتے ہیں یہ خود ہدایت قبول نہیں کریں گے، اہل کتاب کی جملہ خرابیاں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آخری بات کی کہ آپ ان سے کوئی امید وابستہ نہ کریں کہ شاید یہ ایمان لے آئیں گے بلکہ یہ تو الٹا مسلمانوں کو اپنے دین پر لانا چاہتے ہیں جو کہ ناممکن ہے۔ اس آیت میں ملت سے مراد وہ دین نہیں جو تورات میں یا انجیل میں مذکور ہے بلکہ وہ دین ہے جس میں وہ سب خرافات بھی شامل ہیں جنہیں ان لوگوں نے دین سمجھ رکھا ہے اور وہ رنگ ڈھنگ بھی جو یہ لوگ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ (لفظ "ملت" کی وضاحت: قرآنِ مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے (جیسے مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا)۔ اگرچہ عام بول چال میں اسے "قوم" کے مترادف سمجھا جاتا ہے، لیکن اصطلاحی طور پر قوم کی بنیاد علاقائی یا نسلی ہوتی ہے، جبکہ ملت کی بنیاد ہمیشہ نظریہ اور مذہب پر ہوتی ہے۔ اور ایک ہی نظریے اور عقیدے پر چلنے والے لوگوں کا مجموعہ ملت کہلاتا ہے۔ عربی لغت میں ملت ایسی طے شدہ اور معلوم راہ کو کہتے ہیں جس پر انسان گامزن ہو یعنی ملت کا بنیادی مفہوم مذہب، شریعت اور احکاماتِ الٰہی کا مجموعہ ہے۔ جیسے "ملتِ ابراہیمی" یا "ملتِ اسلامیہ"۔

اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے اور اسی کی پیروی کرنا ہے

لہٰذا انہیں خوش رکھنے کی فکر چھوڑ دیجئے کیونکہ جب تک آپ عقائد و اعمال کی انہیں گمراہیوں

میں مبتلا نہ ہو جائیں جن میں یہ پڑے ہوئے ہیں اس وقت تک ان کا آپ ﷺ سے راضی ہونا محال ہے ۔اللہ کی طرف سے ہدایت ہر زمانہ میں اس زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ہی آتی ہے اور وہی ہدایت معتبر ہوتی ہے جو اس زمانہ کا نبی لائے ۔سو اس دور میں اللہ کی ہدایت قرآن میں ہے اور اسی پر سب کو ایمان لانا ضروری ہے ۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ ﷺ کے پاس تورات کا ایک نسخہ لے کر آئے اور کہنے لگے ۔ یارسول اللہ ﷺ یہ تورات کا نسخہ ہے ۔آپ ﷺ چپ رہے ۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے پڑھنا شروع کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کا چہرہ متغیر ہوتا چلا جا رہا تھا۔حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا تجھے گم کرنے والیاں گم کریں کیا تم رسول اللہ ﷺ کی طرف نہیں دیکھتے ؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب آپ ﷺ کے چہرہ میں غصہ کے آثار دیکھے تو کہنے لگے کہ میں اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ کے غضب سے پناہ مانگتا ہوں ۔ہم اللہ کے پروردگار ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہوئے ۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے ۔اگر موسیٰ آج موجود ہوں اور تم مجھ کو چھوڑ کر اس کی پیروی کرو تو گمراہ ہو جاؤ گے، اور اگر موسیٰ (علیہ السلام) خود زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پاتے تو ضرور میری پیروی کرتے ۔(دارمی، بحوالہ مشکوٰۃ شریف، کتاب الایمان باب الاعتصام بالکتاب والسنتہ فصل ثالث) اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔(احمد بیہقی فی شعب الایمان، بحوالہ مشکوٰۃ باب ایضاً فصل ثانی) یہ تنبیہ بطریق فرض ہے ۔یعنی بالفرض آپ بھی ایسا کریں تو آپ کو اللہ سے کوئی بچا نہیں سکتا۔گویا امت کو انتہائی تاکید سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام لانے کے بعد پھر سے یہودی یا عیسائی بن جائے تو اسکو اللہ کے عذاب سے کوئی نہ بچا سکے گا۔

اسلام کا تمام ادیان پر غلبہ

بہر حال قانون کے طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی، کہ اصل ہدایت اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے اسی کی پیروی کرنا ہے اور کسی دوسری چیز کے پیچھے نہیں چلنا، یہ قاعدہ سب کے لیے ہے اور اس سے کوئی بھی بری الذمہ نہیں، دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا "لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ"۔ اگر آپ سے بھی شرک سرزد ہو گیا، تو آپ کے بھی سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور آپ نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے، یہ اصول صرف حضور ﷺ کے لیے ہی نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام پر یہی وحی بھیجی کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں لہذا آپ حق کی پیروی کرتے رہیں اور اہل کتاب کی خواہشات کی طرف توجہ نہ دیں۔ یہود و نصاری کا دین اصلاً تو کتاب الٰہی کے ذریعے ہی نازل ہوا تھا اور وہ برحق تھا مگر اب ان کی ملت تحریف کی وجہ سے بگڑ چکی تھی لہذا اب وہ قابل اتباع نہیں رہی، بلکہ اب تو آخری نبی کا دین غالب آئے گا وہی قابل اتباع ہے، دوسرے مقام پر فرمایا "هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ"۔ اللہ تعالیٰ وہ رحیم و کریم ذات ہے جس نے اپنے آخری نبی کو سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس دین کو باقی ادیان پر غالب کر دے، جب مقصد رسالت دیگر ادیان پر غالب ٹھہرا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ علم اور حق کی آمد کے بعد اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی کی جائے۔ یعنی یہ خطاب امت محمدیہ کو ہے کہ جب تم نے جان لیا کہ سید الانبیاء صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ تمہارے پاس حق و ہدایت لائے تو تم ہرگز کفار کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اگر ایسا کیا تو تمہیں کوئی عذاب اِلٰہی سے بچانے والا نہیں الغرض! "لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ" اس سے مراد اسلام کا تمام ادیان پر غلبہ ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کی روشن تعلیمات اور حقانیت دنیا کے سامنے اس طرح واضح ہو جائے کہ کوئی بھی باطل نظریہ اس کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے دین اِسلام غالب ہوا اور اس کے علاوہ تمام اَدیان اسلام سے

مغلوب ہو گئے ۔امام مجاہد رَحْمَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیْہِ سے منقول ہے کہ جب حضرت عیسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نزول فرمائیں گے تو روئے زمین پر اسلام کے سوا اور کوئی دین نہ ہو گا۔(روح البیان، الصف، تحت الآیۃ:۹، ۹ / ۵۰۴، مدارک، الصف، تحت الآیۃ:۹، ص۱۲۴۳، ملتقطاً)

کتاب اللہ کے حقوق

اَلَّذِیْنَ		(وہ لوگ) جنہیں	اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ		ہم نے دی کتاب
یَتْلُوْنَهٗ	اس کی تلاوت کرتے ہیں		حَقَّ تِلَاوَتِهٖ	(جیسا) حق ہے اس کی تلاوت کا	
اُولٰٓىٕكَ	وہی (لوگ)		یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ		ایمان لاتے ہیں اس پر
وَمَنْ یَّكْفُرْ	اور جو انکار کرے	بِهٖ	اس کا	فَاُولٰٓىٕكَ	وہی (لوگ)
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾			ہی خسارہ پانے والے (ہیں) (121)		

حضرت عبد اللہ بن عباس رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا: یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو حضرت جعفر بن ابی طالب رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تھے ،ان کی تعداد چالیس تھی ،بتیس اہلِ حبشہ اور آٹھ شامی راہب تھے،ان میں بحیرا راہب بھی تھے جنہوں نے بچپن میں سفرِ شام میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کو پہچانا تھا۔(خازن، البقرۃ، تحت الآیۃ:۱۲۱، ۱ / ۸۴-۸۵) آیت کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں توریت شریف پر ایمان لانے والے وہی ہیں جو اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں اور بغیر تحریف و تبدیل کئے پڑھتے ہیں اور اس کے معنی کو سمجھتے اور مانتے ہیں اور اس میں حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کی سیرت دیکھ کر آپ پر ایمان لاتے ہیں اور جو حضور پرنور صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کے منکر ہوتے ہیں وہ توریت پر ایمان نہیں رکھتے ۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کے بہت سے حقوق بھی ہیں ۔قرآن کا حق یہ ہے کہ اس کی تعظیم کی جائے، اس سے محبت کی جائے، اس کی تلاوت کی جائے، اسے سمجھا جائے، اس پر ایمان رکھا جائے، اس پر عمل کیا جائے اور اسے دوسروں تک پہنچایا جائے ۔ترغیب کے لئے یہاں ہم تلاوت قرآن کے چند ظاہری اور باطنی آداب ذکر کرتے ہیں تا کہ مسلمان قرآن

عظیم کی اس طرح تلاوت کریں جیسا تلاوت کرنے کا حق ہے۔

تلاوتِ قرآن کے ظاہری آداب

قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے کو ان چھ 6 ظاہری چیزوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔(1) باوضو ہوکر، قبلہ رو ہوکر، مؤدب ہوکر اور عجز و انکساری کے ساتھ بیٹھے۔(2) آہستہ پڑھے اور اس کے معانی میں غور و فکر کرے، تلاوت قرآن کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لے۔(3) دوران تلاوت رونا بھی چاہیئے اور اگر رونا نہ آئے رونے جیسی شکل بنالے۔(4) ہر آیت کی تلاوت کا حق بجالائے (5) اگر قراءت سے ریاکاری کا اندیشہ ہو یا کسی کی نماز میں خلل پڑتا ہو تو آہستہ آہستہ تلاوت کرے۔(6) جہاں تک ممکن ہو قرآنِ پاک کو خوش الحانی کے ساتھ پڑھے۔

تلاوتِ قرآن کے باطنی آداب

قرآنِ کریم کی تلاوت کرنے والے کو ان چھ 6 باطنی چیزوں کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔

(1) قرآنِ مجید کی عظمت دل میں بٹھائے۔(2) قرآنِ مجید پڑھنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی عظمت دل میں بٹھائے اور خیال کرے کہ یہ کس عظیم ذات کا کلام ہے اور میں کس بھاری کام کے لئے بیٹھا ہوں۔(3) قرآنِ کریم کے تلاوت کرتے وقت دل کو حاضر رکھے، اِدھر اُدھر خیال نہ کرے، برے خیالات سے دل کو آلودہ نہ کرے اور جو بے خیالی میں پڑھ چکا اسے از سرِ نو توجہ سے پڑھے۔

(4) ہر حکم کے معنی میں غور و فکر کرے، اگر سمجھ میں نہ آئے تو اسے بار بار پڑھے اور اگر کسی آیت کے پڑھنے سے لذت محسوس ہو تو اسے پھر پڑھے کہ یہ دوبارہ پڑھنا زیادہ تلاوت کرنے سے بہتر ہے۔(5) جس طرح آیات کا مضمون تبدیل ہوتا رہے اسی طرح مضمون کے مطابق دل کی کیفیت بھی بدلتی رہے اور قرآن کے رنگ میں رنگتی جائے۔

(6) قرآن مجید کی تلاوت اس طرح کرے کہ گویا یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے سن رہا ہے اور خیال کرے کہ ابھی اس ذات کی جانب سے سن رہا ہوں۔(کیمیاءِ سعادت،)

امتحان کی غرض وغایت/ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) امام الناس ہیں/ مساجد کی ظاہری و باطنی صفائی

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴿۱۲۲﴾
وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا
شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ
جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴿۱۲۴﴾ وَاِذْ
جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤی
اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ﴿۱۲۵﴾

جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہو گیا عزت پا گیا اور جو اِن سے پھر گیا ذلیل ہو گیا

یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ	اے بنی اسرائیل	اذْکُرُوْا	یاد کرو تم
نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ	میری نعمت وہ جو	اَنْعَمْتُ	میں نے انعام کی
عَلَیْکُمْ	تم پر	وَاَنِّیْ	اور بیشک میں نے

فَضَّلْتُكُمْ	تمہیں فضیلت دی	عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾	جہان والوں پر۔

بنی اسرائیل کا ذکر پانچویں رکوع سے شروع ہو کر چودھویں رکوع تک پورے دس رکوعات میں پوری تفصیل سے کیا گیا اور بتلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کو تمام اقوام عالم پر فضیلت دے کر تمام بنی نوع انسان کی ہدایت کا فریضہ انہیں سونپا تھا۔ اور یہ بھی گذر چکا ہے کہ اس فضیلت کا تعلق اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور سے پہلے کے دور سے ہے، اس وقت صرف بنو اسرائیل ہی توحید کے علمبردار تھے اور پوری دنیا شرک کی آماج گاہ تھی، اس لئے بنو اسرائیل دوسری قوموں سے افضل تھے۔ یعنی بنی اسرائیل اپنے زمانے میں تمام لوگوں سے افضل تھے کیونکہ یہ نبیوں کی اولاد تھے اور ان میں صالحین بہت تھے، اب حضور اکرم صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ کا انکار کر کے اور سرکشی کر کے ذلیل ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عزت حضور اقدس صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ کے قدم سے وابستہ ہے، جو اِن کا ہو گیا عزت پا گیا اور جو اِن سے پھر گیا ذلیل ہو گیا۔ بہر حال یہود میں بیشمار ایسی اخلاقی بیماریاں پیدا ہو چکی تھیں۔ جن کی وجہ سے یہ امامت کے قابل ہی نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ایسی تمام اخلاقی بیماریوں کا ذکر تفصیل سے بیان کر دیا ہے اور آخر میں انہیں وہی ہدایت کی جا رہی ہے جو ابتداء میں بھی کی گئی تھی کہ اس دن سے ڈر کر اب بھی اپنی خباثتوں سے باز آجاؤ۔

شفاعت کافر کے لیے نہیں ہے

وَاتَّقُوْا	اور تم ڈرو	يَوْمًا	اُس دن سے	لَّا تَجْزِىْ	نہ کام آئے گی
نَفْسٌ	کوئی جان	عَنْ نَّفْسٍ	کسی جان سے	شَيْـًٔا	کچھ بھی
وَّلَا يُقْبَلُ	اور نہ قبول کیا جائے گا	مِنْهَا	اس سے	عَدْلٌ	کوئی بدلہ
وَّلَا تَنْفَعُهَا	اور نہ اسے نفع دے گی اُسے	شَفَاعَةٌ	کوئی سفارش		
وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾	اور نہ وہ مدد کئے جائیں گے۔				

یہاں بنیادی طور پر ان یہودیوں کا رد ہے جو کہتے تھے ہمارے باپ دادا بڑے بزرگ تھے وہ ہمیں شفاعت کر کے چھڑا لیں گے۔ انہیں فرمایا جا رہا ہے کہ شفاعت کافر کے لیے نہیں ہے۔

گویایہاں کافر کا بیان ہے کہ کافر کی طرف سے کوئی بدلہ نہ بنے گا اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لے کر اسے چھوڑا جائے اور نہ کوئی اس کی شفاعت کرے گا اور بالفرض اگر کوئی کرے تو کافر کے حق میں شفاعت قبول نہیں کی جائے گی اور نہ کافروں کی مدد کی جائے گی۔ کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کی شفاعت بھی ہوگی جیسے قرآن میں بیسیوں جگہ ہے اور مسلمانوں کی مدد بھی ہوگی جیسے بخاری ومسلم کی حدیثوں میں ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قیامت میں جگہ جگہ اپنے امتیوں کی مدد فرمائیں گے۔

ابتلاء آزمائش کا لغوی معنی اور قرآنی وشرعی مفہوم

وَاِذِ ابْتَلٰٓی	اور جب آزمایا	اِبْرٰھٖمَ	ابراہیم کو	رَبُّهٗ	اُس کے رب نے
بِكَلِمٰتٍ	چند باتوں سے	فَاَتَمَّهُنَّ	تو اُس نے پورا کردیا اُن کو	قَالَ	فرمایا
اِنِّیْ	بیشک میں	جَاعِلُكَ	بنانے والا ہوں تجھے	لِلنَّاسِ	لوگوں کا
اِمَامًا	پیشوا	قَالَ	اس نے کہا	وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ	میری اولاد سے
قَالَ	اس نے فرمایا	لَا یَنَالُ	نہیں پہنچے گا	عَهْدِی	میرا عہد
الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾			ظالموں کو (124)		

وَاِذِ ابْتَلٰٓی: اور جب آزمایا۔ یہود ونصاریٰ اور مشرکین عرب سب حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے فضل وشرف کے معترف اور آپ کی نسل میں ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے وہ حالات بیان فرمائے ہیں جن سے سب پر اسلام کا قبول کرنا لازم ہوجاتا ہے کیونکہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے آپ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام پر واجب کیں وہ اسلام کی خصوصیات میں سے ہیں۔ ابتلاء آزمائش کو کہتے ہیں، ابتلاء عربی لفظ "بلاء" سے نکلا ہے، جس کے اصل معنی کسی مشکل اور دشوار کام کا مکلف بنانا ہیں۔ لغت میں اس کا مطلب پرکھنا یا کھوٹے اور کھرے کی تمیز کرنا ہے، اسلامی تعلیمات کے مطابق، یہ دنیا ایک دارِ امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی وفاداری، صبر اور شکر کا مختلف حالات میں امتحان لیتا ہے۔ قرآنی رو سے یہ آزمائش دو طرح سے

ہوتی ہے، خدائی آزمائش یہ ہے کہ بندے پر کوئی پابندی لازم فرما کر دوسروں پر اس کے کھرے کھوٹے ہونے کا اظہار کر دیا جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی قربانی ہی قربانی تھی

یعنی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو تمام دنیا کی امامت ایسے ہی نہیں مل گئی تھی بلکہ آپ کی سن شعور سے لے کر مرنے تک پوری زندگی قربانی ہی قربانی تھی۔ دنیا میں انسان جن چیزوں سے محبت کرتا ہے ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جسے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے حق کی خاطر قربان نہ کیا ہو اور ان کی خاطر مصائب نہ جھیلے ہوں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

1۔ آپ ایک بت گر اور بت فروش کے گھر پیدا ہوئے۔ باپ چاہتا تھا کہ بیٹا اس کام میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن آپ (علیہ السلام) نے الٹا احسن انداز میں سمجھانا شروع کر دیا۔ جب باپ آپ (علیہ السلام) کی طرف سے مایوس ہو گیا تو گھر سے نکال دینے کی دھمکی دے دی۔ آپ (علیہ السلام) نے حق کی خاطر جلا وطنی کی صعوبتیں قبول کیں۔

2۔ قومی میلہ کے موقع پر بتوں کو پاش پاش کیا جسکے نتیجہ میں آپ (علیہ السلام) کو آگ میں جلا دینے کا فیصلہ ہوا۔ آپ (علیہ السلام) نے بخوشی اس میں کودنا منظور کیا۔

3۔ آپ (علیہ السلام) نے اپنی بیوی ہاجرہ (علیہا السلام) اور دودھ پیتے بچے کو اللہ کے حکم کے مطابق ایک بے آب وگیاہ میدان میں جا چھوڑا۔ جہاں کھانے پینے کا کوئی بندوبست نہ تھا اور نہ ہی دور دور تک کسی آبادی کے آثار نظر آتے تھے۔

4۔ بوڑھی عمر میں ملے ہوئے بچے اسماعیل (علیہ السلام) جب ذرا جوان ہوئے تو ان کو قربان کر دینے کا حکم ہوا تو آپ بے دریغ اور بلا تامل اس پر آمادہ ہو گئے۔ غرض آپ کی قربانیوں اور آزمائشوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے خود یہ سرٹیفکیٹ عطا کر دیا کہ ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کی کئی باتوں سے آزمائش کی تو وہ ہر امتحان میں پورے اترے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان امتحانوں کے نتیجہ میں آپ کو دنیا جہان کا امام بنا دیا،

اور آئندہ قیامت تک کے لیے سلسلہ نبوت کو آپ (علیہ السلام) ہی کی اولاد سے منسلک کر دیا اور دنیا کے اکثر و بیشتر مذاہب اپنے مذہب کی آپ (علیہ السلام) کی طرف نسبت کرنا باعث عزت و افتخار سمجھتے ہیں۔ بہرحال خلاصہ یہ ہے کہ بِكَلِمٰتٍ سے بعض مفسرین نے ان باتوں سے مراد والد، قوم اور بادشاہ کو توحید کی دعوت، بت پرستی، ستارہ پرستی اور شاہ پرستی کی تردید، آگ میں پھینکے جانے پر صبر، پھر ہجرت، مصر کے جبار بادشاہ کی دست درازی کے باوجود استقامت، بیوی بچے کو وادی غیر ذی ذرع میں چھوڑنا اور اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے پر مکمل آمادگی کو لیا ہے۔ بعض نے آگے آنے والی آیات میں مذکور بیت اللہ کی تعمیر و تطہیر اور حج کے مناسک اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: اَسْلِمْ : (فرماں بردار ہو جا) پر فرماں بردار ہونے کے اقرار، پھر اس کے عملی ثبوت کو مراد لیا ہے۔ (قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ) جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تمام لوگوں کا امام بنا دیا تو انھوں نے اپنی بعض اولاد کے حق میں امامت کی دعا کی، سب کے حق میں نہیں کی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا، تو یہ دعا کیوں کی جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، مگر اس کے ساتھ ہی انھیں بتا دیا کہ تمھاری اولاد میں سے ظالم لوگ اس نعمت سے سرفراز نہیں ہوں گے۔ اس سے بنی اسرائیل کے گمراہ لوگوں اور بنی اسماعیل کے مشرکین کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ ان کے عقائد و اعمال خراب ہو چکے ہیں، محض ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہونا کافی نہیں۔ یعنی امامت کا وعدہ صرف تمھاری اس اولاد سے تعلق رکھتا ہے جو صالح ہوگی۔ ظالموں اور گنہگاروں کے لیے ایسا کوئی وعدہ نہیں۔ یہیں سے یہود کے اس غلط عقیدہ کی تردید ہوگئی جو وہ سمجھتے تھے کہ ہم چونکہ پیغمبروں کی اولاد ہیں اس لیے ہمیں عذاب اخروی نہ ہوگا۔ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے علاوہ خلافت اور حکومت والے جو امام ہیں، ان میں سے بھی جو کوئی ظالم ہے اس آیت کی رو سے حکومت کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک امامت کے قابل وہی لوگ ہیں جو عدل و انصاف کو سر بلند رکھنے والے ہیں کوئی بھی ظالم پیشوائی کے لائق نہیں ہے۔

اولاد کے لئے دعاء خیر کرنا سنت اِنبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہے

اس سے معلوم ہوا کہ کافر مسلمانوں کا پیشوا نہیں ہوسکتا اور مسلمانوں کو اس کی اتباع جائز نہیں ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی اولاد کے لئے دعاء خیر کرنا سنت اِنبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کوئی نعمت عطا فرمائے تو اولاد کیلئے بھی اس کی خواہش کرنی چاہیے ۔

شیشہ کی گنبد نما عمارت

وَاِذْ	اور جب	جَعَلْنَا	ہم نے بنایا	الْبَيْتَ	بیت اللہ
مَثَابَةً	اجتماع کی جگہ	لِّلنَّاسِ	لوگوں کے لئے	وَاَمْنًا	اور امن (کی جگہ)
وَاتَّخِذُوْا	اور تم بناؤ	مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ	مقامِ ابراہیم کو		
مُصَلًّى	نماز پڑھنے کی جگہ	وَعَهِدْنَآ	اور ہم نے حکم دیا		
اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ	ابراہیم کو	وَاِسْمٰعِيْلَ	اور اسماعیل (کو)	اَنْ طَهِّرَا	یہ کہ پاک رکھیں
بَيْتِىَ	میرا گھر	لِلطَّآئِفِيْنَ	طواف کرنے والوں کیلئے		
وَالْعٰكِفِيْنَ	اور اعتکاف کرنے والوں (کیلئے)	وَالرُّكَّعِ	اور رکوع کرنے والوں		
السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾	اور سجدہ کرنے والوں (کے لئے) (125)				

مَثَابَةً بمعنی لوگوں کے بار بار آتے اور جاتے رہنے کی جگہ (بغرض حج ، عمرہ ، طواف ، اور عبادت نماز وغیرہ) وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) خانہ کعبہ کی تعمیر کرتے رہے ۔ اسی پر کھڑے ہو کر آپ نے لوگوں کو حج کے لیے پکارا ۔ یہ پتھر خانہ کعبہ کے صحن میں ہے اور آج کل اسے ایک چھوٹی سی شیشہ کی گنبد نما عمارت میں محفوظ کر دیا گیا ہے ۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہا کرتے تھے تین باتوں میں میری رائے اللہ کے علم کے موافق ہوگئی ۔ (جن میں ایک یہ تھی) میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! کیا اچھا ہو اگر آپ مقام ابراہیم (علیہ السلام) کو نماز کی جگہ قرار دے دیں اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتار دی ۔ (وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى چنانچہ طواف کرنے والے اسی مقام کے پاس

دوگانہ نماز نفل ادا کرتے ہیں۔

ظاہری و باطنی صفائی سنت اِنبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام

(طَهِّرَا بَيۡتِيَ) طہارت سے مراد کوڑا کرکٹ سے صفائی ہی نہیں، بلکہ ظاہری و باطنی صفائی ہے یعنی بت پرستی اور شرک کی تمام نجاستوں سے بھی صفائی ہے، کیونکہ طواف، اعتکاف، رکوع اور سجدہ اللہ کے سوا کسی کا حق نہیں۔ مشرکین مکہ کو توجہ دلائی جارہی ہے کہ تمہارے باپ کو کیا حکم دیا گیا تھا اور تم نے عین کعبہ میں بت لا کر کیسی فرماں برداری کی۔ یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل عَلَیۡهِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کو بیتُ اللہ شریف کو پاک وصاف رکھنے کا حکم دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خانہ کعبہ اور مسجدِ حرام شریف کو حاجیوں، عمرہ کرنے والوں، طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور نمازیوں کیلئے پاک وصاف رکھا جائے، یہی حکم مسجدوں کو پاک وصاف رکھنے کا ہے، وہاں گندگی اور بدبودار چیز نہ لائی جائے، یہ سنت اِنبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہے، یہ بھی معلوم ہوا کہ اعتکاف عبادت ہے اور گزشتہ امتوں میں رائج تھا نیز پچھلی امتوں کی نمازوں میں رکوع سجود دونوں تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مسجدوں کا متولی ہونا چاہیے اور متولی صالح انسان اور مسجد کی صحیح خدمت کرنے والا ہو۔ الغرض! اس آیت میں چار عبادتوں کا ذکر کیا گیا ہے: طواف، اعتکاف، رکوع اور سجدہ، طواف اور اعتکاف مستقل عبادت ہے، طواف کعبۃ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے، کعبۃ اللہ کے علاوہ کسی مسجد یا مقام کا پھیرا لگانا سخت گناہ اور بدترین بدعت ہے، (دیکھئے: فتاویٰ رحیمیہ: ۲/ ۳۳۶،) اور اعتکاف مرد کسی مسجد ہی میں کر سکتے ہیں، عورتیں گھر میں اعتکاف کریں گی، رکوع وسجدہ سے نماز کی ادائیگی مراد ہے، نماز میں عجز وفروتنی کا سب سے بڑھ کر اظہار رکوع اور سجدہ ہی سے ہوتا ہے؛ اس لئے خاص طور پر ان کا ذکر کیا گیا، اس ارشادِ ربانی سے معلوم ہوا کہ نماز کی جگہ کا پاک ہونا شرط ہے اور نماز کی جگہ سے مراد یہ ہے کہ رکوع وسجدہ میں جو اعضاء زمین سے لگتے ہیں، ان جگہوں کو پاک ہونا چاہئے۔

تعمیر کعبہ کے مختلف ادوار/ پُر امن شہر مکہ مکرمہ کی فضیلت/ مناسک حج کی تعلیم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ
بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ
وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ
مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً
مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا
وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَیُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۲۹﴾

نیکی کرکے قبولیت کی دعا کرنا سنّتِ خلیل

وَاِذْ قَالَ	اور جب کہا	اِبْرٰهٖمُ	ابراہیم نے	رَبِّ	اے میرے رب!		
اجْعَلْ	تو بنا	هٰذَا بَلَدًا	اس شہر کو	اٰمِنًا	امن والا	وَّارْزُقْ	اور رزق دے
اَهْلَهٗ	اس کے رہنے والوں کو	مِنَ الثَّمَرٰتِ	پھلوں میں سے				

مَنۡ اٰمَنَ	جو ایمان لائے	مِنۡهُمۡ	ان میں سے	بِاللّٰهِ	اللہ پر
وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ	اور آخرت کے دن (پر)	قَالَ	(اللہ نے) کہا		
وَمَنۡ كَفَرَ	اور جس نے کفر کیا	فَاُمَتِّعُهٗ	تو اس کو نفع دوں گا		
قَلِيۡلًا	تھوڑا سا	ثُمَّ اَضۡطَرُّهٗۤ	پھر اس کو مجبور کروں گا		
اِلٰى عَذَابِ النَّارِ	طرف عذاب جہنم کے	وَبِئۡسَ	اور وہ بری جگہ ہے		
الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۲۶﴾	لوٹنے کی۔(126)				

حضرت ابراہیم عَلَیۡهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے تعمیرِ کعبہ کے بعد متعدد دعائیں مانگیں۔اس سے معلوم ہوا کہ نیکی کر کے قبولیت کی دعا کرنا سنّتِ خلیل ہے۔حضرت ابراہیم عَلَیۡهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے اولاد کیلئے امامت مانگی تھی تو فرمایا گیا کہ ظالموں کو نہیں ملے گی اس لیے حضرت ابراہیم عَلَیۡهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے بعد میں جب یہ دعا کی تو اس میں مومنین کو خاص فرمایا کہ مومنوں کو رزق دے اور یہی ادب کا تقاضا تھا۔اللہ تعالیٰ نے کرم کیا، دعا قبول فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ رزق سب کو دیا جائے گا مومن کو بھی اور کافر کو بھی لیکن کافر کا رزق تھوڑا ہے یعنی صرف دنیوی زندگی میں اسے ملے گا۔حضرت ابراہیم عَلَیۡهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے خانہ کعبہ کیلئے رزق کی فراوانی کی دعا مانگی تھی،اور رزق کی وہ فراوانی فرمائی کہ مکہ میں کھیتی باڑی نہ ہونے کے باوجود وہاں سارا سال دنیا بھر کے تازہ پھل اور ہر قسم کا غلہ اتنی فراوانی سے ملتا ہے کہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا کی قبولیت ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ دنیا بھر کے پھل اور کھانے یہاں بکثرت ملتے ہیں۔

مکہ مکرمہ روئے زمین پر سب سے مقدس اور پر امن شہر

مکہ مکرمہ روئے زمین پر سب سے مقدس اور پر امن شہر ہے،مکہ مکرمہ اس پوری کائناتِ ارضی میں وہ بابرکت جگہ اور رحمتوں والا مقام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا بھر کے شہروں سے بڑھ کر اعلیٰ و مقدس شہر کی حیثیت عطا کی ہے اللہ رب العزت نے اس شہر دلنواز اور اس مرکزِ بخشش کو خلعتِ انوار میں لپیٹے ہوئے اپنے برگزیدہ بندے،اور عالم خلق میں سب سے اعلیٰ وارفع ہستی امام الانبیاء حضرت

محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے ولادت کے لئے منتخب کیا اپنے دین کی اشاعت اور ترویج و فروغ اور اپنے گھر بیت اللہ شریف کا حج کرنے کے لئے اس شہر بے مثال کو منتخب فرمایا، شہر خوباں نزول وحی وملائکہ کا مرکز، انبیاء واولیاء کا ٹھکانہ ومدفن، ہر چیز کی پیدائش کا موجب وسبب اور ہر انعامِ خداوندی کی بنیاد ہے یہاں اللہ تعالیٰ کی واضح اور کھلی نشانیاں ہیں جن کی زیارت سے جہاں ایمان کو حلاوت اور چاشنی ملتی ہے وہاں استقرار واستحکام بھی میسر آتا ہے ان ہی میں سے مقام ابراہیم ہے، صفاومروہ ہے، آب زم زم وحجرِ اسود ہے، حتیٰ کہ یہی وہ شہر ہے۔

مکہ مکرمہ کی فضیلت

جس میں اللہ کا گھر ''بیت اللہ'' ہے جس میں ادا کی جانے والی ایک نماز اپنے دامن میں ایک لاکھ نماز کا اجر وثواب رکھتی ہے اس کے ارد گرد تین سو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مزارات ہیں، اس شہر امن میں داخل ہونے والے کو امن وامان مل جاتا ہے خونریزی وسفاکی کی یہاں ممانعت ہے کسی بھی انسان کا حق وناحق خون نہیں بہایا جاسکتا اس عظمت وبزرگی والے شہر میں حلال تو درکنار حرام جانور کا شکار بھی گناہ ہے اس کے درختوں اور شاخوں کا کاٹنا بھی حرام ہے یہ اس قدر امن والا شہر ہے کہ ہر ذی روح اور غیر ذی روح اس کے سائے میں محفوظ ومامون ہے یہاں قدم قدم پر عافیت کے شامیانے نصب ہیں امن سکون اور رحمتوں کا بحر بے کنار، یہ وہ عظیم الشان شہر ہے جس کی عظمت اور فضیلت کی خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں قسمیں کھائی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ (البلد، 90:1-2) ''میں اس شہر (مکہ) کی قسم کھاتا ہوں (اے حبیبِ مکرّم!) اس لیے کہ آپ اس شہر میں تشریف فرما ہیں۔'' اسی طرح مکہ مکرمہ کی فضیلت حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ثابت ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ کو مخاطب کر کے اظہارِ محبت یوں فرمایا:

''تو کتنا اچھا شہر ہے اور مجھے کتنا عزیز ہے اگر میری قوم مجھے یہاں سے نہ نکالتی تو میں تیرے علاوہ کہیں نہ ٹھہرتا۔'' (ترمذی، السنن، کتاب المناقب، باب فی فضل مکہ، 5:679-680، رقم:

3926) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا کو قبول فرمایا چنانچہ حرم پاک اور شہر مکہ کی خیر و برکات کا سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک قائم رہے گا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر مختلف ادوار میں دس (10) بار ہوئی

وَاِذْ یَرْفَعُ	اور جب بلند کر رہے تھے	اِبْرٰھٖمُ	ابراہیم	الْقَوَاعِدَ	بنیادیں
مِنَ الْبَیْتِ	بیت اللہ کی	وَاِسْمٰعِیْلُ	اور اسماعیل		
رَبَّنَا	(یہ کہتے ہوئے) اے ہمارے رب	تَقَبَّلْ	قبول فرما		
مِنَّا	(یہ نیکی) ہم سے	اِنَّکَ اَنْتَ	بیشک تو ہی ہے		
السَّمِیْعُ	خوب سننے والا	الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾	خوب جاننے والا۔(127)		

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا، یعنی بیت اللہ کی وہ بنیادیں جو اس سے پہلے موجود تھیں۔ [تفسیر عبد الرزاق بسند صحیح] اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ پہلے تعمیر ہو چکا تھا، اب از سرِ نو اس کی بنیادیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ سورہ حج (26) میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے بیت اللہ کی جگہ متعین فرمائی۔ مشہور اسلامی مؤرخ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب 'تاریخِ مکہ میں ان دس تعمیرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، اسی طرح علامہ قسطلانی (رحمہ اللہ تعالیٰ) نے کہا کہ کعبہ دس بار تعمیر ہوا۔ سب سے پہلے اسے فرشتوں نے بنایا۔ دوسری بار آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے (آپ (علیہ السلام) کی عمر ہزار سال تھی) تیسری بار شیث (علیہ الصلوٰۃ والسلام) (آدم کے بیٹے) نے اور یہ تعمیر طوفان نوح (علیہ السلام) میں گر گئی۔ چوتھی بار حضرت ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے پانچویں بار قوم عمالقہ نے، چھٹی بار قبیلہ جرہم نے، ساتویں بار قصی بن کلاب نے (جو رسول اللہ ﷺ کے جد امجد ہیں) آٹھویں بار قریش نے (آپ کی بعثت سے پہلے جب کہ حطیم کی جگہ چھوڑ دی تھی) نویں بار حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (اپنے دور خلافت میں) دسویں بار حجاج بن یوسف نے۔ اور اس کے بعد آج تک اس علاقہ پر مسلمانوں کا ہی قبضہ چلا آ رہا ہے اور بہت سے بادشاہوں نے اس کی تعمیر، مرمت

اور توسیع میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور یہ سلسلہ تا ہنوز جاری ہے۔اس سلسلہ میں آل سعود کی خدمات گرانقدر ہیں اور لائق تحسین ہیں۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسجدوں کی تعمیر نہایت اعلیٰ عبادت اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے۔صحیح بخاری میں ہے کہ حضور پر نور صَلَّی اللہُ تعالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے مسجد نبوی شریف کی تعمیر میں بذاتِ خود حصہ لیا تھا۔(بخاری) حضرت انس رَضِیَ اللہُ تعالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، نبی اکرم صَلَّی اللہُ تعالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''مسجدیں تعمیر کرو اور انہیں محفوظ بناؤ۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الصلاۃ، فی زینۃ المساجد وما جاء فیھا، ۱/ ۳۴۴، الحدیث: ۹) حضرت عثمان غنی رَضِیَ اللہُ تعالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، رسولُ اللہ صَلَّی اللہُ تعالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''جو اللہ تعالیٰ کے لیے مسجد بنائے گا اللہ عَزَّ وَجَلَّ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔(مسلم، کتاب الزہد والرقائق، باب فضل بناء المساجد، ص ۱۵۹۳، الحدیث: ۴۴(۲۹۸۳))

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ یعنی یہ معمولی پتھروں کی عمارت تیری شان کے اعتبار سے کس لائق ہے؟ لیکن اِن عاجز بندوں کے جذبہ اخلاص کو دیکھتے اور ان کی التجا کو سنتے ہوئے اپنی شان کریمی سے اس کو قبول فرمالیجئے، کہ آپ بندوں کی دعا سنتے ہیں اور دلوں کے حال سے واقف ہیں۔

لفظ مناسک کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ ومفہوم

رَبَّنَا	اے ہمارے رب	وَاجْعَلْنَا	اور ہمیں بنا دے	مُسْلِمَیْنِ	فرمانبردار
لَكَ	اپنا	وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ		اور (بنا) ہماری اولاد سے (بھی)	
اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ			ایک جماعت فرمانبردار اپنی		
وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا	اور ہمیں سکھا حج کے طریقے	وَتُبْ عَلَیْنَا	اور توبہ قبول فرما ہماری		
اِنَّكَ اَنْتَ	بیشک تو ہی	التَّوَّابُ	بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا		
الرَّحِیْمُ ۱۲۸			نہایت رحم کرنے والا ہے۔		

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ دونوں پیغمبر جب خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو ساتھ ساتھ دعا بھی کر رہے تھے کہ الٰہی: ہماری یہ خدمت قبول فرما اور اپنا مسلم (مطیع فرماں) بنا، اور ہماری اولاد میں سے ایک مسلم قوم پیدا کر، اور مسلم وہ ہوتا ہے جو اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اپنے آپ کو کلیتاً اللہ کے سپرد کر دے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے۔ اس عقیدے اور طرز عمل کا نام اسلام ہے اور یہی تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا دین رہا ہے۔ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا: مناسک عربی زبان کا لفظ ہے (واحد: منسک)، جس کے لغوی معنی پاک کرنے، اور ایسی مخصوص جگہ جہاں لوگ بار بار جمع ہوں کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں اس سے مراد عبادت کے وہ طریقے، رسومات اور افعال ہیں جو اللہ کی خوشنودی کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، الغرض! اصطلاحاً اس کا اطلاق زیادہ تر حج اور عمرہ کے افعال پر ہوتا ہے ان میں احرام باندھنا، طواف کعبہ، صفا و مروہ کے درمیان سعی، وقوفِ عرفات، اور رمی (کنکریاں مارنا) شامل ہیں۔ یعنی مناسک کا لفظ عموماً حج کے آداب و ارکان اور قربانی کے احکام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے وسیع مفہوم میں عبادت کے سب طریقے شامل ہیں۔ معلوم ہوا کہ عبادت کے طریقے سیکھنا حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی سنت ہے۔ اس کیلئے دعا بھی کرنی چاہیے اور کوشش بھی۔ بغیر طریقہ سیکھے عبادت کرنا اکثر عبادت کو ضائع کرتا ہے۔ حضرت انس بن مالک رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُ سے روایت ہے، رسول کریم صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''ہر مسلمان پر علم سیکھنا فرض ہے۔ (ابن ماجہ) وَ تُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے عمداً کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا، رہی خطا تو بھول چوک امت سے تو معاف ہے۔ مگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان اتنی بڑی ہے کہ ذرا سی غفلت ان کے حق میں گناہ سمجھی جاتی ہے۔ اسی لیے انبیاء (علیہم السلام) معصوم ہونے کے باوجود عوام الناس کی نسبت بہت زیادہ توبہ و استغفار کرتے رہتے ہیں۔

کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد حدیث ہے

رَبَّنَا	اے ہمارے رب	وَابۡعَثۡ	اور تو بھیج	فِيهِمۡ	ان میں		
رَسُوۡلًا	ایک رسول	مِّنۡهُمۡ	انہی میں سے	يَتۡلُوۡا	وہ تلاوت کرے		
عَلَيۡهِمۡ	ان پر	اٰيٰتِكَ	تیری آیتیں	وَيُعَلِّمُهُمُ	اور انہیں تعلیم دے		
الۡكِتٰبَ	کتاب	وَالۡحِكۡمَةَ	اور حکمت	وَيُزَكِّيۡهِمۡ	اور انہیں پاک کرے		
اِنَّكَ اَنۡتَ	بیشک تو ہی	الۡعَزِيۡزُ	نہایت غالب	الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۲۹﴾	خوب حکمت والا (ہے)		

یہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی آخری دعا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی اولاد میں سے حضرت محمد رسول (ﷺ) کو مبعوث فرمایا۔ اسی لئے نبی (ﷺ) نے فرمایا: ”میں اپنے باپ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا، حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بشارت اور اپنی والدہ کا خواب ہوں۔“ (الفتح الربانی، ج20،ص181، 189)

کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد حدیث ہے۔ تلاوت آیات کے بعد تعلیم کتاب و حکمت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی نفس تلاوت بھی مقصود اور باعث اجر و ثواب ہے۔ تاہم اگر ان کا مفہوم و مطلب بھی سمجھ میں آتا جائے تو سبحان اللہ، سونے پر سہاگہ ہے۔ لیکن اگر قرآن کا ترجمہ و مطلب نہیں آتا، تب بھی اس کی تلاوت میں کوتاہی جائز نہیں ہے۔ تلاوت بجائے خود ایک الگ اور نیک عمل ہے۔ تاہم اس کے مفاہیم اور مطالب سمجھنے کی بھی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ تلاوت و تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کے بعد آپ (ﷺ) کی بعثت کا یہ چوتھا مقصد ہے کہ انہیں شرک و توہمات کی آلائشوں سے اور اخلاق و کردار کی کوتاہیوں سے پاک کریں۔ آمین۔

اسلام دین امن وسلامتی ہے/ اولاد کو صحیح عقائد اور نیک اعمال کی وصیت کرنی چاہئے

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَاِنَّهٗ
فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾
وَوَصّٰی بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا
وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا
تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا
وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

یہود ونصاریٰ اور مشرکین عرب کی تردید

وَمَنْ	اور کون	یَّرْغَبُ	منہ موڑتا ہے	عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ	ملت ابراہیم سے		
اِلَّا مَنْ	سوائے اس کے جس نے	سَفِهَ	بیوقوف بنایا	نَفْسَهٗ	اپنے آپ کو		
وَلَقَدِ	اور البتہ تحقیق	اصْطَفَیْنٰهُ	ہم نے اس کو چن لیا	فِی الدُّنْیَا	دنیا میں		
وَاِنَّهٗ	اور بیشک وہ	فِی الْاٰخِرَةِ	آخرت میں				

لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ⑬⓪	البتہ نیکوں میں سے ہے(130)

"رَغِبَ يَرْغَبُ" کے بعد اگر "فِي" آئے تو اس کا معنی کسی چیز میں رغبت رکھنا اور اگر "عَنْ" آئے تو اس کا معنی بے رغبتی ہوتا ہے۔ دین کا معنی اللہ تعالیٰ کی مکمل حاکمیت اور اپنی مکمل عبودیت کو تسلیم کر لینا ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے طرز فکر اور طرز عمل کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع بنا لیا تھا اور طرز فکر و عمل کی تبلیغ و اشاعت میں اپنی پوری زندگی صرف کی اور اس راہ میں جو بڑی مشکلات پیش آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور یہ طرز زندگی اللہ کو اتنا محبوب تھا کہ اس نے آپ کو پوری دنیا کا امام بنا دیا۔ اب کوئی بیوقوف ہی ایسی پسندیدہ روش سے اعراض کر سکتا ہے، یا ایسا شخص جو تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا ہو۔ اس آیت میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب کی تردید ہے کہ وہ تینوں ملت ابراہیم کے دعوے دار تھے، مگر عملاً اس سے بالکل بے رغبت، بلکہ شدید مخالف تھے، انھوں نے اس میں شرک و بدعت کو شامل کر کے اپنا اپنا الگ الگ طریقہ بنا لیا تھا۔ یہود نے حضرت عزیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ کا بیٹا بنا رکھا تھا، نصرانی تین خدا مانتے تھے، صلیب کی پرستش اس پر مزید تھی۔ مشرکین عرب نے بت پرستی اختیار کر لی تھی، (وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ) بلاشبہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملت میں سے جنھیں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں چن لیا اور جو آخرت میں صالحین میں شامل ہوں گے، اس سے وہی شخص بے رغبتی کرے گا جو عقل کو جواب دے کر اپنے آپ کو بیوقوف بنا لے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سچے دین کی پہچان یہ ہے کہ وہ سلف صالحین کا دین ہو، یہ حضرات ہدایت کی دلیل ہیں، اللہ تعالیٰ نے حقانیت اسلام کی دلیل یہاں دی کہ وہ ملت ابراہیمی ہے۔

اسلام کے دین امن وسلامتی ہونے کی بڑی دلیل

اِذْ قَالَ لَهٗ	جب کہا اس سے	رَبُّهٗٓ	اس کے رب نے
اَسْلِمْ	تو فرمانبردار ہو جا!	قَالَ	اس نے کہا
اَسْلَمْتُ	میں فرمانبردار ہو گیا	لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑬①	رب العالمین کیلئے

"اَسۡلَمَ یُسۡلِمُ" کے معنی ہیں اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دینا اور وہی کرنا جو وہ کہے۔ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کے لیے اپنے مسلم ہونے کا اقرار کیا اور وجہ بھی ذکر فرمائی کہ رب العالمین ہونے کی وجہ سے یہ حق ہی اسی کا ہے۔اور یہ فضیلت و برگزیدگی انہیں اس لئے حاصل ہوئی کہ انہوں نے اطاعت و فرمانبرداری کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔اسلام کا معنی ومفہوم اسلام خود بھی امن وسلامتی کا دین ہے اور دوسروں کو بھی امن و عافیت کے ساتھ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔اسلام کے دین امن وسلامتی ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بھیجے ہوئے دین کے لئے نام ہی ''اسلام'' پسند کیا ہے۔لفظ اسلام سَلَمَ یا سَلِمَ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی امن و سلامتی اور خیر و عافیت کے ہیں۔اسلام اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے سراسر امن ہے۔گویا امن و سلامتی کا معنی لفظ اسلام کے اندر ہی موجود ہے۔لہٰذا اپنے معنی کے اعتبار سے ہی اسلام ایک ایسا دین ہے جو خود بھی سراپا سلامتی ہے اور دوسروں کو بھی امن وسلامتی محبت و رواداری، اعتدال و توازن اور صبر وتحمل کی تعلیم دیتا ہے۔

اَلدِّیۡنَ سے مراد یہاں اسلام ہے

وَوَصّٰی	اور وصیت کی	بِهَآ	اس (کلمہ اسلام) کی	اِبۡرٰهٖمُ	ابراہیم نے		
بَنِیۡهِ	اپنے بیٹوں کو	وَیَعۡقُوۡبُ	اور یعقوب نے	یٰبَنِیَّ	اے میرے بیٹو		
اِنَّ اللّٰهَ	بیشک اللہ نے	اصۡطَفٰی	چن لیا	لَکُمُ الدِّیۡنَ	تمہارے لئے یہ دین		
فَلَا تَمُوۡتُنَّ	پس نہ مرنا ہرگز تم	اِلَّا وَاَنۡتُمۡ	مگر اس حال میں کہ تم				
مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾	مسلمان ہو (132)						

اس آیت میں اللہ رب العزت نے بطور خاص حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پوتے یعقوب (علیہ السلام) کا ذکر فرمایا۔اس لیے کہ ماسوائے نبی آخر الزمان ﷺ کے باقی سب انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام انہی کی اولاد سے تھے اور بنی اسرائیل بھی انہی کی اولاد تھے۔انہیں وصیت تو اللہ کا فرمانبردار بن کر رہنے کی گئی تھی۔(الدِّیۡنَ) سے مراد یہاں اسلام ہے، کیونکہ پچھلی آیت میں

ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسی دین کو اختیار کرنے کا ذکر ہے۔ مسلم ہونے کی حالت میں فوت ہونا اسی وقت ممکن ہے جب بندہ ہر وقت مسلم یعنی تابع فرمان رہے، کبھی کوتاہی ہو تو فوراً توبہ کرے، کیونکہ موت کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اپنے اور اپنی اولاد سے متعلق آخری وقت مسلم ہونے کی بہت فکر رہتی تھی، کیونکہ اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے (إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ) [بخاری، القدر، باب العمل بالخواتیم: 6607] سورہ یوسف میں حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا ہے: (تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِيْنَ) [یوسف: 101] "مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔" اگرچہ آخر وقت مسلمان ہونا بندے کے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جو آدمی دلی لگاؤ کے ساتھ نیک و بد جو بھی راستہ اختیار کرتا ہے تو اور اس پر کاربند رہنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے اسی کی توفیق دے دی جاتی ہے۔

یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب عَلَيْهِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام نے اپنی اولاد کو دین حق پر ثابت قدمی کی وصیت فرمائی۔ اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ والدین کو صرف مال کے متعلق ہی وصیت نہیں کرنی چاہیے بلکہ اولاد کو عقائدِ صحیحہ، اعمالِ صالحہ، دین کی عظمت، دین پر استقامت، نیکیوں پر مداومت اور گناہوں سے دور رہنے کی وصیت بھی کرنی چاہیے۔ اولاد کو دین سکھانا اور ان کی صحیح تربیت کرتے رہنا والدین کی ذمہ داری ہے۔ جیسا کہ حضرت انس رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ سے روایت ہے، نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''اپنی اولاد کے ساتھ نیک سلوک کرو اور انہیں اچھے ادب سکھانے کی کوشش کرو۔ (ابن ماجہ، کتاب الادب، باب بر الوالد والاحسان الی البنات، ۴ / ۱۸۹-۱۹۰، الحدیث: ۳۶۷۱) حضرت عبداللہ بن عمر رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا نے ایک شخص سے فرمایا: ''اپنے بچے کی اچھی تربیت کرو کیونکہ تم سے تمہاری اولاد کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ تم نے اس کی کیسی تربیت کی اور تم نے اسے کیا سکھایا۔ (شعب الایمان، الستون من شعب الایمان وھو باب فی حقوق الاولاد والاھلین، ۶ / ۴۰۰، الحدیث: ۸۶۶۲) حضرت ایوب بن موسیٰ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ

صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ''کسی باپ نے اپنے بچے کو ایسا عطیہ نہیں دیا جو اچھے ادب سے بہتر ہو۔ (ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ما جاء فی ادب الولد، ۳ / ۳۸۳، الحدیث: ۱۹۵۹) اور اچھے ادب سے مراد بچے کو دیندار، متقی، پرہیزگار بنانا ہے۔ اولاد کے لئے اس سے اچھا عطیہ کیا ہوسکتا ہے کہ یہ چیز دین و دنیا میں کام آتی ہے۔ ماں باپ کو چاہئے کہ اولاد کو صرف مالدار بنا کر دنیا سے نہ جائیں انہیں دیندار بنا کر جائیں جو خود انہیں بھی قبر میں کام آوے کہ زندہ اولاد کی نیکیوں کا ثواب مردہ کو قبر میں ملتا ہے۔

وَثَنِیَّت کا معنی ومفہوم، مختلف مذاہب میں اس کا تصور

اَمْ كُنْتُمْ	کیا تم تھے	شُهَدَآءَ	موجود	اِذْ حَضَرَ	جب آئی

يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ	یعقوب کو موت	اِذْ قَالَ	جب کہا (اس نے)
لِبَنِيْهِ	اپنے بیٹوں سے	مَا تَعْبُدُوْنَ	کس کی تم عبادت کرو گے
مِنْۢ بَعْدِيْ	میرے بعد	قَالُوْا	انہوں نے کہا
نَعْبُدُ هم	عبادت کریں گے	اِلٰهَكَ	تیرے معبود کی
وَاِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ	اور تیرے باپ دادا کے معبود کی	اِبْرٰهٖمَ	(یعنی) ابراہیم
وَاِسْمٰعِيْلَ	اور اسماعیل	وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا	اور اسحٰق (کے) معبود

وَّاحِدًا	واحد کی	وَّنَحْنُ	اور ہم	لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾	اسی کے فرمانبردار ہیں۔

یہود کو زجر وتوبیخ کی جارہی ہے کہ تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ابراہیم ویعقوب (علیہما الصلوٰۃ والسلام) نے اپنی اولاد کو یہودیت پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی تھی، تو کیا تم وصیت کے وقت موجود تھے؟ اگر وہ یہ کہیں کہ موجود تھے تو یہ **کِذْب وزَوْر** اور بہتان ہوا (تینوں جھوٹ اور بے بنیاد باتوں سے متعلق الفاظ ہیں،) اور اگر یہ کہیں کہ حاضر نہیں تھے تو ان کا مذکورہ دعویٰ غلط ثابت ہوگیا، کیوں کہ انہوں نے جو وصیت کی، وہ تو اسلام کی تھی نہ کہ یہودیت، یا عیسائیت یا وثنیت کی۔ (وثنیت سے مراد'' بت پرستی'' کا عقیدہ یا نظریہ ہے۔ یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جس میں خدا کی

بجائے کسی مادی چیز (جیسے پتھر یا لکڑی سے بنی مورتی) کو پوجا جاتا ہے، عربی زبان میں "وَثَن" کا مطلب بت یا مورت کے ہیں۔ اسی مناسبت سے وثنیت کا لفظ وجود میں آیا، جس کا بنیادی مفہوم اصنام پرستی یا بت پرستی ہے۔ الغرض! مذہبی اصطلاح میں وثنیت ایسے تمام عقائد کو کہا جاتا ہے جو توحید (ایک خدا پر یقین) کے برعکس ہوں اور جن میں مافوق الفطرت طاقتیں بے جان اشیاء، قدرتی مظاہر (جیسے سورج، چاند)، یا دیوتاؤں کے مجسموں سے منسوب کر دی جائیں۔ اور تاریخی اعتبار سے یہ انسانی تاریخ کا قدیم ترین عقیدہ ہے۔ اسلام کی آمد سے قبل جزیرہ نما عرب میں بھی وثنیت عام تھی، جہاں خانہ کعبہ میں مختلف بت رکھے گئے تھے اور لوگ انہیں اپنا حاجت روا سمجھتے تھے، لہٰذا اسلام میں وثنیت (شرک) کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہ خالق کی بجائے مخلوق کی عبادت پر مبنی ہے) تمام انبیا کا دین اسلام ہی تھا، اگرچہ شریعت اور طریقہ کار میں کچھ اختلاف رہا ہے۔ اس کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: »الأَنْبِيَاءُ أَوْلَادُ عَلَّاتٍ، أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّى وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ« (صحيح بخاري) "انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جماعت اولاد علات ہیں، عَلات" کا صحیح تلفظ عین پر زبر (عَ) کے ساتھ ہے، جو عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا معنی ومفہوم ان سوتیلے بھائیوں سے ہے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جماعت اولاد علات ہیں، ان کی مائیں مختلف (اور باپ ایک) ہے اور ان کا دین ایک ہی ہے۔"

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ آیت کا شانِ نزول اور تفسیر

اس آیت میں بھی یہود ونصاریٰ اور مشرکین مکہ کی تردید ہے اور یہود ونصاری کو یاد دہانی کرائی جا رہی ہے کہ تمہارا یہ دعوی باطل کہ تم ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ، اسماعیل (علیہ السلام)، اسحاق (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) کو ماننے والے ہو انہوں نے یہودیت یا نصرانیت کی تعلیم نہیں دی تھی ان کی تعلیم تو واضح طور پر توحید پر مبنی تھی، فرمایا اس واقعہ کو یاد کرو "اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ۔ کیا تم اس وقت موجود تھے، جب یعقوب (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے پاس موت آئی۔ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ " جب انہوں نے

اپنے بیٹوں سے کہا تھا، تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے یہود یوں کی روایت میں یہ بھی موجود ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے یہ بھی فرمایا مجھے شبہ ہے کہ تم میں کوئی شرک کی طرف میلان نہ رکھتا ہو تو بیٹوں نے بیک آواز جواب دیا۔ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰـهَكَ، ہم تیرے معبود کی عبادت کریں گے "وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ"۔ اور تمہارے آباؤ اجداد اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ"۔ ابراہیم (علیہ السلام)، اسماعیل (علیہ السلام) اور اسحاق (علیہ السلام) کے معبود کی عبادت کریں گے،" اِلٰهًا وَّاحِدًا"۔ سے جو ایک ہی معبود ہے ہم صرف اسی کی عبادت کریں گے،" وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ"۔ اور ہم صرف اسی کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں یہ سب باتیں حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے دم واپسین کے وقت کی ہیں، جو اپنی اولاد کو دین توحید اور ملت ابراہیمی پر کاربند رہنے کی تلقین فرمارہے ہیں۔ یہ آیت یہود اور عیسائیوں کے اس دعوے کے رد میں نازل ہوئی ہے جس میں وہ کہتے تھے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے اپنی وفات کے وقت اپنی اولاد کو یہودی یا عیسائی مذہب کی وصیت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان سے سوال کیا ہے کہ کیا تم اس وقت وہاں موجود تھے؟ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے اپنی اولاد کو صرف توحید (اللہ کی یکتائی) اور اسلام پر قائم رہنے کی وصیت کی تھی۔

ظاہر ہے کہ ان تمام واقعات کے پیش نظر یہود ونصاری کے لیے ملت ابراہیمی سے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں، اگر ان میں ذرا بھی انصاف کا مادہ موجود ہو، اور وہ تعصب کی عینک اتار کر دیکھیں تو انہیں حضور ﷺ پر ایمان لانا ہوگا، کیونکہ آپ ہی ملت ابراہیمی کے سچے پیروکار اور سچے جانشین ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاری کے اس دعوے کی تردید فرمائی ہے کہ وہ ملت ابراہیمی پر ہیں، آگے سورہ آل عمران میں آئے گا کہ اے بنی اسرائیل! اگر تمہارا دعوی یہ ہے کہ تم حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طریقے پر ہو تو نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانا پڑے گا، آپ کے بغیر سب ادیان باطل ہیں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی طرف تمہاری جھوٹی نسبت کچھ مفید نہ ہوگی۔

لفظ حنیف کی تحقیق و تفسیر / راہِ ہدایت / صحابہ کرام معیارِ حق

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۗ وَمَا
كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ
وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ
مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ
اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ
وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾

آخرت میں کام آنے والے صرف اپنے ہی اعمال ہوں گے

تِلْكَ اُمَّةٌ	یہ ایک جماعت ہے	قَدْ خَلَتْ	تحقیق گزر گئی	لَهَا	اس کے لئے ہے
مَا كَسَبَتْ	جو اس نے کمایا	وَلَكُمْ	اور تمہارے لئے ہے		
مَّا كَسَبْتُمْ	جو تم نے کمایا	وَلَا	اور نہیں	تُسْـَٔلُوْنَ	تم سے پوچھا جائے گا
عَمَّا كَانُوْا	اس کے بارے میں جو	يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾	وہ عمل کرتے تھے۔		

یہود ہمیشہ اپنے آباء واجداد کے مقام ومرتبہ اور اعمال کو اپنے لئے کافی جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کے اعمال میں وہ بھی حصہ دار ہوں گے، اسی کی تردید ہے کہ ہر شخص کو خود اسی کا عمل کام آئے گا تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں سوال ہوگا، نہ کہ اپنے سلف اور آباء واجداد کے اعمال کے بارے میں فرمایا "تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ"۔ یہ ایک جماعت تھی جو گذر گئی وہ دین توحید پر قائم رہی "لَهَا مَا كَسَبَتْ"۔ انہیں کے لیے ہے جو کچھ انہوں نے کمایا یعنی ان کے عقیدہ اور اعمال وافعال کا اجران کو ملے گا "وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ" اور تمہارے لیے وہ ہوگا جو تم کماؤ گے اگر تم بھی ان کے طریقے پر چلتے ہوئے دین اسلام اور ملت ابراہیمی کا دامن تھام لو گے تو مراد کو پہنچو گے اور اگر اپنی ضد اور عناد پر قائم رہے، تو ملت ابراہیمی سے خالی خولی نسبت کچھ کام نہ آئے گی اور تمہارے عقیدے اور اعمال کے مطابق ہی تمہیں بدلہ دیا جائے گا، امام غزالی نے بڑی عمدہ مثال دی ہے، کہتے ہیں کہ اگر بیٹا بھوکا یا پیاسا ہو اور باپ کھا پی لے، تو بیٹے کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس کی بھوک اور پیاس رفع نہیں ہوگی۔ جب تک وہ خود نہیں کھائے پیئے گا، اسی طرح یہود ونصاری کے آباؤ اجداد کا دین اسلام پر قائم ہونا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا جب تک یہ خود ہٹ دھرمی چھوڑ کر ملت ابراہیمی کو نہ اپنا لیں فرمایا "وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے آباؤ اجداد کا دین کیا تھا، وہ کیا کرتے تھے، بلکہ تمہیں خود ان کی صحیح معنوں میں پیروی کرنا ہوگا تمہارے اعمال کی باز پرس تمہیں سے ہوگی۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آخرت میں اپنے اعمال کام آئیں گے اور اگر عقیدہ خراب ہو تو کسی کو دوسرے کے عمل سے فائدہ نہ ہوگا۔

یہودیوں، عیسائیوں اور تمام مذاہب کا رد

وَقَالُوْا	اور انہوں نے کہا	كُوْنُوْا	ہو جاؤ تم	هُوْدًا	یہودی	اَوْ نَصٰرٰى	یا عیسائی
تَهْتَدُوْا	ہدایت پالو گے	قُلْ	کہہ دیجئے	بَلْ	بلکہ (پیروی کرتے ہیں ہم)		
مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ	ملت ابراہیم کی	حَنِيْفًا	(جو) حنیف تھا				
وَمَا كَانَ	اور نہیں تھے	مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝١٣٥	مشرکوں سے۔				

كُوْنُوْا: ہو جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ تَعَالٰی عَنْہُمَا نے فرمایا کہ یہ آیت مدینہ کے یہودی سرداروں اور نجران کے عیسائیوں کے جواب میں نازل ہوئی۔ یہودیوں نے تو مسلمانوں سے یہ کہا تھا کہ حضرت موسیٰ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام تمام انبیاء عَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام میں سب سے افضل ہیں اور توریت تمام کتابوں سے افضل ہے اور یہودی دین تمام ادیان سے اعلیٰ ہے، اس کے ساتھ انہوں نے حضرت سید کائنات محمد مصطفی صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ، انجیل شریف اور قرآن شریف کے ساتھ کفر کر کے مسلمانوں سے کہا تھا کہ یہودی بن جاؤ اسی طرح نصرانیوں نے بھی اپنے ہی دین کو حق بتا کر مسلمانوں سے نصرانی ہونے کو کہا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (روح المعانی، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۱۳۵، ۱/ ۵۳۵-۵۳۶) **بَلْ مِلَّۃَ اِبْرٰھٖمَ:** بلکہ ابراہیم کا دین۔ ارشاد فرمایا کہ اے حبیب! صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ، آپ یہودیوں اور عیسائیوں کو جواب دے دیں کہ جب کسی کی پیروی ضروری ہے تو ہم حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے دین کی پیروی کرتے ہیں جو کہ تمام فضائل کا جامع ہے اور حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام ہر باطل سے جدا تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اس میں اشارۃً یہودیوں، عیسائیوں اور ان تمام لوگوں کا رد کر دیا گیا جو مشرک ہونے کے باوجود ملت ابراہیمی کی پیروی کا دعویٰ کرتے تھے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ابراہیمی بھی کہتے ہیں اور شرک بھی کرتے ہیں حالانکہ ابراہیمی وہ ہے جو حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے دین پر ہو اور حضرت ابراہیم عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام مشرک نہ تھے جبکہ تم مشرک ہو تو ابراہیمی کیسے ہو گئے۔ (خازن، البقرۃ، تحت الآیۃ: ۱۳۵، ۱/ ۹۴ ملخصاً)

لفظ حنیف'' معنی و مفہوم اور مختصر تشریح

عربی قواعد کی رو سے حَنِیْفًا کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بھی ہو سکتا ہے، ایسی صورت میں ترجمہ بلکہ ہم نے یکسو ہو کر ابراہیم کا مذہب اختیار کیا، اور اس لفظ کا تعلق 'ملۃ ابراھیم' سے بھی ہو سکتا ہے، قرآنِ مجید میں یہ لفظ بالخصوص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے استعمال ہوا ہے۔'' دین حنیف'' سے مراد وہ خالص توحید ہے جو شرک اور بت پرستی سے پاک ہو۔ یعنی ایسا شخص

جو اسلام پر پختگی اور استقامت کے ساتھ کاربند رہے اور تمام جھوٹے مذاہب سے بیزاری کا اظہار کرے، الغرض! ایسی صورت میں ''حنیف'' کے معنیٰ 'مستقیم' (درست) کے ہوں گے اور ترجمہ یوں ہوگا 'ہم نے ابراہیم کا مذہب اختیار کیا، جو درست مذہب ہے۔ یہ ایک عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنیٰ ہیں: '' سیدھی راہ (حق) پر قائم رہنے والا اور ہر قسم کی باطل اور گمراہ کن راہوں سے منہ موڑنے والا۔ (دیکھئے: قرطبی: ۲/ ۱۴۰) اُردو میں ترجمہ کرنے والے حضرات نے دونوں طرح اس کا ترجمہ کیا ہے۔ الغرض! ملت اس نظام زندگی کا نام ہے جس کی بنیاد چند مخصوص عقائد پر ہو اور ملت ابراہیم (علیہ السلام) کے عقائد میں سے سب سے اہم عقیدہ جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا وہ یہ ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) موحد تھے۔ شرک نہیں کرتے تھے۔ یہود مسلمانوں سے کہتے ہیں یہودی بنو گے تو نجات پا جاؤ گے۔ حالانکہ وہ خود مشرک تھے اور حضرت عزیر (علیہ السلام) کو ابن اللہ کہتے تھے۔ اسی طرح عیسائی بھی مسلمانوں سے یہی بات کہتے تھے حالانکہ وہ بھی تین خدا مانتے تھے اور مشرک تھے اور کفار مکہ وغیرہ کے مشرک ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ حالانکہ وہ بھی ملت ابراہیمی کی اتباع کا دعویٰ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی نہ ہدایت پر ہے اور نہ ملت ابراہیم سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ سب مشرک ہیں۔ ملت ابراہیم پر صرف وہ ہو سکتا ہے جو مشرک نہ ہو اور وہی ہدایت یافتہ ہوگا۔

اَلْاَسْبَاطِ کا معنیٰ مفہوم اور مختصر تشریح

قُوْلُوْٓا	کہو تم	اٰمَنَّا	ہم ایمان لائے	بِاللّٰهِ	اللہ پر	وَمَآ	اور (اُس پر) جو		
اُنْزِلَ	نازل کیا گیا	اِلَيْنَا	ہماری طرف	وَمَآ اُنْزِلَ	اور جو نازل کیا گیا				
اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ	طرف ابراہیم	وَاِسْمٰعِيْلَ	اور اسماعیل	وَاِسْحٰقَ	اور اسحاق				
وَيَعْقُوْبَ	اور یعقوب	وَالْاَسْبَاطِ	اور اولاد (یعقوب کی طرف)						
وَمَآ اُوْتِيَ	اور جو دیا گیا	مُوْسٰى	موسیٰ	وَعِيْسٰى	اور عیسیٰ				
وَمَآ اُوْتِيَ	اور جو دیا گیا	النَّبِيُّوْنَ	نبیوں کو	مِنْ رَّبِّهِمْ	اپنے رب کی طرف سے				

لَا نُفَرِّقُ		ہم فرق نہیں کرتے	بَيْنَ اَحَدٍ		کسی ایک کے درمیان
مِّنْهُمْ	ان میں سے	وَنَحْنُ لَهٗ	اور ہم اسی کے	مُسْلِمُوْنَ	فرمانبردار ہیں۔

الْاَسْبَاطِ " عربی زبان کا لفظ ہے جو" سِبط " کی جمع ہے اس کا لغوی معنی درخت کی شاخ یا قبیلہ ہوتا ہے چونکہ ایک خاندان یا قبیلے کی شاخیں ایک ہی جڑ (آباؤ اجداد) سے پھوٹتی ہیں، اس لیے اولاد کی نسلوں اور قبیلوں کو" اسباط" کہا جاتا ہے، اور اس کا معنی آسانی سے پھیلنا بھی ہے۔ اولاد کی اولاد کو بھی اسی پھیلاؤ کی وجہ سے "سِبطٌ" کہتے ہیں۔ (مفردات) یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارہ بیٹے تھے، ان کی اولاد کے بارہ قبائل "الْاَسْبَاطِ" کہلاتے ہیں۔ "الْاَسْبَاطِ" پر الف لام کی وجہ سے "اس کی اولاد" اور "وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ" میں "لَهٗ" پہلے آنے کی وجہ سے "ہم اسی کے فرماں بردار ہیں" ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو اصل ہدایت اور ایمان کی تعلیم دی گئی ہے، یعنی قرآن پاک سے پہلے جتنی آسمانی کتابیں اور جتنے انبیاء ورسل آئے، جن میں سے بعض کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں اور بعض کے نہیں آئے، سب پر مجملاً ایمان لایا جائے کہ وہ سب حق ہیں۔ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنے اپنے وقتوں میں واجب الاتباع ہوتے ہیں اور ایک نئے نبی کی بعثت کی ضرورت ہمیشہ اس وقت پیش آتی ہے جب سابق نبی کی امت میں شرک و جہالت اور فساد فی الارض عام ہو جائے اور وہ خود کئی گروہوں میں بٹ جائے۔ دین یعنی عقائد وکلیات تو ہر نبی کے دور میں یکساں ہی رہے ہیں۔ البتہ اس دور کے تقاضوں کے مطابق کچھ سابقہ احکام منسوخ اور کچھ نئے احکام اس نئے نبی کو دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا اب اتباع تو صرف اسے نئے نبی کی واجب ہوتی ہے اور ایمان لانا سب پر واجب ہوتا ہے۔ ان کے درمیان فرق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو مان لیا کسی کو نہ مانا، جیسے یہودیوں نے عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور محمد ﷺ کو اور نصرانیوں نے آخری پیغمبر ﷺ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ البتہ تفصیلی ایمان صرف قرآن پر ضروری ہے، یعنی اس کے ہر حکم کو ماننا اور اس پر عمل کرنا، (1) کیونکہ قرآن پاک آنے سے پہلی تمام کتابیں منسوخ ہوگئیں۔ (2) پہلے تمام پیغمبر خصوصاً اپنی قوم کی طرف آتے

تھے، جب کہ رسول اللہ ﷺ قیامت تک کے تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے۔ دیکھیے سورہ سبا (28)۔ 3 پھر پہلی کوئی آسمانی کتاب محفوظ نہیں رہی، بلکہ ان میں تحریف ہوگئی، جب کہ قرآن مجید ہر طرح سے محفوظ ہے۔ یعنی ہم تمام ہی پیغمبروں پر یکساں ایمان رکھتے ہیں، ایسا نہیں کہ کسی نبی کو مانیں اور کسی کا انکار کریں، جیسا کہ یہودیوں نے کیا چنانچہ مسلمان ہونے کے لئے شرط ہے کہ وہ تمام پیغمبروں پر ایمان رکھے، کوئی بھی پیغمبر (جس کے پیغمبر ہونے کی قرآن مجید نے تصدیق کی ہو) کا انکار یا ان کی بے احترامی کفر کا باعث ہے؛ البتہ احکام میں ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے پابند ہیں؛ کیوں کہ پہلی شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں۔

انبیاء کرام عَلَیۡهِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام سے متعلق چند باتیں یاد رکھیں

(1)...... تمام انبیاء عَلَیۡهِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام اور تمام کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے، جو کسی ایک نبی عَلَیۡهِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام یا ایک کتاب کا بھی انکار کرے وہ کافر ہے، البتہ انبیاء کرام عَلَیۡهِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی تعداد مقرر نہ کی جائے کیونکہ انبیاء کرام عَلَیۡهِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کی تعداد کسی قطعی دلیل سے ثابت نہیں۔

(2)...... انبیاء کرام عَلَیۡهِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام کے درجوں میں فرق ہے جیسا کہ تیسرے پارے کے شروع میں ہے مگر ان کی نبوت میں فرق نہیں۔

(3)...... انبیاء کرام عَلَیۡهِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام میں فرق کرنے سے منع کیا گیا ہے وہ اس طرح ہے کہ بعض نبیوں کو مانیں اور بعض کا انکار کریں۔

(4)...... یہ بھی معلوم ہوا کہ سارے نبی نبوت میں یکساں ہیں، کوئی عارضی، ظلی یا بروزی نبی نہیں جیسے قادیانی کہتے ہیں بلکہ سب اصلی نبی ہیں۔

صحابہ کا ایمان بارگاہِ الٰہی میں معتبر اور دوسروں کیلئے مثال

فَاِنۡ	پھر اگر	اٰمَنُوۡا	وہ ایمان لائیں	بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ	جیسے تم ایمان لائے ہو		
بِهٖ	اس پر	فَقَدِ اهۡتَدَوۡا	تو یقیناً وہ ہدایت پا گئے	وَاِنۡ	اور اگر		

تَوَلَّوْا	انہوں نے منہ پھیرا	فَاِنَّمَا هُمْ	تو وہی ہیں	فِيْ شِقَاقٍ	ضد میں (مخالفت میں)
فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ		پس عنقریب آپ کیلئے ان کے مقابلے میں کافی ہوگا اللہ			
وَهُوَ	اور وہی ہے	السَّمِيْعُ	خوب سننے والا	الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾	خوب جاننے والا۔

بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ: تمہارے ایمان کی طرح۔ یہودیوں کو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرح ایمان لانے کا فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ایمان بارگاہِ الٰہی میں معتبر اور دوسروں کیلئے مثال ہے۔ اس لئے صحابہ (رضي الله عنهم) کی مثال دیتے ہوئے کہا جارہا ہے کہ اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جس طرح اے صحابہ (رضي الله عنهم)! تم ایمان لائے ہو تو پھر یقیناً وہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے۔ اگر وہ ضد اور اختلاف میں منہ موڑیں گے، تو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، ان کی سازشیں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی کیوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کفایت کرنے والا ہے۔ چنانچہ چند سالوں میں ہی یہ وعدہ پورا ہوا اور بنو قینقاع اور بنو نضیر کو جلاوطن کر دیا گیا اور بنو قریظہ قتل کئے گئے۔ تاریخی روایات میں ہے کہ حضرت عثمان (رضي الله عنه) کی شہادت کے وقت ایک مصحف عثمان ان کی اپنی گود میں تھا اور اس آیت کے جملہ »فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ« پر ان کے خون کے چھینٹے گرے بلکہ دھار بھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مصحف آج بھی ترکی میں موجود ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسا ایمان نصیب فرمائے، اور اپنے مقبول بندوں میں شامل فرمائے آمین

جھوٹی نسبت مفید نہیں/کتمان شہادت ظلم ہے/
اہل اسلام کیلئے لمحہ فکریہ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِى اللّٰهِ
وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ
اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَ
اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ
عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

توحید، عبادت، ریاضت، دیانت اور ایمان کا رنگ

صِبْغَةَ اللّٰهِ	اللہ کا رنگ (اختیار کرو)	وَمَنْ	اور کون ہے	اَحْسَنُ	زیادہ اچھا
مِنَ اللّٰهِ	اللہ سے	صِبْغَةً	رنگ میں	وَنَحْنُ لَهٗ	اور ہم اسی کی
عٰبِدُوْنَ	عبادت کرنے والے ہیں (138)				

فرمایا یہ آپ کی یہودیت اور نصرانیت کی طرف دعوت دیتے ہیں آپ انہیں فرما دیجئے کہ

"صِبْغَةَ اللّٰهِ ہم نے تو اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کرلیا ہے تمہاری باطل یہودیت اور نصرانیت سے ہمارا کیا تعلق ؟ اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے مراد کوئی روائتی رنگ کی قسم سرخ نیلا یا پیلا نہیں بلکہ توحید اور اخلاص کا رنگ ہے یہ وہ رنگ ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے انسان کے چہرے پر نمایاں ہوتا ہے یہ رنگ ان کے اقوال و افعال اور اعمال و کردار کی وجہ سے اور چمکتا ہے ہم نے یہ رنگ اختیار کیا ہے یہ یہودیت اور نصرانیت والا رنگ نہیں جو یہ کپڑوں اور جسم پر لگا کر عیسائیت میں پختگی کا اظہار کرتے ہیں ۔فرمایا وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۔اور اللہ کے رنگ سے اچھا کون سا رنگ ہوگا جو کہ توحید، عبادت، ریاضت، دیانت اور ایمان کا رنگ ہے یہ ملت ابراہیمی کا رنگ ہے جو صرف اہل ایمان کو حاصل ہے جو اس ملت پر صحیح معنوں میں کاربند ہیں ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں جس نے ہمیں اپنے رنگ میں رنگ لیا۔جس طرح رنگ کپڑے کے ظاہر و باطن میں سرایت کر جاتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ کے دین کے سچے عقائد ہمارے رگ و پے میں سما گئے ہیں، ہمارا ظاہر و باطن اس کے رنگ میں رنگ گیا ہے ۔ہمارا رنگ ظاہری رنگ نہیں جو کچھ فائدہ نہ دے بلکہ یہ نفوس کو پاک کرتا ہے ۔ظاہر میں اس کے آثار ہمارے اعمال سے نمودار ہوتے ہیں ۔

عیسائیوں کی مذہبی رسم "بِپْتَسْمَه"

عیسائیوں کے یہاں ایک مذہبی رسم "بِپْتَسْمَه" کی چلی آتی ہے، جس کو عربی میں 'اصطباغ' کہتے ہیں، جب کوئی شخص عیسائیت کو قبول کرتا ہے تو اس کو مغرب کے رُخ پر لٹا کر اس سے شیطان سے براءت کا اعلان کرایا جاتا ہے، پھر مشرق کی طرف رخ کر کے وہ عیسائی عقائد کا اقرار کرتا ہے، پھر کپڑے اُتار کر سر تا پاؤں دم کیئے ہوئے تیل سے اس کی مالش کی جاتی ہے، اب بپتسمہ کے حوض میں ڈال دیا جاتا ہے، جہاں وہ غسل کرتا ہے، اسی درمیان اس سے باپ ، بیٹے اور روح القدس پر ایمان کا اقرار لیا جاتا ہے، غسل کے بعد پیشانی اور سینہ پر دوبارہ دم کیا ہوا تیل مَلا جاتا ہے اور سفید کپڑا پہنا دیا جاتا ہے، یہ ایک علامتی کپڑا ہے کہ اب وہ گناہ سے پاک وصاف ہو چکا ہے، قرآن نے یہاں اس مصنوعی عمل کا رد فرمایا ہے کہ پانی میں جسم کو دھونے اور سفید رنگ اختیار کرنے سے

کچھ فائدہ نہیں، یہ محض دل کے بہلاوے ہیں، اصل یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کی مرضیات کے رنگ میں رنگ لے اور اس سے بہتر کوئی رنگ نہیں ہو سکتا، اللہ کے رنگ سے یہاں یہی مراد ہے، رنگ کپڑے سے اس طرح پیوست ہو جاتا ہے کہ ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں ہوتا، دین سے ایک مسلمان کا تعلق بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ فرمایا "وَنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ"۔ اس لیے ہم اسی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہیں ہم کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت لامحدود

قُلۡ	کہہ دیجئے	اَتُحَآجُّوۡنَنَا	کیا تم ہم سے جھگڑتے ہو		
فِی اللّٰهِ	اللہ کے بارے میں	وَهُوَ	حالانکہ وہ	رَبُّنَا	ہمارا رب ہے
وَرَبُّكُمۡ	اور تمہارا رب ہے	وَلَنَا	اور ہمارے لئے ہیں	اَعۡمَالُنَا	ہمارے عمل
وَلَكُمۡ	اور تمہارے لئے ہیں	اَعۡمَالُكُمۡ	تمہارے عمل	وَنَحۡنُ	اور ہم (تو)
لَهٗ	اسی کے لئے	مُخۡلِصُوۡنَ	خالص (عمل کرنے والے) ہیں (139)		

یہود مسلمانوں سے جھگڑتے کہ تمام انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہوئے ہیں، پھر یہ آخری نبی عرب سے کیسے مبعوث ہو گئے؟ ہمارا دین سب سے بہتر اور تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا دین ہے، تو اس آیت میں ان کی تردید فرمائی گئی ہے کہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہے اور ہم عبادت میں مخلص بھی ہیں، پھر تمہارا یہ کہنا کہ ہم بہتر ہیں، یہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟ حالانکہ گذشتہ آیات میں گذر چکا ہے کہ "وَاللّٰهُ يَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ"۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے یعنی ہم کسی دوسرے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں کرتے اور عبادت و طاعت خالص اسی کے لئے کرتے ہیں تو عزت کے مستحق ہیں۔ یہود و نصاریٰ یہ سمجھتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔ لہٰذا اس کی جملہ نوازشات اور الطاف و اکرام کے مستحق صرف ہم ہی ہیں۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا کہ آپ ان سے کہیں کہ اللہ جیسا تمہارا پروردگار ہے ویسا ہی ہمارا بھی ہے۔ وہ تو جس طرح کے کوئی شخص عمل کرے گا اسی کے مطابق اس پر نوازشات کرے گا۔ اور

اس لحاظ سے ہم تم سے بہتر بھی ہیں کہ ہم فقط اسی کی بندگی کرتے ہیں اور تم شرک بھی کیئے جاتے ہو اور یہ اندازہ اب تم خود لگا سکتے ہو کہ آئندہ اس کی نوازشات اور الطاف و اکرام کس پر ہونا چاہئیں ۔ نیز خالص اللہ تعالیٰ کا وہی ہوتا ہے جو اس کے رسول صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا ہو جائے اور جو رسول صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ کا ہو گیا وہ اللہ تعالیٰ کا ہو گیا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے: مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ (النساء: ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی ۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری ہی ملت ابراہیم (علیہ السلام) کا بنیادی اصول ہے تم باطل نظریات کی طرف دعوت دیتے ہو یعنی یہودیت یا نصرانیت کو اختیار کیا جائے یہ ممکن نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت لامحدود ہے وہ جسے چاہے اپنی رحمت سے فیضیاب کرے کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں بحمد اللہ ہم نے ایمان قبول کر کے اپنے اندر اخلاص پیدا کیا ہے اور صحیح معنوں میں ملت ابراہیمی میں شامل ہوتے ہیں ۔

آیت کا بنیادی مقصد بے لاگ توحید اور نظریاتی پختگی کا اظہار ہے

اپنے دین میں اخلاص پیدا کرو، تمہارا تھوڑا عمل بھی کفایت کر جائے گا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صرف مخلص عمل ہی قابل قبول ہوتا ہے ریاکاری اور دکھاوے کا عمل ہمیشہ مردود ہوتا ہے اہل کتاب کے عقائد اخلاص سے خالی ہیں وہ ضدی اور عنادی ہیں لہٰذا ہماری ان سے مصالحت نہیں ہو سکتی مشرکین کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا، "لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ "۔ یعنی تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور ہمارے لیے ہمارا دین، اب صلح کی گنجائش نہیں یہاں بھی اہل کتاب کو فرمایا کہ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں اور ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں ۔ اس آیت کا بنیادی مقصد بے لاگ توحید اور نظریاتی پختگی کا اظہار ہے ۔ یہ اس وقت نازل ہوئی جب کفار مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے باطل مذاہب اور بت پرستی میں شرکت کی پیشکش کی تھی ۔ اس کے ذریعے واضح کر دیا گیا کہ حق اور باطل میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا، اور ہر شخص اپنے عقیدے اور عمل کا خود ذمہ دار ہے ۔

اَمۡ	کیا	تَقُوۡلُوۡنَ	تم کہتے ہو	اِنَّ اِبۡرٰھِیۡمَ	بیشک ابراہیم

وَاِسْمٰعِيْلَ	اور اسماعیل	وَاِسْحٰقَ	اور اسحٰق	وَيَعْقُوْبَ	اور یعقوب
وَالْاَسْبَاطَ	اور (اُن کی) اولاد	كَانُوْا	تھے	هُوْدًا	وہ یہودی
اَوْ نَصٰرٰى	یا عیسائی	قُلْ	کہہ دیجئے	ءَاَنْتُمْ	کیا تم	اَعْلَمُ	زیادہ جانتے ہو
اَمِ اللّٰهُ	یا اللہ	وَمَنْ	اور کون	اَظْلَمُ	زیادہ ظالم ہے
مِمَّنْ	اس سے جس نے	كَتَمَ	چھپائی	شَهَادَةً	(وہ) گواہی
عِنْدَهٗ	جو اس کے پاس ہے	مِنَ اللّٰهِ	اللہ کی طرف سے	وَمَا اللّٰهُ	اور نہیں ہے
بِغَافِلٍ	اللہ بیخبر	عَمَّا	اس سے جو	تَعْمَلُوْنَ	تم عمل کرتے ہو

یہودیت وعیسائیت کامعرضِ وجود

اس آیت کامفہوم سمجھنے کے لیے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ یہودیت اپنے موجودہ نظریات و عقائد کے مطابق تیسری اور چوتھی صدی قبل مسیح میں معرض وجود میں آئی تھی۔اور عیسائیت اپنے مخصوص نظریات وعقائد کے مطابق حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی وفات کے مابعد کی پیداوار ہے اور یہودیوں اور عیسائیوں کے عالم لوگ اس بات کو خوب جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اسماعیل (علیہ السلام)،اسحاق علیہ السلام، یعقوب (علیہ السلام) اور ان کی اولاد یعنی حضرت یوسف (علیہ السلام) وغیرہم۔اس قسم کی یہودیت اور عیسائیت کی پیدائش سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے،مگر ان علمائے یہود ونصاریٰ نے عوام کے ذہن میں یہ بات پختہ کردی تھی کہ یہ بیان کردہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام یہود کے قول کے مطابق یہودی تھے اور نصاریٰ کے قول کے مطابق عیسائی تھے۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا،جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے گواہی موجود ہو اور وہ اسے چھپائے یہ گواہی کون سی تھی جسے بنی اسرائیل چھپاتے تھے یہ گواہی حضور ﷺ کی بعثت قرآن پاک کی حقانیت اور آخری امت کے بارے میں تھی آگے آئے گا کہ بنی اسرائیل ایسا جان بوجھ کر کرلیتے تھے،یعنی یہ آیت بنیادی طور پر یہود ونصاریٰ (اہلِ کتاب) کے ان علماء کے

بارے میں نازل ہوئی تھی جو تورات اور انجیل میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات اور حق سچائی جانتے تھے،لیکن ذاتی مفاد یا تعصب کی وجہ سے اسے چھپاتے تھے۔

توراۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے متعلق واضح پیشین گوئیاں

"یَعۡرِفُوۡنَهٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ"۔ یہ لوگ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے بیٹوں کو مگر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے توراۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے متعلق واضح پیشین گوئیاں موجود تھیں مگر یہ لوگ عناد اور حسد کی وجہ سے آپ کو آخری نبی تسلیم نہیں کرتے تھے گویا توراۃ نے جو گواہی پیش کی تھی اور جو خود ان کے پاس موجود تھی، اسے چھپاتے تھے انہیں کے متعلق فرمایا کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے جو اپنے پاس موجود شہادت کو چھپا جائے۔خلاصہ یہ ہے کہ پچھلی آسمانی کتابوں کے ماننے والے (اہلِ کتاب) آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتنی واضح نشانیاں اور صفات پڑھ چکے تھے کہ انہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت میں اتنا ہی یقین تھا جتنا ایک باپ کو اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔

اپنے اپنے افعال کی خود جوابدہی کرنا ہوگی

تِلۡكَ اُمَّةٌ	یہ ایک جماعت تھی	قَدۡ	تحقیق	خَلَتۡ	جو گزرگئی
لَهَا	اس کے لئے ہے	مَا كَسَبَتۡ	جو اس نے کمایا	وَلَكُمۡ	اور تمہارے لئے ہے
مَا كَسَبۡتُمۡ	جو تم نے کمایا	وَلَا	اور نہ	تُسۡـَٔلُوۡنَ	پوچھا جائے گا
عَمَّا كَانُوۡا	اس کے بارے میں جو	یَعۡمَلُوۡنَ	وہ عمل کرتے تھے۔(141)		

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے اہل کتاب اگرچہ تم اپنی نسبت انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی طرف کرتے ہو مگر تم ان کے عقیدے پر قائم نہیں رہ سکے،لہذا تمہاری یہ جھوٹی نسبت کچھ فائدہ نہیں دے سکتی،ان کے عقیدے اور اعمال بیشک درست تھے لیکن وہ تمہارے کسی کام نہیں آسکتے،تمہیں اپنے افعال کی خود جوابدہی کرنا ہوگی۔

اہل اسلام کو تنبیہ

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آیت "تِلْكَ اُمَّة" ۔کا دہرایا جانا خاص مقصد کی بناء پر ہے صرف اہل کتاب کے لیے تو یہ آیت ایک دفعہ ہی کافی تھی، اب جو دوسری دفعہ اس کا تکرار کیا گیا ہے تو اس سے مراد اہل اسلام کی تنبیہ ہے کہ اہل کتاب کی طرح وہ بھی خالی نسبت پر تکیہ کیا گیا ہے تو اس سے مراد اہل اسلام کی تنبیہ ہے کہ اہل کتاب کی طرح وہ بھی خالی نسبت پر تکیہ لگا کر نہ بیٹھے رہیں بلکہ وہ اپنے عقائد اور اعمال کو پاک کریں، اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے احکام کی پابندی کریں تو ان کے لیے بھی راہ نجات کھل سکتی ہے اپنے اعمال کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں آج کل کے پیرزادوں، امیر زادوں، گدی نشینوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے کہ وہ اپنے آپ کا محاسبہ کریں، آباؤ اجداد کی خالی نسبت کسی کام نہیں آئیگی، باپ نیک وصالح تھا تو اس کا عمل اس کے ساتھ ہے بیٹے کو اپنی جوابدہی خود کرنا ہوگی، نسبت تو جب مفید ہوگی جب بزرگوں کے خصائص سے حصہ پایا ہو۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خبردار کیا ہے کہ ایمان لانے کے باوجود یہودیت کا راستہ اختیار نہ کریں اور صحیح معنوں میں ملت ابراہیمی اور شریعت محمدی پر قائم رہیں اس لئے فرمایا جارہا ہے کہ یہ امت ہے جو گذر چکی جو کچھ اس امت نے کمایا وہ اس کے لیے ہے اور جو تم نے کمایا وہ تمہارے لیے ہے تم سے ان کے اعمال کے متعلق نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے، بلکہ تمہاری باز پرس تمہارے اعمال کی وجہ سے ہوگی، تم سے سوال ہوگا، کہ تم نیکی اور توحید پر کاربند تھے یا نہیں تم شرک، بدعات اور رسومات باطلہ سے بچ سکے یا نہیں تم توحید کی دعوت دیتے تھے یا شرکیہ افعال کی طرف بلاتے تھے تم نیکی اختیار کرتے تھے یا لڑائی جھگڑے میں مصروف رہے آج اپنا محاسبہ کرلو قیامت کے دن تمہارے کاموں کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو سنوارنے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِي بِالْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ وَاجْعَلْهُ لِي إِمَامًا وَنُوْرًا وَهُدًى وَرَحْمَةً، اَللّٰھُمَّ ذَكِّرْنِي مِنْهُ مَا نَسِيْتُ، وَعَلِّمْنِي مِنْهُ مَا جَهِلْتُ، وَارْزُقْنِي تِلَاوَتَهُ آنَاءَ

اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ، وَاجْعَلْهُ لِي حُجَّةً يَارَبَّ الْعَالَمِينَ○

ترجمہ: اے اللہ! قرآن کی برکت سے مجھ پر رحم فرما اور اسے میرے لیے رہنما، نور، ہدایت اور رحمت بنادے۔ اے اللہ! اس میں سے جو میں بھول گیا ہوں مجھے یاد دلا دے اور جو نہیں معلوم وہ مجھے سکھا دے، اور مجھے رات کے اوقات اور دن کے اوقات میں اس کی تلاوت کی توفیق عطا فرما، اور اسے میرے حق میں حجت (دلیل) بنادے، اے تمام جہانوں کے رب۔ آمین یارب العٰلمین

☆☆☆☆

ہماری دیگر مطبوعات

www.umarlibrary.org